کراچی

ڈائجسٹ

سچی کہانیاں

SEPTEMBER

2012

عید مبارک



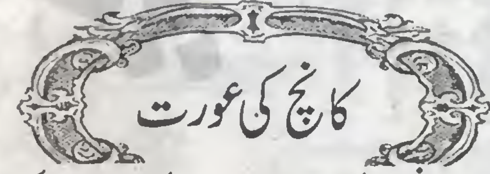
اس شمارے میں

☆ زندہ کہانی، آپ بیتیاں، جگ بیتیاں، جیتی جاگتی کہانیاں

☆ ''آتشِ جنوں'' سلیم فاروقی کے قلم سے......

☆ ''مسئلہ یہ ہے'' قرآنی آیات کے ذریعے آپ کے مسائل کا حل

منزہ سہام کے افسانوں کا مجموعہ



قرطاس پر سانس لیتے حروف اور دھڑکتے جذبات کی افسانوی تصویریں......فکر وخیال اور ادراک سے آباد، ان اوقات کی تحریریں جب لفظ اپنے تخلیق کار سے مکالمہ کرتے ہیں۔



بہت جلد آپ کی بصارتوں کا مہمان ہوگا

پرل پبلی کیشنز، 110 آدم آرکیڈ، شہیدِ ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ۔ کراچی



حقیقت

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہم مسلمانوں کے دشمن بہت ہیں‘ امریکہ‘ اسرائیل‘ بھارت اور دوسرے بھی جن کا شمار نہیں ہے!!

اور یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ......زندگی کا کوئی اعتبار نہیں ہے‘ کب‘ کہاں ساتھ چھوڑ جائے‘ موت سے رشتہ جوڑ جائے......ہم سب اس حقیقت سے بخوبی واقف تو ہیں لیکن سچ سے آنکھیں چراتے رہتے ہیں۔ یہ ہماری دنیا کا تام جھام اور جھمیلے ہی تو ہیں جنہوں نے ہمیں آخرت سے بے گانہ کر کے رکھا ہوا ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ہم میں سے کسی ایک مسلمان کی بھی کیا مجال تھی کہ وہ اپنے دوسرے مسلمان بھائی کو اُس کے حق سے محروم کرتا‘ صرف اور صرف اپنے مفاد اور نظریے کی خاطر دوسرے مسلمان بھائی کو نقصان پہنچاتا‘ صرف اور صرف اپنی رضا اور خوشی کے لیے دوسرے کو غم آشنا کرتا‘ اس کا مال یہاں تک کہ جان لے لیتا!! حیف‘ صد حیف‘ زندگی کے بازار میں یہ خسارے والا سودا تو ہم مسلمان خود کرتے ہیں لیکن ہمیشہ اس کا ذمے دار‘ دوسروں کو‘ اپنے دشمنوں کو قرار دیتے ہیں لیکن اگر ہم اپنے اللہ کو حاضر وناظر جان کر حقیقت کے آئینے کے سامنے کھڑے ہو جائیں تو اس آئینے میں ہمیں اپنے دشمنوں کی شکل نظر آئے گی؟ یا پھر اپنی؟؟؟

ناصر رضا

احوال

منزہ سہام مرزا قارئین کے درمیان

عزیز احوالیو......! خوش رہیے اور ہمیشہ اپنے پیاروں کے ساتھ رہیے۔ ماہِ رمضان تمام برکتوں کے ساتھ تقریباً رخصت ہوا اور عید کی آمد آمد ہے۔ ہماری کوشش تو یہی ہے کہ ''سچی کہانیاں'' عید گفٹ کی صورت میں عید سے پہلے آپ کے ہاتھوں میں ہو۔ اب دیکھیے، کہاں تک اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتے ہیں، یہ تو وقت ہی بتائے گا۔ جلدی شمارہ دینے کی وجہ سے آپ میں سے بہت سے احوالی شرکت سے محروم رہ گئے، اس کے لیے میں شرمندہ ہوں مگر آپ یقیناً ہماری مجبوری سمجھیں گے۔ پہلے خط کی جانب بڑھنے سے پہلے ''سچی کہانیاں'' کے تمام پڑھنے والوں کو عید الفطر کی ڈھیروں مبارک باد!

✉ شگفتہ شفیق، کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ ''اچھی پیاری منزہ! السلامُ علیکم! آج کل تو ماشاءاللہ، موسم بے حد پیارا ہو رہا ہے اور رمضان کا مبارک مہینہ دھیرے دھیرے اپنے اختتام تک پہنچ رہا ہے۔ میری طرف سے تمہیں، بچوں کو، رخسانہ جی اور تمام اسٹاف ممبرز کو ایڈوانس میں عید مبارک! یوں تو اگست کے ''سچی کہانیاں'' کے پراسرار نمبر کی ساری ہی کہانیاں بے حد عمدہ رہیں لیکن سب سے زیادہ مجھے راجہ محمود صاحب کی ''اسرارِ پاکستان'' پسند آئی۔ راجہ صاحب! آپ کی تمام تحاریر ماشاءاللہ، بہترین ہوتی ہیں اور ہمیشہ دل سے پسند آتی ہیں۔ رخسانہ سہام مرزا کی خوبصورت باتیں ''یادوں کے اوراق'' کے عنوان سے پڑھنے کو مل رہی ہیں۔ اس بار رخسانہ جی کی یادوں میں ملن اور جدائی دونوں ہی ملے کہ سہام صاحب سے اُن کی شادی ہوئی اور والد صاحب داغِ جدائی دے گئے۔ آخر میں والد صاحب کا قصہ آنکھیں نم کر گیا اور جناب، میری کتاب ''یاد آتی ہے'' پر عکاشہ نے خوبصورت تبصرہ کیا ہے۔ شکریہ عکاشہ سحر ایمان! اتفاق ہے کہ ہماری دونوں کتابوں ''میرا دل کہتا ہے'' اور ''یاد آتی ہے'' پر ڈاکٹر اختر ہاشمی صاحب نے بھی بے حد زبردست اور بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ ''عالمی رنگ ادب'' جو کہ شاعر علی شاعر صاحب نکالتے ہیں اور نوائے وقت، کراچی میں بھی تو جناب، میں ڈاکٹر اختر ہاشمی صاحب کا بھی شکریہ ادا کرنا چاہتی ہوں۔ ڈیئر منزہ! تمہاری ''کانچ کی عورت'' کا بے چینی سے انتظار ہے کہ انشاءاللہ، اپنے نام کی طرح تمہاری یہ کتاب بے حد منفرد ثابت ہوگی۔ اب اجازت، تمام قارئین کو دلی عید مبارک!''

✍ بہت ہی پیاری شگفتہ......! خوش رہیے اور یوں ہی ہم سب کو ہنساتی رہیے کہ بے شک آپ جیسے لوگ اب نایاب ہیں۔ تعریفیں، لکھنے والوں تک پہنچیں، وہ آپ کا ذاتی طور پر ضرور شکریہ ادا کریں گے۔ میری کتاب تکمیل کے مراحل میں ہے۔ انشاءاللہ، جلد منظرِ عام پر آئے گی پھر آپ لوگ رائے دیجیے گا۔ ہوا کے جھونکے کی طرح آفس آئیں اور چلی بھی گئیں، میرے کمرے میں کتنی دیر تک آپ کی ہنسی گونجتی رہی۔ اب جب آئیں تو اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے۔

✉ مینا تاج، کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ''ڈیئر ناصر، Sir. السلامُ علیکم! بہت دن گزر جانے کے بعد ایک

بار پھر احوال میں انٹری دینے کا سوچا۔ امید ہے اللہ سے آپ اور آپ کی پوری ٹیم بخیریت ہوں گے اور ساتھ ہی تمام پڑھنے والوں کا بے حد شکریہ جنھوں نے میری تحریر کو نہ صرف پسند کیا بلکہ میری کہانی' میری زبانی میں میری تحریر مختصر ہونے کا شکوہ کیا ہے۔ جس سے آپ لوگوں کی چاہت اور خلوص کا اندازہ ہوتا ہے۔ اللہ ہم سب کے علم اور شعور میں اضافہ کرے کیونکہ موجودہ دور میں علم اور شعور دونوں کا فقدان ہے جس کا ایک ثبوت تو میں ضرور آپ لوگوں کے سامنے پیش کروں گی بلکہ آپ لوگوں کو خود بھی نظر آ جائے گا' بس ذرا گھر سے باہر قدم نکالنے کی دیر ہے۔ جوس' چاکلیٹ' آئس کریم' صابن' شیمپو' مختلف موبائل کمپنیوں' گھریلو استعمال کی اشیاء کے بڑے بڑے اشتہارات کے بورڈ' یہاں تک کہ اخباروں اور رسائل تک میں سولہ سالہ لڑکی سے لے کر پینسٹھ سالہ بڈھی خاتون کی چہکتی مسکراتی تصاویر سے آپ کا سامنا ہوتا ہے جنہیں دیکھنے کے بعد سوائے افسوس کے' کچھ نہ رہ جاتا ہے اور ذہن اسلام سے قبل اُن چوک اور بازاروں کی طرف جاتا ہے جہاں انہیں سجا سنوار کر خرید و فروخت کا سلسلہ چلتا تھا۔ اسلام نے انہیں عزت' مقام اور مرتبہ دلایا مگر صد افسوس کہ آج جب چوک اور بازاروں پر سجی بنی نیم عریاں ملکی اور غیر ملکی ماڈلز کی تصاویر دیکھتے ہیں تو لگتا ہے کہ آج بھی شاید یہ سلسلہ چل رہا ہے' بس فرق اتنا ہے کہ پہلے زندہ تصویر نگاہوں کو خیرہ کرتی تھی اور آج...... شاید ہم نے اللہ پر توکل کرنا کم کر دیا ہے' جبھی ہر پروڈکٹ کے ساتھ فیمیل ماڈلز کو کامیابی کی ضمانت سمجھا جا رہا ہے۔ خیر' اللہ ہم سب کو سیدھا رستہ دکھائے۔ (آمین!) برا نہ مانیے گا آپ لوگ' کیا کہوں' میرا مزاج ہی کچھ ایسا ہے جو چیز غلط نظر آتی ہے' برملا اظہار کر دیتی ہوں اور آپ سب کو بھی دعوتِ فکر دیتی ہوں' میری تحریر میں جو بات بھی غلط نظر آئے' اس کا آپ برملا اظہار ضرور کیجیے گا کیونکہ ہم لوگ مل کر ہی اصلاح کا دامن تھام کر بہتری کا رستہ ڈھونڈ سکتے ہیں۔ باتوں باتوں میں یہ دیکھیں' عید بھی آ گئی۔ میری جانب سے آپ کو اور ''سچی کہانیاں'' کی پوری ٹیم کو اور تمام پڑھنے والوں کو دلی عید مبارک پھر ملیں گے جب اللہ نے چاہا۔''

ﻫ یار مینا......! ہم سے بھی بات کر لیا کرو۔ تمہاری سوچ سے میں تو بالکل متفق ہوں۔ کیا کر سکتے ہیں سوائے افسوس کے اور اب تو لگتا ہے کہ افسوس کرنے کا بھی کوئی فائدہ نہیں' شاید بھیڑ چال اسی کو کہتے ہیں۔ بہر حال تمہیں بھی ہم سب کی جانب سے عید کی ڈھیروں خوشیاں مبارک ہوں۔

✉ عبدالرؤف عدم' راولپنڈی سے تحریر کرتے ہیں۔ ''بہت اچھی آپی منزہ سہام! السلام علیکم! ماہِ جولائی نے الوداع ہوتے ہوتے اگست کا شمارہ ہمارے دامنِ طلب میں ڈال دیا۔ اداریے میں ناصر رضا بھائی کا آخری جملہ سوئے ہوئے 'ضمائر' کو جھنجھوڑنے کے لیے کافی ہے۔ تحسین جونیجو' اچھی بہنا' محبت کے اس امتحان میں آپ کے ساتھ ہم بھی پیپر دے رہے ہیں۔ قرۃ العین بہنا' کیسی ہیں آپ؟ اور صفیہ بتول بہنا' کہاں ہیں آپ؟ ماہِ اگست اور پراسرار نمبر کے ملاپ سے جنم لینے والی تحریر ''اسرارِ پاکستان'' نہایت لاجواب رہی' بہت زبردست۔ ''آفت کی پرکالہ'' اوسط درجے کی کہانی ثابت ہوئی۔ ''شہید کی ڈائری'' بہت خوبصورت اور پراثر سلسلہ ہے۔ ''قسمت بتانے والے'' متاثر کن رہی۔ سادہ الفاظ میں ایک تلخ حقیقت کی عکاسی کی گئی۔ ''بھیروی کا انتقام'' دل دہلا دینے والی کہانی ثابت ہوئی۔ ''میٹھا میٹھا گھر'' بہت میٹھی اور خوبصورت تحریر ہے۔ ''ایک رات کی بات'' میں کوئی خاص بات نہیں لگی۔ ''ہم خانہ'' زبردست رہی۔ ''جن صاحب'' بہت اچھے ٹیچر بھی ثابت ہوئے۔ ''معمہ حل نہیں ہوتا'' اور ''نادیدہ عاشق'' دینِ اسلام سے لگاؤ کا درس دینے والی تحریریں ہیں۔ ''مومنی'' ایک پراثر تحریر ہے۔ ''وہ کون تھی؟'' پسند آئی۔ ارے ارے ''وہ'' پسند نہیں آئی بلکہ کہانی پسند آئی۔ ''آدمی یا

انسان'' بہت خوبصورت تحریر ہے۔ نانا غفار کی قربانی آبدیدہ کر گئی۔ اصفاء فیصل مختصر لیکن پُراثر تحریر لے کر آئیں' ویل ڈن بہنا! خلیل جبار کی موبائل کہانی اچھی رہی۔ ارم زہرا کی ''کیا یہ حقیقت ہے؟'' زبردست اور لاجواب تحریر ہے۔ ''یادوں کے اوراق'' میں رخسانہ آنٹی کے والد کے انتقال کی خبر پڑھ کر آنکھیں نم ہوگئیں۔ شگفتہ شفیق کی شاعری پر عکاشہ بہنا کا تبصرہ بہت عمدہ رہا اور اب اس قول کے ساتھ اجازت کہ دوست زندگی میں نہیں ملا کرتے بلکہ زندگی دوستوں میں ملا کرتی ہے۔''

رؤف بھائی! زبردست خط کے ساتھ آپ کی آمد اچھی لگی۔ ناصر بھائی اور راجا محمود صاحب آپ کا شکریہ ادا کر رہے ہیں۔

اشعر جواد' کراچی سے لکھتے ہیں۔ ''محترمہ ایڈیٹر صاحبہ! السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ خیریت سے ہوں گی۔ اگست کا شمارہ ''پراسرار نمبر'' جشنِ آزادی کی مبارک باد کے ساتھ ملا۔ نامور ادیب ممتاز مفتی کی زندہ کہانی کے تناظر میں پاکستان کا وجود اور آزادی کسی رُوحانی قوت کے تابع لگتے ہیں۔ مرحوم انکل رفیق ایس ایم نے ممتاز مفتی کی کتاب ''تلاش'' گفٹ کی تھی۔ مجھے اور بارہا ''تلاش'' کو پڑھنے کے بعد ''اک نئی تلاش'' میری منتظر ہوتی ہے۔ ''احوال'' میں میرے لکھے خط کو آپ نے لسٹ میں ٹاپ پر رکھا اور خط میں موجود ''سخنِ ترش'' کو سر آنکھوں پر رکھا کہ ''دورِ ناصری'' کی یاد تازہ کر دی۔ جب ناصر بھائی میرے خطوط کی ایسی باتوں کو دل کی آنکھوں سے پڑھا کرتے تھے۔ ''دورِ ناصری'' میں کی گئی تبدیلیوں کے اثرات انفرادی اور اجتماعی حوالوں سے رائٹرز اور قارئین کے درمیان روابط قائم ہوئے جبکہ موجودہ تبدیلیوں کے دوررس نتائج ابھی واضح ہونا باقی ہیں۔ اداریہ ''آزادی'' میں ناصر بھائی کے بامعنی اور نصیحت آموز لفظوں نے مادر پادر آزادی کو یکسر تباہی و بربادی کے حقیقی رخ سے آشنا کیا ہے۔ اس رخ پر محسن نقوی کا یہ خیال نہ جانے کیوں یاد آ رہا ہے۔

گھر اپنا کس نے پھونک ڈالا؟ کسے کون بتائے؟
منصف ہے یہاں آگ اور گواہوں میں دھواں ہے

آپ اپنے ابو کے لیے بیٹی ہونے کا حق ادا کر رہی ہیں جو کہ ہر بیٹی کے لیے مثال ہے۔ اللہ آپ کو کامیاب کرے لیکن جب آپ کی اولاد آپ کا حق ادا کرے تو شاید آپ کو احساس ہو کہ آپ اپنا حق ادا کر چکی ہیں۔ خط کا اختتام کرتے ہوئے پشتو زبان کے صوفی شاعر رحمان بابا کا یہ خیال آپ کے لیے۔

جو کچھ شکایتیں ہیں ہمیں' وہ بتوں سے ہیں
شکوہ کریں خدا کا' وہ انسان نہیں ہیں ہم''

اشعر بھائی......! اس میں تو کوئی شک والی بات نہیں کہ آپ کی رائے کی بہت اہمیت ہے۔ آپ کو کہانیاں اچھی لگیں' مجھے یہ اچھا لگا مگر آپ نے جو مجھے بہترین دُعا دی کہ میری اولاد میرا حق ادا کرے تو اس کا تو کوئی نعم البدل ہی نہیں۔ اللہ آپ کی زبان مبارک کرے۔

مریم شاہ' شالی سرگودھا سے تحریر کرتی ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! سدا ہنستی مسکراتی' خوشیاں بانٹیں اور سمیٹتی رہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اور ''سچی کہانیاں'' کے ہر فرد کو اپنی حفظ و امان میں رکھے۔ (آمین!) سب سے پہلے آپ کو اور تمام امتِ مسلمہ کو رمضان المبارک کا بابرکت اور رحمتوں والا مہینہ مبارک ہو۔ اللہ تعالیٰ اس مہینے کے صدقے' ہمیں اور پیارے ملک پاکستان کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین!)

چند روز پہلے ناصر چاچو نے مطلع فرمایا کہ میری بھیجی ہوئی کہانی کو ماہِ اگست کے پراسرار نمبر میں جگہ مل چکی ہے۔ یقین جانیے، جب مجھے مون نے یہ خبر دی تو میں نے بالکل یقین نہیں کیا۔ میں نے اسے کہا کہ تمہیں سننے میں غلطی ہوئی ہے۔ دراصل چاچو نے ردی کی ٹوکری میں جگہ کا کہا ہوگا۔ خیر! اگر واقعی میری تحریر اس قابل ہے کہ ''سچی کہانیاں'' میں شائع ہو کر قارئین کی تنقید کا نشانہ بننے والی ہے تو ناصر چاچو پیشگی شکریہ قبول فرمائیں۔ (کر بھی لیں۔) تسی گریٹ ہو جی...... !ارے منزہ صاحبہ جی......! اگر آپ میری کہانی نہ بھی شائع کریں تو کوئی گل نئیں۔ میں تو پھر بھی آتی جاتی رہوں گی۔ (خیر منائیں اپنی۔) ہے کسی کی جرأت جو ہمیں روکے؟ میں نے اڑتی اڑتی خبر سنی ہے کہ دوشیزہ ماہِ نومبر کا شمارہ ناولٹ نمبر ہوگا؟ اگر آپ پر گراں نہ گزرے تو کیا میں بھی اپنی چھوٹی سی، ادنیٰ سی، ننھی منی سے تحریر ''دوشیزہ'' کے لیے ارسال کر سکتی ہوں؟ (کیا سوچنے لگیں؟) فی الحال تو میں ''سچی کہانیاں'' کے لیے ایک سچ بیانی اور ''زندگی لکھ رہا ہوں میں'' لے کر حاضر ہوئی ہوں۔ امید ہے، آپ کو پسند آئے گی اور جلد ہی اسے ''سچی کہانیاں'' میں شائع ہونے کا اعزاز بھی حاصل ہوگا۔ یہ سچ بیانی مکمل حقیقت پر مبنی ہے۔ ہمارے اردگرد بے شمار ایسے واقعات بکھرے پڑے ہیں۔ اگر آپ نے اور زندگی نے ساتھ دیا تو انشاء اللہ، ایک ایک کر کے آپ کے سامنے لاتی رہوں گی۔ آخر میں یہ شعر آپ کے نام۔

موسم، خوشبو، بادِ صبا، چاند، شفق اور تاروں میں
کون تمہارے جیسا ہے، وقت ملا تو سوچیں گے

پیاری سی مریم......! رمضان تمہیں بھی مبارک ہو۔ یار......! تمہاری یہی تو بات مجھے پسند ہے کہ کہانی چھپے نہ چھپے، تم حاضری ضرور لگاتی ہو۔ یہ ہوئی نا اپنوں والی بات۔ ایسے ہی ہنستی رہو۔

✉ طیبہ زاہد، دوبئی سے رقم طراز ہیں۔ ''السلام علیکم! میرا نام طیبہ زاہد ہے۔ میں ایک ورکنگ وومن ہوں اور ایک ٹریول ایجنسی سے منسلک ہوں۔ تقریباً 8 سال سے میں آپ کا رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ دوبئی میں ذرا مشکل سے ملتا ہے لیکن میں کسی نہ کسی طرح حاصل کر ہی لیتی ہوں۔ میں اپنی بہن کے ساتھ ہونے والے معجزوں کی داستان بھیج رہی ہوں، اگر قابلِ اشاعت جانیں تو نوک پلک خود سنوار لیجیے گا کیونکہ میری اردو اتنی اچھی نہیں ہے۔ جون کے شمارے میں کہانی معصوم پریاں اور شیطان پڑھ کر تو شاک لگا۔ میری تمام والدین سے گزارش ہے، خدارا، وہ اپنی بچیوں کو اکیلا باہر نہ جانے دیں۔ اللہ پاکستان کے حال پر رحم فرمائے اور سب کی بیٹیوں کو اپنی امان میں رکھے۔ (آمین!) امید کرتی ہوں کہ آپ میری سچی کہانی شائع کر کے میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ اللہ حافظ!''

ڈیئر طیبہ! تمہاری کہانی موصول ہوگئی ہے۔ انشاء اللہ، جلد ایڈیٹر حضرات اپنی رائے سے مجھے آگاہ کر دیں گے۔ تمہیں کہانی پڑھ کر شاک لگا، یقین کرو، ہمارا مقصد صرف یہ ہوتا ہے، تلخ سچائیاں لوگوں تک پہنچا دیں تاکہ کرب اور دکھ سے بچا جا سکے۔

✉ تنویر خالد میلسی، ضلع وہاڑی سے لکھتے ہیں۔ ''السلام علیکم! پیاری سسٹر! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گی۔ سسٹر جی! آپ نے کہا تھا کہ جواب میں دیتی ہوں اور آپ مخاطب انکل ناصر کو کرتے ہو؟ دراصل مجھے پتا نہیں تھا تو سسٹر......! اس دفعہ آپ کا بھائی آپ سے مخاطب ہے۔ آپی......! میں نے آپ کو اتنے شعر بھیجے، شاعری بھیجی پھر اس کے بعد ایک کہانی بھیجی مگر شاید آپ نے ان کو اس قابل نہ سمجھا کہ شائع کیا جا سکے اور تو اور آپ نے وجہ بتانی بھی گوارہ نہیں کی کہ...... پلیز آپی! کچھ تو بتائیں؟ آپ کی دعاؤں کا طلب گار، آپ کا چھوٹا بھائی تنویر خالد!''

✉ چھوٹے سے' منے سے بھائی تنویر......! آپ کی کہانی ادارتی بورڈ کے حوالے کردی گئی ہے' جلد ہی وہ فیصلہ کریں گے تو آپ کو بھی مطلع کردیا جائے گا۔ ''احوال'' میں آتے رہیے گا۔

✉ فوزیہ جاوید' گجر خان سے تحریر کرتی ہیں۔ ''محترمہ منزہ صاحبہ! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ''سچی کہانیاں'' کے پرچے کو دن دگنی رات چوگنی ترقی فرمائے۔ جیسا کہ میں نے پچھلے خط میں بھی بتایا تھا کہ ''سچی کہانیاں'' ڈائجسٹ باقاعدگی سے نہیں خرید سکتی کچھ مجبوریوں کی وجہ سے اس لیے کہانیوں پر تبصرہ بھی نہیں کرسکتی' صرف اور صرف کہانیوں کو لکھ کر اپنا شوق پورا کرلیتی ہوں۔ اب بھی میں تین کہانیاں بھجوا رہی ہوں' اس امید کے ساتھ کہ آپ کسی نہ کسی کہانی کو اپنے پرچے میں جگہ ضرور دیں گی' مجھے بہت امید ہے۔ اپنا ڈھیروں ڈھیر خیال رکھیے گا۔''

✉ ڈیئر فوزیہ......! تمہاری کہانیاں مل گئی ہیں' جلد ادارتی بورڈ فیصلہ کرے گا۔ خوش رہو اور ہمیں بھی اپنی دُعاؤں میں یاد رکھنا۔

✉ احمد نجمی دکھی' کالاباغ' میانوالی سے لکھتے ہیں۔ ''محترمہ باجی منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! کافی مرتبہ آپ کا پرچہ بک اسٹال پر دیکھا مگر یہ حسرت صرف دیکھنے تک ہی محدود رہی۔ بالآخر جولائی میں شاید میرے دل و دماغ پر قسمت کی دیوی نے وار کر ہی دیا۔ مجھ ناچیز نے تقریباً 1998ء سے لے کر اب تک جوابِ عرض کے پرچے پر ہی اپنی توجہ مرکوز رکھی۔ اب تک کافی زیادہ تعداد میں میری تحریریں اس پرچے کی زینت بن چکی ہیں لیکن اب مجبوراً قلم میں طاقت ختم ہوچکی ہے یا پھر میں دل کے آگے ہار گیا ہوں۔ ان کا فیصلہ کوئی بھی ہو لیکن اب میں آپ کا پرچہ تھوڑا سا پڑھ کر اتنا ضرور کہنے کو مجبور ہوگیا ہوں کہ لاجواب چیزیں انسان کو اپنی طرف ضرور اکساتی ہیں اس لیے ''سچی کہانیاں'' کے تمام سلسلوں کی تعریف نہ کرنا زیادتی کے مترادف ہوگا۔ پیاری آپی جی......! آپ کے ''احوال'' کے ساتھ ساتھ تمام رائٹرز کی تحریروں میں بہت زیادہ ہمت و طاقت نظر آئی۔ میں ''سچی کہانیاں'' کے معیار کو اور آپ سمیت ناصر بھائی' راجہ محمود صاحب بلکہ پورے اسٹاف کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام بھی اور مبارک باد بھی پیش کرتا ہوں۔ باجی منزہ جی......! اگر آپ لوگوں کی محبتوں اور خلوص کے بل بوتے پر مجھ ناچیز کو تھوڑی سی ''سچی کہانیاں'' میں جگہ ملی تو انشاء اللہ' آپ کی دُعاؤں سے جاندار اور سچی تحریریں بھی بھیجوں گا۔ باقی آپ کے سبھی سلسلے ماشاء اللہ' بہت ہی ٹاپ پر ہیں۔ آخر میں ''سچی کہانیاں'' کے تمام معزز قارئین' اسٹاف اور کرم فرماؤں کو محبتوں اور چاہتوں بھرا سلام پیش کرتا ہوں۔ اس دُعا کے ساتھ اجازت ہو کہ ''سچی کہانیاں'' ہمیشہ عروج کی بلندیوں کو چھوتا رہے۔ اللہ ہم سب کا حامی و ناصر ہو۔ (آمین!)''

✉ بھائی احمد نجمی......! ''سچی کہانیاں'' آپ کا اپنا رسالہ ہے' اپنی تحریر ضرور ارسال کیجیے۔ اچھی ہوئیں تو ضرور شائع ہوں گی۔ آپ کے خلوص و محبت کا شکریہ!

✉ رضوان قیوم' راولپنڈی سے تحریر کرتے ہیں۔ ''محترم ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! خیریت بخیریت کے بعد عرضِ خدمت ہے کہ ''سچی کہانیاں'' شمارہ اگست 2012ء میرے ہاتھوں میں ہے۔ سب سے پہلے اس کے سرورق پر بات کرتے ہیں' وہ معیاری ہے۔ راجہ محمود صاحب نے ممتاز مفتی کی زندہ کہانی جو کہ ''اسرارِ پاکستان'' کے عنوان سے تحریر کی' وہ بہت اچھی لگی۔ پراسرار کہانیوں کے اس خصوصی پرچے میں عارف شین روہیلہ نے اپنی تحریر ''آفت کی پرکالہ'' میں ایک منفرد اور سحر انگیز پلاٹ کو پیش کیا ہے۔ انہوں نے اس کہانی میں واقعی ایک اچھے اسٹوری رائٹر ہونے کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ جبکہ آتش جنوں' میٹھا میٹھا گھر' ایک رات کی بات' دردِ مشترک مجموعی طور پر بہت عمدہ کاوشیں

اگست 2012ء کی انعام یافتہ کہانیاں

قارئین کے ارسال کردہ ٹوکن کے ذریعے مندرجہ ذیل کہانیاں اس ترتیب سے انعام کی حقدار ٹھہریں

سنبل کی تحریر ''بھیروی کا انتقام'' پہلے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 700.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

جویریہ سلیم کی تحریر ''درندہ'' دوسرے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 500.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

عارف شین روہیلہ کی تحریر ''آفت کی پرکالہ'' تیسرے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 400.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

غزالہ شاہین عبدالقیوم کی تحریر ''ہم خانہ'' چوتھے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 300.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

انور فرہاد کی تحریر ''موہنی'' پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 250.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

اصفا فیصل کی تحریر ''کسی کو کیا ملا'' چھٹے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 200.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

حوصلہ افزائی

مرحوم کرنل رفیق ایس ایم کی یاد میں نیلم الماس جبین مغل کی تحریر ''ایک رات کی بات''
کو بطور انعام مبلغ سو روپے پیش کیے جارہے ہیں

بہترین شعر

قارئین نے اس بار محمد علی، حیدرآباد کا بھیجا ہوا، داغ کا شعر سب سے زیادہ پسند کیا۔

خدا دیتا ہے جن کو عیش، اُن کو غم بھی ہوتے ہیں
جہاں بجتے ہیں نقارے، وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں

تھیں۔ خصوصی طور پر سُنبل کی تحریر ''بھیروی کا انتقام'' واقعی پراسرار' مافوق الفطرت' موڈ کی پر تجسس' سحر انگیز تحریر تھی۔ رائٹر کا تخیل بڑا اچھوتا اور ادبی رنگ منجھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ بقیہ تحریریں مجموعی تقابلی طور پر قابلِ ستائش تھیں۔

✉ بھائی رضوان! کہانیاں پسند آنے کا شکریہ۔ خط تو آپ نے ناصر بھائی کو لکھا ہے' جواب میں دے دیتی ہوں۔ کہانیاں آپ کی منتخب ہو چکی ہیں اور آنے والے دنوں میں ضرور شائع ہوں گی۔

✉ عائشہ خورشید انور' ایف سی ایریا' کراچی سے تحریر کرتی ہیں۔ ''ناصر رضا بھائی! آداب! ''سچی کہانیاں'' کے تمام لکھنے والوں کو میرا اسلام! بھائی! کافی دنوں سے آپ کو اپنی کہانیاں لکھ کر بھیج رہی ہوں۔ اگست کے شمارے میں خط چھپا' کہانی کے بارے میں منزہ آپی نے کہا کہ آپ بتائیں گے۔ خدارا' بتا دیجیے کہ لکھنے کی جسارت کروں کہ نہیں؟ کہانی پسند آئی کہ نہیں؟ کچھ اور بھی تحریریں لکھی ہیں میں نے' وہ آپ کو ارسال کروں کہ نہیں؟ میری محنت کا کچھ پھل ملے گا کہ نہیں؟ میرا ابھی نام آپ کے رسالے میں چمکے گا کہ نہیں؟ مجھے بھی تھوڑی سی جگہ ملے گی کہ نہیں' پلیز' بتا دیں؟ بڑی مہربانی ہوگی۔''

✉ ڈیئر عائشہ! خوش رہیے۔ آپ کی کہانی پر ناصر بھائی کام کریں گے پھر انشاء اللہ' جلد چھپ جائے گی۔

✉ تاشیر حیدری' اوچ شریف سے لکھتے ہیں۔ ''محترم جناب ناصر رضا صاحب! السلام علیکم! ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کا ایک مدت سے خاموش قاری ہوں۔ کئی بار خط لکھنے اور اپنی تحریروں کو ارسال کرنے کا سوچا مگر یہ بات سوچ کی حد سے آگے نہ بڑھ سکی۔ اصل میں تلخ تجربات انسان کی سوچوں کو عمل کے روپ میں ڈھالنے سے مانع رہتے ہیں۔ مجھے بچپن ہی سے کہانیاں لکھنے کا از حد شوق رہا ہے۔ اس سلسلے میں بچوں کے رسائل و اخبارات میں میری تحریریں چھپتی رہی ہیں لیکن میری تحریروں کے مقابلہ میں شائع شدہ تحریروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر ہی رہی اور اکثر تحریریں ردی کی ٹوکری نے ہضم کر لیں۔ ایک نئے لکھنے والے کو جو حوصلہ افزائی درکار ہوتی ہے' اس کا نہ ملنا ہمیشہ رکاوٹ بنا رہا۔ یہی حال میرے کالموں کے ساتھ بھی ہوتا رہا' سو دلبرداشتہ ہو کر میں نے لکھنے ہی سے کنارہ کشی اختیار کر لی لیکن ''سچی کہانیاں'' کا فارمیٹ مسلسل مجبور کرتا رہا کہ میں خاموشی کی مہر توڑ دوں اور بالآخر ماہِ مقدس میں یہ نیک کام سرانجام دے رہا ہوں۔ نئے لکھنے والوں کو عموماً جو مشکل درپیش آتی ہے' وہ یہ ہے کہ کہاں سے لکھیں اور کیسے شروع کریں؟ جب اس جان توڑ مشکل کو شکست دے کر کوئی لکھاری تحریر کو سپردِ قلم کر لیتا ہے تو اس سے بھی دشوار گزار مرحلہ اس کی اشاعت ہے اور عموماً نئے لکھاریوں کی تحریروں سے سوتیلوں جیسا سلوک کر کے ان کی خوب خوب حوصلہ شکنی کی جاتی ہے۔ اس مرحلہ پر اکثر لوگوں کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے اور وہ لکھنے سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہر تحریر ڈائجسٹ کی زینت نہیں بن سکتی کہ ''معیار'' کا بھی تو خیال رکھنا ضروری ہوتا ہے لیکن کس قدر قابلِ فخر بات ہے کہ ''سچی کہانیاں'' نے نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی سے بھی منہ نہیں موڑا اور نہ ہی قارئین نے اس کی سرکولیشن کو نیچے گرنے دیا ہے اور یہ بات ''سچی کہانیاں'' کا عظیم کریڈٹ کہی جائے گی کہ اس نے روایات سے زیادہ انسان کی قدر کی ہے۔ جملے کو دیکھا ہے' چہرے اور نام کو نہیں دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ آج ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' قارئین کا ہر دل عزیز شمارہ ہے جس کا ہر ماہ پوری شدت سے انتظار کیا جاتا ہے۔ اگر ''سچی کہانیاں'' بھی دیگر شماروں کی روش اپناتا تو آج اس مقام پر نہ ہوتا۔ نوکری حاصل کرنے والوں سے ''تجربہ'' مانگنے کی شرط کس قدر مضحکہ خیز ہے۔ جب آدمی کسی کام کا آغاز کرتا ہے تو ''تجربہ'' تو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے حاصل ہو ہی جاتا ہے۔ یہ ''سچی کہانیاں'' کا مجھ ناچیز پہ احسان ہے کہ اس

نے مجھے پھر سے تحریری میدان میں زندہ کر دیا ہے۔ اب جب تک یہ رسالہ چاہے گا' میرا رشتہ اس سے برقرار رہے گا۔ محترم ناصر صاحب! میں نے خاموشی توڑ دی ہے' اب آپ دیدہ و دل وا کریں یا نہ کریں' یہ آپ کی مرضی۔ اب بال آپ کے کورٹ میں ہے' سو اب

جو چاہے' آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے

میں چند ایک کہانیاں اپنے ذہن میں تو لکھ چکا ہوں' اب انہیں کاغذ پر منتقل کرنے کا مرحلہ ابھی باقی ہے لیکن اس سلسلہ کی پہلی کڑی کے طور پر یہ خط سپردِ ڈاک کر رہا ہوں اس امید کے ساتھ کہ اس پروقار رسالے میں اپنے نام کی حاضری لگوا سکوں۔ آپ نے اس خط کو اشاعت کی سعادت سے نوازا تو انشاء اللہ' جلد ہی کہانیوں کے ساتھ حاضرِ خدمت ہوں گا۔ امید واثق ہے کہ آپ مایوس نہ کریں گے کہ ''نوجوانوں'' کی حوصلہ افزائی کرنا آپ کے ادارہ کا طرۂ امتیاز ہے۔ ''سچی کہانیاں'' کے تمام ہی سلسلے دلکش ہیں۔ اس سلسلہ میں کچھ کہنا' سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے چونکہ خوب سے خوب تر کی تلاش ہر شعبے کی اولین خواہش ہوتی ہے لہٰذا اس سلسلہ میں چند تجاویز آپ کے گوش گزار کرنا چاہوں گا اگر آپ کو معقول لگیں تو ضرور شامل کیجیے گا۔ امید واثق ہے' آپ میرے پہلے خط کو ضرور شاملِ محفل کریں گے۔ (انشاء اللہ!) آپ' آپ کے ادارہ اور قارئین کی سلامتی کے لیے دُعا گو!''

✍ بھیا تاشیر! دیکھیے' آپ کے خط کو جگہ مل گئی اب آپ بھی اپنا وعدہ نبھایئے اور جلدی سے کہانی لکھ ڈالیے۔ ''سچی کہانیاں'' آپ کو پسند آیا' بہت شکریہ۔ آپ کی تجاویز میں سے بیشتر پر ہم پہلے ہی سے عمل کر رہے ہیں جیسے کہ رُوحانی سلسلہ بھی ہے۔ بہترین خط کو انعام بھی دیا جاتا ہے۔ اب آپ پابندی سے ''احوال'' میں شرکت کیجیے گا۔''

✉ نازیہ بتول رضا' کراچی سے رقم طراز ہیں۔ ''محترم و عزیز منزہ جی! اور سر ناصر رضا! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور تمام اسٹاف بخیریت ہوگا۔ کافی عرصے بعد احوال میں شرکت پر معذرت۔ پراسرار نمبر ہمیشہ کی طرح زبردست رہا۔ ''آزادی'' سے لے کر ''بازگشت'' تک محویت قائم رہی۔ طبیعت کی خرابی کی وجہ سے میں اس بار ''پراسرار نمبر'' میں حصہ نہ لے سکی جس کا بہت افسوس ہے۔ اب کہانی ارسال کر رہی ہوں' اگر مناسب سمجھیں تو اگلے نمبر میں جگہ دے دیں۔ دُعا ہے کہ ''سچی کہانیاں'' اسی طرح کامیابی کی منازل طے کرتا رہے۔ (آمین!) آپ سب کے لیے دُعا گو! اور سب سے دُعاؤں کی طالب ہوں۔''

✍ سویٹ سی نازیہ......! کیا ہوا یار......! کس کی نظر لگ گئی تمہیں؟ اپنا بہت خیال رکھا کرو۔ کہانی پڑھ کر تمہیں ضرور مطلع کریں گے۔

✉ تحسین جونیجو' خیر پور ناتھن شاہ سے تحریر کرتی ہیں۔ ''بہت ہی پیاری آپی منزہ! السلام علیکم! پرخلوص دُعاؤں کے پھول آپ کے نام۔ شمارہ اگست 2012ء کا ٹائٹل کچھ خاص نہیں لگا۔ منزہ آپی کے آنے والے مجموعے ''کانچ کی عورت'' کا بہت شدت سے انتظار ہے۔ ناصر انکل کا اداریہ ''آزادی'' کا یہ پوائنٹ دل کو چھو گیا۔ ''آزادی کا یہ سلسلہ تو بس ہماری زندگی کے ساتھ ہی چلے گا ناں' بہت لاجواب۔ آپی! احوال کی محفل نہایت اچھے انداز سے نبھا رہی ہیں تبھی تو ہم مصروفیت کے باوجود کچھ وقت نکال کر آپ کی محبت کے نام کرتے ہیں۔ کہانیوں میں آصفہ اقبال بلوچ کی ''میٹھا میٹھا گھر'' میٹھی میٹھی خوشبو ساتھ لیے بے انتہا لطف آیا۔ الماس فاطمہ عابدی کی ''نادیدہ عاشق'' دلسوز کہانی رہی۔ ''ہم خانہ'' غزالہ شاہین آنٹی کی بہت ہی پیاری تحریر جیسے کوئی خواب۔ ''یادوں کے اوراق'' میں رخسانہ آنٹی خوبصورت یادیں شیئر کر رہی ہیں جو کہ انجوائے کر کے پڑھتے

ہیں۔ موبائل کہانی ''محبوب قدموں میں'' ایسے عملیات سے محبت حاصل کرنا بھی کیا محبت ہوئی؟ ویسے تحریر خوب رہی۔ حنیف سحر کی ''گردشِ رنگِ چمن'' آپی زرینہ باقاعدگی سے ہر قسط پڑھ رہی ہیں' اپن کو ابھی موقع نہیں ملا پڑھنے کا۔ مزید کہانیوں میں قصہ مختصر کہ انور فرہاد کی ''موہنی'' محمد اقبال زمان کی ''قبرستان کا راجہ'' صدف آصف کی ''اس کا چہرہ'' ارم زہرا کی ''کیا یہ حقیقت ہے؟'' سدرہ انور کی ''وہ کون تھی؟'' علی صبا کی ''اور وہ اسے لے گئے'' حنا بشریٰ کی ''معمہ حل نہیں ہوتا'' اور اپنی آپی منزہ کی ''شہید کی ڈائری'' ان سبھی رائٹرز نے بہت شاندار تحریریں پڑھنے کو دیں۔ شاعری میں زمر نعیم' فہیم انکل' ارشد علی ارشد بھائی' بھائی شعبان کھوسہ زبردست رہے۔ شگفتہ شفیق کو ان کی دوسری کتاب کی اشاعت پہ مبارک باد۔''

ﷺ تحسین ڈیئر...... ! ہر انسان چاہتا ہے کہ خوش رہے اور سچی خوشی اپنے پیاروں کے درمیان ہی ملتی ہے' تمہاری محبت کے تو ہم قائل ہیں۔ کہانیاں پسند کرنے کا شکریہ۔

☒ عمران مظہر' ژوب سے تحریر کرتے ہیں۔ ''محترمہ منزہ آپی! سلام عرض ہے۔ امید کرتا ہوں کہ آپ' سر ناصر رضا اور تمام اسٹاف خیر و عافیت سے ہوگا۔ سب سے پہلے یہ بتائیے کہ مجھے ''سچی کہانیاں'' اور ''دوشیزہ'' دونوں کا سالانہ خریدار بننا ہے' اس کا کیا طریقہ کار ہے؟ اگست کے شمارے کا سرورق اچھا رہا۔ سر ناصر رضا کا اداریہ ''آزادی'' پڑھا۔ اداریئے کے آخر میں جو لائنز انہوں نے لکھی ہیں' کاش کوئی انہیں سمجھ پاتا۔ بات صرف سمجھنے کی ہے۔ جس کی سمجھ میں ''مرنے کے بعد'' آ گیا' وہ سدھر گیا۔ ''احوال'' میں اپنے پرانے ساتھیوں قرۃ العین زینب' رانا محمد شاہد اور فائزہ شہزاد اور ارشد علی ارشد کو دیکھ کر بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ آپ کا لکھا شہید کی ڈائری ہمیشہ کی طرح بہترین ہے خاص کر آپ کا اندازِ تحریر۔ مینا تاج کی ''قسمت بتانے والے'' پُراثر تحریر تھی بالکل آخر میں انہوں نے بہت زبردست پیغام convey کیا ہے۔ کاش' کوئی سمجھ پائے۔ سلیم فاروقی کی ''آتشِ جنوں'' ان کے طرزِ تحریر کی وجہ سے مجھے ماضی میں اُن کی لکھی تحریروں کی طرف لے گئی۔ سُنبل کی ''بھیروی کا انتقام'' اچھی رہی۔ آصفہ اقبال کی ''میٹھا میٹھا گھر'' بھی اچھی رہی۔ عقیلہ حق کی ''آدمی یا انسان'' بہترین رہی۔ علی صبا کی ''اور وہ اسے لے گئے'' بھی عورت کی کم عقلی کی عکاسی کرتی نظر آئی۔ اصفا فیصل کی ''کسی کو کیا ملا؟'' حسد جیسے مکروہ جذبے کو بیان کرتی نظر آئی۔ صدف آصف کی ''اس کا چہرہ'' بھی ٹھیک رہی۔ خلیل جبار کی ''محبوب قدموں میں'' بھی اچھی رہی۔ عکاشہ سحر ایمان کا ''برف زار'' بہت بہترین رہا ہے۔ رخسانہ سہام مرزا صاحبہ کا ''یادوں کے اوراق'' بھی بہترین رہا۔ ''مسئلہ یہ ہے'' تو رسالے کی سمجھیں جان ہے۔ اللہ تعالیٰ بابا جی کی عمر دراز کرے تاکہ وہ اسی طرح لوگوں کے مسائل حل کرتے رہیں۔ (آمین!) عکاشہ سحر کا شگفتہ شفیق پر تبصرہ اچھا رہا۔ کیا یہ وہی شگفتہ شفیق ہیں جو مہیش بھٹ کی ہندی فلموں کی کہانیاں لکھتی ہیں؟ بازگشت آج بھی وہی ہے جو 96ء میں تھی۔ اللہ تعالیٰ' مرحوم سہام مرزا صاحب کے درجات بلند فرمائے۔ (آمین!) منزہ آپی! ناصر سر سے میری شکایت کریں ذرا۔ میں انہیں msgs کرتا ہوں اور وہ جواب بہت کم دیتے ہیں۔ میں انہیں اور پرویز بلگرامی دونوں کو اپنا استاد مانتا ہوں۔ کوئی اپنے شاگرد کے ساتھ بھی ایسا کرتا ہے؟ اور ایک بات بتائیں پلیز' فاطمہ بلگرامی کا پرویز بلگرامی سے کیا تعلق ہے؟ دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ آپ سب میری دُعاؤں میں رہتے ہیں۔

ﷺ بھیا عمران...... ! سالانہ خریدار بننے کے لیے تم سرکولیشن منیجر سے رابطہ کرو۔ شگفتہ شفیق کا مہیش بھٹ سے کوئی تعلق نہیں۔ پرویز بلگرامی اور فاطمہ بلگرامی سمجھو' یک جان' دو قالب ہیں۔ ناصر بھائی موبائل فون سے ذرا

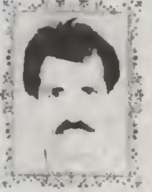
دور ہی رہتے ہیں، شاید اس لیے جواب نہیں دیتے۔

خلیل جبار، حیدر آباد سے لکھتے ہیں۔ ''محترمہ منزہ سہام صاحبہ! السلام علیکم! امید ہے کہ مزاج گرامی بخیریت ہوں گے۔ اگست کا چمکتا دمکتا شمارہ ملا۔ ٹائٹل کے پیچھے جو بیک گراؤنڈ دیا جاتا ہے اس سے ٹائٹل میں جان پڑ جاتی ہے اور ڈائجسٹ پرانا پرانا سا نہیں لگتا۔ اداریے میں ناصر رضا صاحب نے اچھا پیغام دیا ہے کہ آزادی کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ ہم مادر پدر آزاد ہو گئے ہیں۔ ''آزادی'' کے مفہوم کو صحیح طور پر اجاگر کرنے کی بہت اچھی کوشش کی ہے۔ ''اسرار پاکستان'' میں زندہ کہانی ممتاز مفتی کی پاکستان کے حوالے سے ان کے اپنے تجربات لکھے ہیں کہ پاکستان بننے پر ان کے ساتھ کیسے واقعات پیش آئے۔ پاکستان میں 65ء کی جنگ میں ہونے والے یہ پراسرار واقعات ہم نے سن رکھے تھے کہ پراسرار فوج نے ہماری فوج کے ساتھ مل کر مقابلہ کیا تھا۔ اس کے علاوہ پاکستان کے حوالے سے بہت سی نئی معلومات حاصل ہوئی۔ ''آفت کی پرکالہ'' ایک فارمولہ کہانی تھی جس کو بلاوجہ واقعات کی بھرمار کر کے طول دیا گیا ہے۔ ''شہید کی ڈائری'' اپنی مثال آپ تھی۔ اس بار پولیس کے جوانوں کے بارے میں لکھا گیا ہے کہ پولیس میں نیک اور ایماندار لوگ موجود ہیں۔ ''قسمت بتانے والے'' یہ سڑک کہانی تھی جس میں نجومیوں کے حوالے سے بتایا گیا کہ وہ لوگوں کی قسمت کا حال بتاتے ہیں لیکن خود اپنے حال سے بے حال و بے خبر ہوتے ہیں۔ مینا نے بہت اچھے انداز میں نجومی کے کردار کو اجاگر کیا ہے۔ ''آتشِ جنوں'' بہت اچھی جا رہی ہے۔ ٹیمپو بہت تیز ہے، فلمی انداز غالب ہے۔ ''بھیروی کا انتقام'' جنات کہانی ہے، اچھی سحر انگیز کہانی تھی۔ شروع سے لے کر آخر تک قاری کو اپنے سحر میں جکڑ کر رکھا ہے۔ ''میٹھا میٹھا گھر'' میں بھی گھروں میں جنات کے اثرات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ بہت اچھے انداز میں کہانی کو بیان کیا گیا ہے۔ ''ایک رات کی بات'' میں پراسرار واقعات کو بہت خوبصورت انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ ''ہم خانہ'' ایک چھوٹے سے موضوع کو بہت ہی خوبصورت انداز میں بیان کیا ہے۔ ''معمہ حل نہیں ہوتا'' آسیبی کہانیوں میں اچھی تحریر تھی۔ ''نادیدہ عاشق'' گندے اثرات کے حوالے سے کہانی ہے۔ الماس فاطمہ نے بہت اچھے انداز میں کہانی لکھی ہے۔ ''مونی'' کے رائٹر انور فرہاد کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں، ان کی ہر تحریر ایک سے بڑھ کر ایک ہوتی ہے۔ ''وہ کون تھی؟'' ایک ہلکی پھلکی گزارے لائق تحریر تھی۔ ''یہی انسان ہیں'' عقیلہ حق جانی پہچانی رائٹر ہیں، ان کے قلم سے اچھی اچھی تحریر پڑھنے کو ملتی ہیں۔ جادو ٹونے کے حوالے سے ہمارے معاشرے کی بہترین عکاسی کی گئی ہے۔ ''اور وہ اسے لے گئے'' علی صا نے کہانی میں بہت اچھی منظر نگاری کی ہے۔ ''کس کو کیا ملا؟'' جادو ٹونے کے حوالے سے ہمارے معاشرے کا حقیقی چہرہ دکھاتی ہے۔ ''درندہ'' زبردست تحریر تھی۔ ''دردِ مشترک'' اپنی نوعیت کی عجیب و غریب کہانی تھی حقیقتاً ناقابلِ یقین تھی۔ ''اس کا چہرہ'' بدشگونی کے حوالے سے ایک عجیب تحریر تھی جو ہندو معاشرے کی عکاسی کرتی ہے۔ ''جن آنکھوں میں'' ناول اپنے مخصوص انداز میں چل رہا ہے۔ ''کیا یہ حقیقت ہے؟'' ارم زہرا کی تحریر کٹی پہاڑی کے حوالے سے ہے۔ یوں تو ہم بے شمار قتل و غارت گری کے حوالے سے اخبارات میں پڑھتے رہتے ہیں لیکن اس تحریر میں کٹی پہاڑی کے حوالے سے پراسرار منظر نامہ بہت ہی خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے، اچھی اثر انگیز تحریر رہی۔ ''قبرستان کا راجہ'' دلچسپ فیچر رپورٹ تھی، قدرے بہتر تحریر پیش کی گئی ہے۔ ''برف زار'' سفرنامہ کا آخری حصہ بھی اچھا رہا۔ ''یادوں کے اوراق'' میں رخسانہ سہام مرزا صاحبہ بہت خوبصورت انداز میں اپنی زندگی کے واقعات قلم بند کر رہی ہیں۔ ''تاشون'' سلسلہ بہت اچھا

جارہا ہے۔ پُراسرار علوم کے بارے میں مفید معلومات مل رہی ہیں۔"

✍ بھائی خلیل! آپ کا خط بہت طویل تھا' یہ آپ کی محبت' مجھے قینچی چلانی پڑی' یہ میری مجبوری۔ بہر حال آپ کی رائے بہت اہم ہوتی ہے اس لیے "احوال" میں ہر ماہ اپنی شرکت یقینی بنائیے۔

اس ماہ کا خصوصی خط



✉ عبدالعزیز جی آ' چکوال سے لکھتے ہیں۔ "جناب ایڈیٹر صاحبہ! آداب و تسلیمات! حساس انسان کو چھوٹی چھوٹی غلطیاں بڑی نظر آتی ہیں اور بے حس انسان کو بڑی بڑی غلطیاں چھوٹی دکھائی دیتی ہیں بلکہ کبھی کبھی نظر ہی نہیں آتیں۔ یہی وجہ ہے کہ

اب تو ہم نے چپ چپ رہنا سیکھ لیا ہے جی آ!
گویا اب تو صبر ہی اپنا اوڑھنا اور بچھونا ہے

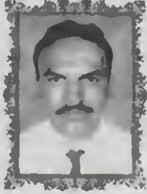
ہم نے دل کو سمجھا لیا ہے کہ جتنا سوال' اتنا جواب۔ آپ نے ہمارا کہا مانا جو نہیں؟ ویسے بھی ہم آزادی کے مفہوم سے آشنا ہیں' جو سمجھ سے بالا تھا' وہ ناصر بھائی نے اداریہ لکھ کر ہمیں سمجھا دیا ہے۔ آپ آزادی سے قینچی چلائیں اور ہماری تحریروں کی گردنیں اڑائیں' ہمارے ارمانوں کا خون کریں' بھلا آپ کو کون روک سکتا ہے؟ کاش' آپ سنجیدگی کے ساتھ صفحہ قرطاس پہ بکھری زندہ تحریروں کو زندہ احساس کے ساتھ پڑھتیں اور ہم ایجڈ لوگوں کو توقیر دیتیں۔ قابلِ احترام فائزہ شہزادا اینڈ قرۃ العین زینب' آپ لوگوں کو احوال میں دیکھ کر اتنی خوشی ہوئی جتنی ایک بچے کو کھلونا پا کر ہوتی ہے۔ اللہ آپ لوگوں کو سدا خوش رکھے۔ یہی الفاظ عبدالرؤف عدم کے لیے بھی ہیں۔ فہیم انکل' آپ غزل کے ساتھ تو جلوہ افروز ہو گئے' خط کے ساتھ بھی حاضری دیں۔ سید مستقیم نوشاہی' بھئی' آپ کہاں ہیں؟ لوٹ آؤ "احوال" میں کچھ پرانی قاریہ فضول گھریلو قصے کہانیاں لے کر بیٹھ جاتی ہیں' جن کا دوسرے احوالیوں یا پڑھنے والے قارئین کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ پلیز' توجہ دیجیے۔ "احوال" میں جو خصوصی خطوط شائع کیے جاتے ہیں' وہ کسی طرح بھی اہم نہیں لگتے۔ ہمیں ان میں تو کوئی خاص بات نظر نہیں آئی آج تک؟ یہ سلسلہ بند کر دیا جائے تو بہتر ہے۔ سلسلے وار ناولز کی تعداد بڑھتی جا رہی ہے' یہ من گھڑت خیالی داستانیاں بند کی جائیں اور جن نو آموز ننھے منے رائٹرز کا حق مارا جا رہا ہے' اُن کی کہانیاں لگائیں۔ میں نے نیو رائٹرز کو احوال میں منتیں ترلے کرتے دیکھا ہے۔ ناصر بھائی! پلیز' الماری کھولو اور ان اسٹوریوں کو نکالو جن پر نہ جانے کتنے سالوں کی گرد جمی ہے اور لکھنے والے دلبرداشتہ ہو کر ادارے سے منہ موڑ گئے' کچھ مر کھپ گئے۔ چوپال فی الفور شروع کیا جائے تاکہ موجودہ دورِ ابتلا میں نفسیاتی مریض پاکستانی معاشرے کے سنجیدہ لبوں پر مسکراہٹ آئے۔ احوال ایک دم بے رنگ و پھیکا ہے' چوپال اسے ذائقہ بھی دے گا اور رنگ بھی۔ دنیا عجائباتِ عالم سے بھری پڑی ہے۔ "سچی کہانیاں" میں نیا کچھ بھی نہیں۔ خدارا' کچھ انوکھا لاؤ جو ورطۂ حیرت میں ڈال دے۔ یہ جن بھوتوں کے فضول قصے بند کر دیں۔ نوجوان نسل کو علامہ اقبالؒ کا نظریہ دو۔ پلیز' کاغذ ختم ہو گیا۔ آہ......"

✍ عزیز بھائی......! آپ کی رائے سر آنکھوں پر مگر کچھ ہماری بھی مجبوریاں ہیں' آپ کو کم از کم ضرور سمجھنا چاہیے۔ بہر حال خط زبردست ہے۔ دیکھیے' بنا قطع و برید کے شائع کر دیا۔

پھر ملیں گے گر خدا لایا

منزہ سہام

راجہ محمود



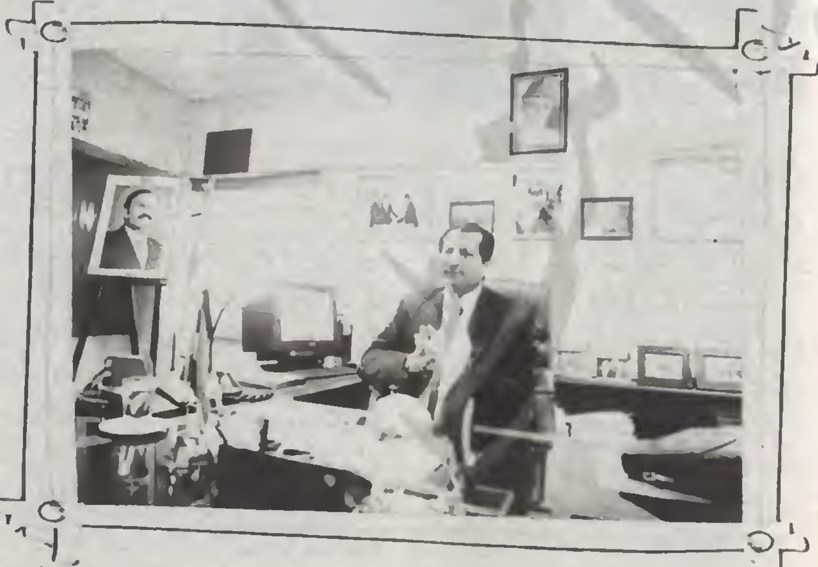
The Genius

علامہ اقبال کا خیال

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی جہنم بھی
یہ خاکی اپنی فطرت میں نہ نوری ہے نہ ناری ہے

ملک کے معروف صنعت کار ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کے سفرِ زندگی کا احوال

شام کا ملگجا اندھیرا بتدریج چہار سو پھیلتا جا رہا تھا۔ پنچھی اپنے آشیانوں کی جانب لوٹ رہے تھے۔ فضا میں شام کا مخصوص سکوت چھایا ہوا تھا۔ چہچہاتے پرندوں کی آواز اس سکوت میں ارتعاش پیدا کر رہی تھی۔ وہ چاروں دم توڑتی روشنی اور ہر لمحے پھیلتے اندھیرے سے بے نیاز اپنے پسندیدہ کھیل



میں مگن تھے۔ وہ چاروں بہن بھائی تھے اور ٹیبل ٹینس ان کا پسندیدہ کھیل تھا۔ اس وقت بھی وہ ٹیبل ٹینس کلب میں مکس ڈبل کی صورت میں ریکٹ کے جوہر دکھا رہے تھے۔ مکس ڈبل یعنی ایک بہن اور ایک بھائی کی جوڑی پر ہر ٹیم مشتمل تھی جبکہ مدمقابل بھی یہی کمبی نیشن تھا۔ مقابلہ عروج پر تھا اور چاروں پسینے میں شرابور پوائنٹس بنانے کی دھن میں جیسے خود کو بھی فراموش کیے ہوئے تھے۔ یکایک فضا میں اذانِ مغرب گونجی تو چاروں کے چلتے ہاتھ یک دم تھم گئے یوں جیسے انہیں ہوش آ گیا ہو اور یکا یکی ہی چہرے پر تفکر کے آثار بھی نمایاں ہو گئے۔ ابھی لمحوں پہلے جس جوش وولولے کے ساتھ یہ چاروں کھیل میں مصروف تھے اب وہ خوشی ان کے چہروں سے غائب ہو چکی تھی اور وہ ایک دوسرے کو سراسیمہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ ان چاروں کا فکرمند ہونا فطری تھا کیونکہ انہیں ہر صورت مغرب کے وقت تک گھر پہنچ جانا چاہیے تھا۔ یہی گھر میں قانون تھا کہ بچے مغرب سے پہلے پہلے گھر آ جائیں ورنہ اُن کی خیر نہیں ہوتی تھی اور یہ قانون نظم وضبط کی سخت پابند اُن کی اماں جان کا نافذ کردہ تھا مگر آج یہ چاروں نوجوان کھیل میں ایسے گم ہوئے کہ انہیں وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور اب مغرب کی اذان کان میں پڑی تو سب کھیل ویل بھول کر انہیں اپنی پڑی ہوئی تھی۔ بہنیں شیریں اور آفرین سخت خوف زدہ تھیں۔ انہیں اماں کے غصے کا اندازہ تھا کہ وہ ڈسپلن توڑنے کے معاملے پر بچوں کو سخت سے سخت سزا دینے سے بھی گریز نہیں کرتی تھیں۔ فکرمند تو دونوں بھائی اشتیاق اور اختیار بھی تھے مگر وہ مرد ہونے کے باعث بہنوں کے سامنے اپنے ڈر کو ظاہر نہیں کر رہے تھے۔

''اف بھیا......! اذان ہو گئی۔ اب کیا ہو گا؟''
شیریں نے خوف سے لرزتی آواز میں کہا۔


ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کا بچپن

''میں نے آدھے گھنٹے پہلے تم سب کو ٹوکا بھی تھا مگر تم نے میری ایک نہیں سنی۔'' بھائی اشتیاق نے قدرے غصے سے کہا۔

''ہم تو اُسی وقت گھر جانے کے لیے تیار تھے مگر اختیار بھائی کا تو دل ہی نہیں بھر رہا تھا کھیل سے۔'' آفرین نے منہ بناتے ہوئے کہا۔

''ہاں ہاں بھیا کا دل بھلا کیسے بھرتا؟ آج تو وہ خوب ہرا رہے تھے۔'' شیریں نے بھی شکوہ کناں انداز میں کہا۔

''بالکل آج تو کھیل کا مزہ ہی الگ تھا۔ تم سینٹ جوزف کی کیپٹن ہو مگر میرے شاٹس کے آگے تمہاری ایک نہیں چل رہی تھی۔'' اختیار نے آفرین کو چڑاتے ہوئے کہا۔

''اچھا چھوڑو ان باتوں کو اور اماں کے شاٹس کی خیر مناؤ آج تو بچ نہیں سکیں گے۔ اماں بہت غصے میں ہوں گی۔'' اشتیاق نے قدرے گھبراتے ہوئے کہا۔

''میری تو جان نکلی جا رہی ہے اماں کا سامنا کرنے کی تو مجھ میں ہمت نہیں ہے۔'' شیریں رو دینے کو تھی۔

''اب تو اللہ ہی اماں کے غصے سے بچا سکتا ہے۔'' آفرین نے باقاعدہ ہاتھ اٹھا دیئے تھے۔

''ارے ریلیکس...... کچھ نہیں ہو گا۔'' اختیار کی اس بات پر تینوں نے اپنے بھائی کو یوں دیکھا جیسے اس کی ذہنی حالت پر شبہ ہو جبکہ اختیار کے چہرے پر بھرپور اطمینان تھا۔

''بھیا......! آپ ٹھیک تو ہیں کیسے کچھ نہیں ہو گا؟'' شیریں نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں کچھ نہیں ہو گا میرے پاس ایک ٹوٹکہ ہے۔'' اختیار نے سسپنس بھرے انداز میں کہا۔

''ٹوٹکہ......!!'' تینوں بہن بھائی حیرت سے چلائے۔

''ہاں ہاں بھئی ٹوٹکہ بس اب تم تینوں دیکھتے جاؤ میں کیا کرتا ہوں۔'' پھر وہ سب ہال انسٹی ٹیوٹ کے ٹیبل ٹینس روم سے باہر نکلے۔ اختیار نے فٹ پاتھ پر اس طرح نظر ڈالی جیسے کچھ تلاش کر رہا ہو۔ آخر اسے اپنی مطلوبہ شئے نظر آ گئی۔ اس نے جھک کر ایک طرف پڑی چھوٹی چھوٹی چند ٹھیکریاں (پتھر) اٹھائیں اور فٹ پاتھ کی دیوار کے ساتھ بیٹھ کر اُن ٹھیکریوں کو احتیاط سے تلے اوپر رکھ دیا۔ تینوں بہن بھائی حیرت سے اپنے بڑے بھائی کو یہ عجیب حرکت کرتا دیکھ رہے تھے۔

''بھیا......! یہ......'' آفرین نے کچھ پوچھنا چاہا تو اختیار نے اسے اشارے سے چپ کرا دیا پھر وہ سب گاڑی میں بیٹھ کر گھر کی جانب روانہ ہو گئے۔ اختیار کے سوا سب ہی کے چہروں پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ آنے والے متوقع لمحات کے بارے میں سوچ سوچ کر اُن کے چہرے پیلے پڑ رہے تھے۔ اماں کی ڈانٹ اور سزا کا خوف اُن کے ذہنوں پر چھایا ہوا تھا مگر اختیار پرسکون بیٹھا تھا۔ اسے یقین تھا کہ گھر میں اماں کی ڈانٹ بھی نہیں پڑے گی اور سزا بھی نہیں ملے گی کیونکہ جو ٹوٹکہ اس نے کیا تھا وہ اس کا آزمایا ہوا تھا۔ ابھی چند دن پہلے ہی تو اسے اس ٹوٹکے کے بارے میں پتہ چلا تھا۔ اُس روز وہ اپنے دوستوں کے ساتھ بیٹھا تھا۔ گپ شپ میں وقت کا پتہ ہی نہ چلا اور جب دوستوں کی محفل برخاست ہوئی تو علم ہوا کہ مغرب ہوئے خاصی دیر ہو چکی ہے اور ہر طرف رات کا اندھیرا پھیل گیا ہے۔ یہ دیکھ کر اس کی روح فنا ہو گئی۔ ایک دوست نے اس کے چہرے سے چھلکتی پریشانی بھانپ لی۔

''کیا ہوا اختیار خیر تو ہے؟ ایک دم پریشان کیوں ہو گئے؟''

''یار خیر نہیں ہے۔ دیکھو کتنی دیر ہو گئی ہے ہر طرف اندھیرا ہو گیا ہے۔ آج تو اماں جان خوب سنائیں گی۔'' اس نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا تھا۔

میریٹ ہوٹل کراچی میں اپنے ولیمے کے موقع پر دلہن نورین بیگ اور بھائی اشتیاق بیگ کے ہمراہ

''ارے بس اتنی سی بات' چل' آج تجھے ایک طریقہ بتاتا ہوں جو ہر قسم کی سزا یا ڈانٹ وغیرہ سے بچا دے گا۔'' دوست جہانگیر نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''نہیں یار' سزا سے بچنے کے لیے اماں سے کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔'' اختیار نے قطعیت سے کہا۔

''ارے' کوئی جھوٹ ووٹ بولنے کی ضرورت نہیں ہے' بس اِدھر آؤ۔'' وہ دونوں فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ دوست نے ایک طرف پڑے چند پتھر اٹھائے اور اختیار کو دیتے ہوئے کہا۔ ''ان پتھروں کو کسی جگہ ایک دوسرے پر احتیاط سے رکھ دو۔''

''مم...... مگر یہ پتھر......'' اختیار نے حیرت سے کہا۔

''ارے یار' یہ سمجھو' ایک ٹوٹکہ ہے۔ جب تم اس طرح پتھر رکھ کر گھر جاؤ گے تو حیرت انگیز طور پر تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا اور تم ڈانٹ ڈپٹ سے بچ جاؤ گے۔'' دوست اسے جیسے نسخۂ کیمیا بتا رہا تھا۔ اس نے یقین اور بے یقینی کی کیفیت میں دوست کے کہنے پر عمل کیا اور پھر گھر کے لیے روانہ ہوگیا۔

دھڑکتے دل کے ساتھ اختیار نے ڈرتے ڈرتے گھر میں قدم رکھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا' وہ دبے پاؤں اپنے کمرے کی طرف بڑھنے لگا کہ عقب سے آتی اماں کی آواز پر اس کے قدم جہاں تھے' وہیں تھم گئے۔

''اختیار......!'' عجیب بات تھی کہ اماں کے لہجے میں اسے غصے کی ہلکی سی جھلک بھی محسوس نہیں ہوئی تھی۔

''جج...... جی اماں......!'' اس نے پلٹ کر کہا۔

''ارے بیٹا......! مجھے ذرا ایک کام تھا۔'' اماں نے پیار بھرے لہجے میں کہا اور وہ انہیں حیرت سے دیکھنے لگا۔ اماں نے کام بتایا مگر دیر سے گھر آنے پر ہلکی سی سرزنش بھی نہیں کی تھی۔ اس کے لیے اماں کا یہ انوکھا رویہ اچنبھے سے کم نہیں تھا۔ ایسا پہلے تو کبھی نہیں ہوا تھا۔ اماں ڈسپلن کے معاملے میں انتہائی سخت تھیں' یقیناً یہ اسی ٹوٹکے کا کرشمہ تھا جو دوست نے اسے بتایا تھا اور آج اس نے دوبارہ اس ٹوٹکے کو آزمایا تھا۔

گاڑی گھر کے گیٹ پر رکی تو وہ اپنے خیالات سے چونکا۔ تینوں بہن بھائی ڈرتے لرزتے گاڑی سے اترے اور گیٹ میں داخل ہوگئے جبکہ اختیار مطمئن انداز میں سب سے آخر میں گھر میں داخل ہوا۔ ابھی ان سب نے گھر کے اندرونی حصے میں قدم رکھا ہی تھا کہ سامنے اماں جان کو کھڑا دیکھ کر سب کے سب ٹھٹک کر اپنی جگہ جم سے گئے۔ اماں کے چہرے پر غصے کے شدید آثار نمایاں تھے اور اُن کی شعلہ بار آنکھیں چاروں کو گھور رہی تھیں۔ اماں کو اتنے غصے میں دیکھ کر بہنوں کی جان ہی نکل گئی تھی اور انہوں نے خوف سے لرزنا شروع کر دیا تھا جبکہ اختیار بھی اماں کو اس حالت میں دیکھ کر جان گیا کہ آج اس کا ٹوٹکہ کارگر ثابت نہیں ہوگا اور پھر وہی ہوا' اماں نے سب کی خوب کلاس لی' جی بھر کے ڈانٹا اور سزا کے طور پر اُن چاروں کو رات کا کھانا نہیں دیا گیا مگر جب ایک گھنٹے بعد اُن کا غصہ ذرا کم ہوا اور ابا جان نے اماں کو سمجھایا' بچوں نے آئندہ دیر سے گھر نہ آنے کا عہد کیا تو یہ سزا ختم ہوئی۔

بیگ فیملی میں بچوں کے لیے ایسا ہی سخت ڈسپلن تھا۔ فیملی کے سربراہ مرزا مشتاق بیگ تھے مگر گھر کے نظم ونسق کے معاملے میں اُن کی شریکِ حیات قدسیہ بیگم کا عمل دخل نمایاں تھا۔ ماں ہونے کے باوجود وہ بچوں سے ایسی محبت کی قائل نہیں تھیں جس سے اُن کی تربیت میں کوئی کمی رہ جائے۔ انہوں نے بچوں کے لیے خاص ضابطۂ نظم وضبط بنایا ہوا تھا۔ کب پڑھنا ہے' کب کھیلنا ہے' کب سونا ہے' شام میں کب تک لازمی گھر آ جانا ہے' ہر کام کے لیے ایک مخصوص وقت مقرر تھا جس میں رتی برابر فرق برداشت نہیں تھا۔ اگر کوئی ذرا بھی اس قاعدے قانون سے ہٹتا' اسے سزا ملتی تھی۔ اس متوسط گھرانے میں مذہبی امور پر بھی عمل کیا جاتا تھا۔ بچوں کو نماز' روزے کی سخت پابندی کرائی جاتی تھی۔

مرزا مشتاق بیگ کا حسب نسب کئی پشتوں سے مغلوں سے جا ملتا تھا' شاید اسی لیے مزاج میں فطرتاً شاہانہ پن تھا۔ بٹوارے سے پہلے دہلی میں اُن کا آبائی گھر تھا۔ 1947ء میں ہجرت کر کے پاکستان آئے تو کراچی کو اپنا جائے سکونت بنایا۔ یہاں کئی علاقوں میں رہائش اختیار کی جن میں کلفٹن اور ڈیفنس کے پوش علاقے شامل تھے۔

کعبے کے اندرونی حصے میں عجیب منظر تھا۔ ماحول عود کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور نیم اندھیرا تھا۔ ستونوں پر وہ برتن لٹک رہے تھے جو نبی اکرم ﷺ کے زیرِ استعمال رہے تھے۔ ایک جانب وہ جائے نماز بچھی تھی جس پر سرکارِ دو عالم ﷺ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس جائے نماز پر اختیار بیگ بے تابانہ گر سے گئے اور اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ اُس وقت انہیں وہ تمام دُعائیں بھول گئی تھیں جنہیں وہ یاد کر کے آئے تھے۔ وہ تو خود فراموشی کے عالم میں بس زاروقطار اشک بہائے جا رہے تھے

مورخہ 13 مارچ بروز پیر کو مرزا مشتاق بیگ کے ہاں ایک بیٹے کی آمد ہوئی جس کا نام اختیار رکھا

گیا حالانکہ گھر میں یہ پہلی اولاد تھی مگر اس کے باوجود بچے سے بے جا لاڈ پیار نہیں برتا گیا۔ اختیار جب شعور کی منزل تک پہنچا تو اسے یہ بات اچھی طرح ذہن نشین ہو چکی تھی کہ زندگی ایک خاص طور طریقے کے مطابق گزارنی ہے۔ اس دوران دوسرے بہن بھائی بھی دنیا میں آ چکے تھے مگر گھر کا قانون کسی کے لیے نہیں بدلا تھا' سب کے لیے یکساں تھا۔ اسی سخت ماحول میں اختیار کا بچپن گزر رہا تھا۔ بسا اوقات بچپن کی لاابالی طبیعت میں تمام قاعدے و ضابطے توڑنے کی شدید خواہش جاگتی مگر اس سوچ کو عملی جامہ پہنانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ اکثر ایسا ہوتا باہر گلی میں کھیلتے بچوں یا بارش میں بھیگتے اپنے ہم عمروں کو دیکھ کر دل میں خیال آتا کہ ہم بھی اُن کے ساتھ آزادانہ گھومیں پھریں اور موج اڑائیں مگر گھر کی سخت پابندیاں یہ حسرت دل میں دبائے رکھنے پر مجبور کر دیتیں۔ ایسا نہیں تھا کہ بیگ فیملی کا یہ گھرانہ بچوں کے لیے قید خانہ تھا بلکہ بچوں کو اُن کی پسند کا ہر کام کرنے کی اجازت تھی' وہ کھیل کے وقت کھیل سکتے تھے مگر دوسرے تمام بچوں کی طرح گلی میں نہیں بلکہ کلب میں جہاں بچے دل کھول کر ہڑبونگ بھی مچاتے تھے اور ہلہ گلہ بھی کرتے تھے۔

قدسیہ بیگم نے بچوں کے لیے نظم و ضبط کا یہ نظام یونہی نہیں بنایا تھا بلکہ اُن کے ذہن میں ایک خاص مقصد تھا۔ وہ چاہتی تھیں' ان کی اولاد دوسرے بچوں سے ہٹ کر پروان چڑھے۔ اُن کی تربیت اس نہج پر کی جائے کہ مسابقت کی اس بے رحم دنیا میں بچے خاص طور پر بیٹے کسی سے پیچھے نہ رہیں بلکہ سب سے نمایاں نظر آئیں۔ اولاد کو ایک کامیاب انسان کے روپ میں ڈھالنے کے لیے ضروری تھا کہ شروع ہی سے ان میں وقت کی اہمیت اور ہر کام نظم کے ساتھ کرنے کی عادت ڈالی جائے چنانچہ اسی مقصد کے حصول کی خاطر وہ بچوں کو کسی بھی طرح کی رعایت دینے کو تیار نہیں تھیں چونکہ تعلیم کے معاملے میں کسی بھی قسم کا کوئی سمجھوتہ انہیں منظور نہ تھا' یہی وجہ تھی کہ اختیار نرسری لیول سے ہی تعلیمی میدان میں کامیابیاں حاصل کرنے لگا تھا اور اپنے شاندار تعلیمی



ڈاکٹر بیگ اور نورین بیگ، اپنے بیٹے عمیر بیگ کے اسکول کے اسپورٹس ڈے کے موقع پر

ریکارڈ کے ساتھ اس نے میٹرک کا امتحان بھی زبردست نمبرز سے پاس کیا تھا۔ یوں اپنے تعلیمی کیریئر کا ایک سنگ میل عبور کر کے والدین کو بے پایاں خوشی سے نہال کر دیا تھا۔ اُس روز قدسیہ بیگم حقیقتاً اپنے رب کی شکر گزار تھیں کہ اُن کی محنت رنگ لائی تھی۔ اب گریجویشن کے لیے نظرِ انتخاب ڈی جے سائنس کالج پر ٹھہری جو کہ ایک نامی گرامی کالج تھا جہاں 85% پر داخلہ ملتا تھا حتیٰ کہ جن طالب علموں کی پرسنٹیج 84% ہوتی تھی' وہ بھی ڈراپ ہو جاتے تھے یعنی ذہین ترین اسٹوڈنٹس کی کریم ہی مذکورہ کالج تک رسائی حاصل کر پاتی تھی۔ اختیار کی پرسنٹیج ایڈمیشن کے معیار کی مطابق تھی لہٰذا اسے یہاں داخلہ ملنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔ ڈی جے سائنس کالج میں گزرے ماہ و سال میں اختیار نے پہلے سے زیادہ محنت کرنا شروع کر دی تھی۔ اب اس کے سامنے ایک مقصد تھا' ایک منزل تھی' وہ بینکنگ کے شعبے میں اپنا مقام بنانا چاہتا تھا۔ وہ عام سی زندگی جی کر گمنام ہونا نہیں بلکہ دنیا کے کامیاب بینکرز کی فہرست میں اپنا نام بھی شامل کرنے کا خواہش مند تھا۔ جانے بینکر بننے کا خیال اُس کے ذہن میں کس نے ڈالا تھا؟ مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس کی یہ خواہش شدت اختیار کرتی چلی گئی تھی۔ کالج میں اس کا بہترین دوست جہانگیر شاہ تھا' وہ بھی بینکنگ کو اپنا کیریئر بنانا چاہتا تھا۔ اکثر دونوں دوست ساتھ بیٹھے ہوتے تو مستقبل کے سپنے بُن رہے ہوتے۔ دونوں دوستوں کے عزائم بلند تھے اور ارادے پختہ تھے۔ اُن کی گفتگو اکثر کچھ اس طرح کی ہوتی تھی۔

''یار اختیار' دیکھنا' ایک روز میں اتنا کامیاب بینکر بنوں گا کہ میرا انٹرویو 'نیوز ویک' میں آئے گا۔'' دوست جہانگیر کہتا۔

''اور تم بھی لکھ لو' میں بھی مالیاتی ماہر بنوں گا اور ٹائم میگزین کے کور پر میری تصویر آئے گی۔'' اُس وقت اختیار خلاؤں میں گھورتے ہوئے جیسے کسی غیر مرئی دنیا کو دیکھ رہا ہوتا۔

اختیار کا ایک اور دوست مرتضیٰ جتوئی تھا جو کہ اُس وقت کے وزیر اعلیٰ غلام مصطفیٰ جتوئی کا نورِ نظر تھا۔ اُس دوستی نے بھی بچپن سے جوانی تک کا سفر طے کر لیا تھا۔ مرتضیٰ جتوئی ذرا بے فکر قسم کا نوجوان تھا۔ اس کے ذہن میں مستقبل کی کوئی خاص پلاننگ نہیں تھی چونکہ باپ صوبے کا وزیر اعلیٰ تھا' شاید اسی لیے زندگی کو ہنسی کھیل میں گزارنے کا قائل تھا۔ گھومنا پھرنا' سیر سپاٹے اور ہوٹلنگ وغیرہ کرنا اس کے شوق تھے۔ وہ آئے دن اختیار کے گھر پہنچ جاتا کہ چلو' کہیں گھومنے یا کسی ہوٹل میں چلتے ہیں۔ ایسے موقع پر عجیب صورت حال ہوتی۔ وزیر اعلیٰ کا بیٹا باہر کھڑا اپنے دوست کا منتظر ہوتا اور گھر میں اختیار' اماں کی منت سماجت کر رہا ہوتا۔

''اماں' پلیز' بس ایک گھنٹے میں واپس آ جاؤں گا۔''

اور پھر خاصی کوشش کے بعد اسے جانے کی اجازت ملتی تھی۔ مرتضیٰ اکثر بینک بھی پہنچ جاتا تھا مگر اختیار کام کے دوران جانے سے انکار کر دیتے تھے۔ ایک روز اماں نے اس حوالے سے بیٹے کو سمجھاتے ہوئے کہا تھا۔

''دیکھو بیٹا' مرتضیٰ کا باپ وزیر اعلیٰ ہے اور یہ لوگ سندھ کے بڑے زمیندار ہیں انہیں زیادہ محنت کی ضرورت نہیں لیکن تمہیں تو ابھی اپنی زندگی خود بنانی ہے' بہت کچھ حاصل کرنا ہے۔ اگر تم ان فضولیات میں وقت ضائع کرو گے تو اپنی منزل سے بھٹک جاؤ گے۔'' اماں کی بات درست تھی جسے اختیار نے اپنے ذہن میں بٹھا لیا کیونکہ وہ ایک متوسط گھرانے سے تعلق رکھتا تھا۔ والدین نے بچوں کو اچھی تعلیم کے ساتھ اخلاقی قدریں سکھائی تھیں۔ اسے زندگی سے اپنا حصہ حاصل کرنے کے لیے شدید اور انتھک محنت کرنا تھی چنانچہ وہ گھومنے پھرنے یا ہوٹلنگ جیسی فضولیات سے دور ہوتا چلا گیا اور سنجیدگی سے اپنے کیریئر پر نظریں جما دیں۔

1975ء میں ڈی جے سائنس کالج سے گریجویشن کیا تو عملی زندگی کا آغاز ہوا اور UBL میں گریڈ III آفیسر کی پوسٹ ملی جو کہ مینجمنٹ لیول کی پوسٹ تھی۔ اسٹاف کالج میں ٹریننگ ہوئی اور تقرری ملک سے باہر ہوئی تھی۔ اختیار کا سب سے قریبی دوست مسلم کمرشل بینک کے صدر کا بیٹا

جہانگیر شاہ بھی اسی بیچ میں شامل تھا۔ دونوں دوست منصوبے بنانے لگے کہ ہم بیرون ملک ایک جگہ جاب کریں گے۔ یہ بات جہانگیر شاہ کے والد کے علم میں آئی تو انہوں نے دونوں دوستوں کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ''اگر تم دونوں ایک جگہ جاؤ گے تو کام نہیں کر سکو گے لہٰذا الگ الگ جگہ کام کرو۔'' چنانچہ انہوں نے اختیار کو میڈل ایسٹ بینک کے نام سے دبئی میں کھلنے والے اپنے بینک میں رکھ لیا جس کی پہلی برانچ 1977ء میں دبئی میں قائم ہوئی تھی۔ جبکہ اُن کا بیٹا

باحیثیت اور امیر و کبیر عرب فیملیز سے اس کے تعلقات قائم ہو گئے تھے۔ اختیار بحیثیت بینکر ان کی نجی مجلسوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس طرح اس کا حلقۂ احباب وسیع ہوتا چلا گیا۔ اب یہ ہونے لگا کہ بینک کے لیے کسی عرب شیخ کا کوئی بڑا ڈپازٹ لانا ہوتا تو اختیار ہی کو اس کام کے لیے چنا جاتا تھا اور وہ کامیابی سے اس ٹارگٹ کو حاصل کر لیتا تھا۔ نتیجتاً بینک کے کلائنٹ میں اضافہ ہوا تو وہ تیزی سے ترقی کرنے لگا اور اس کے پرافٹ اور ڈپازٹ میں روز افزوں اضافہ



ڈاکٹر اختیار بیگ، اپنی والدہ قدسیہ بیگم، بھائی اشتیاق بیگ، بہن آفرین بیگ (مرحومہ)، بہنوئی سلیم یوسف، اہلیہ نورین بیگ اور خاندان کے دیگر بچوں کے ہمراہ

جہانگیر شاہ BCCI بینک میں چلا گیا۔

مڈل ایسٹ بینک سے اختیار کی ترقی کا دور شروع ہوا۔ دبئی میں رہتے ہوئے اس نے سب سے پہلے باقاعدہ طور پر عربی سیکھی تھی۔ یہ زبان بطورِ شوق سیکھی تھی مگر آگے چل کر عربی اُس کے پیشہ ورانہ کیریئر میں ترقی کا زینہ ثابت ہوئی تھی۔ اسی زبان کے طفیل

ہونے لگا۔ ایک وقت ایسا آیا کہ اختیار کی بینک کی مذکورہ برانچ دبئی میں سب سے زیادہ پرافٹ اور ڈپازٹ لینے والی برانچ بن گئی۔ یہ ساری کامیابی اس کے ذاتی تعلقات اور محنت کا نتیجہ تھی۔ عربوں سے ذاتی تعلقات اس نہج پر تھے کہ جب بھی وہ شکار کے لیے پاکستان آتے' اختیار کو بھی اپنے ساتھ لے آتے

تھے۔ 1977ء سے 1982ء کے عرصے کے دوران اختیار کامیابی کے زینے طے کرتا چلا گیا۔ ان پانچ برسوں میں نہ صرف مڈل ایسٹ بینک ترقی کر گیا تھا بلکہ وہ خود بھی مالی اعتبار سے خاصہ مستحکم ہو گیا تھا اور یہیں سے اختیار کی زندگی میں وہ موڑ آیا جب اس پر ترقی کے نئے دروازے کھلتے چلے گئے۔

ایک روز وہ یونہی بیٹھا اپنی اب تک کی زندگی کا تجزیہ کر رہا تھا کہ اس کے ذہن میں ایک مختلف خیال آیا اس نے اپنی ذہنی صلاحیتوں کے بارے میں سوچا جس کے ذریعے اس نے اب تک اپنی عملی زندگی میں توقعات سے زیادہ کامیابیاں حاصل کی تھیں' تاہم اس سے کہیں زیادہ فائدے میں وہ ادارے رہے تھے جن کے لیے اس نے اپنی ذہانت کو استعمال کیا تھا' بس اسی خیال کے تحت اس کے ذہن میں آیا کہ میں اپنا دماغ اب تک دوسروں کے لیے استعمال کرتا رہا ہوں جس سے انہیں بے حد فوائد حاصل ہوئے ہیں جبکہ میرے اپنے حصے میں جو کچھ آیا' وہ بظاہر تو قابلِ تحسین ہے مگر اُس فائدے کا عشرِ عشیر بھی نہیں ہے جو اس کی صلاحیتوں سے دوسروں کو حاصل ہوا ہے۔

'کیوں نہ میں اپنا دماغ اپنے لیے استعمال کروں؟' یہی وہ سوچ تھی جو اس کی زندگی کا ٹرننگ پوائنٹ ثابت ہوئی۔ اس نے سنجیدگی سے اپنے کاروبار کے حوالے سے غور کرنا شروع کر دیا تھا۔ کسی بھی بڑے کام یا کارنامے میں سوچ بنیادی کردار ادا کرتی ہے۔ پہلے سوچ پیدا ہوتی ہے اور پھر عمل۔ اختیار کے ذہن میں سوچ تو پیدا ہو چکی تھی' اب اس پر عمل کرنا باقی تھا جس کے لیے اس نے تگ و دو شروع کر دی۔ اس سلسلے میں اس نے اپنے بھائی اشتیاق سے مشورہ کیا تو اس نے بھی اختیار کے خیال سے اتفاق کیا پھر دونوں بھائیوں نے اپنے پاس جمع شدہ رقم کا حساب کتاب لگایا تو پتہ لگا' ان کے پلے

کل جمع شدہ رقم چھ لاکھ درہم ہیں جو اُس وقت کے حساب سے ڈیڑھ سے دو لاکھ ڈالر تک بنتے تھے۔ رقم اچھی خاصی تھی۔ اب سوچنا یہ تھا کہ کس کاروبار میں ہاتھ ڈالا جائے؟ اس سلسلے میں اختیار نے اردگرد نظریں دوڑانا شروع کر دیں۔

اُن دنوں فلم پروسیسنگ اور ڈیولپنگ نے اتنی ترقی نہیں کی تھی۔ تصویروں کے رول ڈیولپنگ کے لیے یورپ جایا کرتے تھے جس میں تقریباً ایک مہینے سے زیادہ عرصہ لگ جاتا تھا۔ ان ہی دنوں فلم پروسیسنگ میں ایک نئی ٹیکنالوجی متعارف ہوئی تھی۔ اختیار نے جاپان جا کر اس ٹیکنالوجی کا بھرپور طریقے سے مطالعہ کیا۔ وہ ''نورستو'' نامی جاپانی کمپنی کی فلم پروسیسنگ لیبارٹری تھی۔ اس ٹیکنالوجی سے فلم پروسیسنگ کے شعبے میں ایک جدت آ گئی تھی۔ فلم ڈیولپنگ کا جو کام مہینوں میں ہوتا تھا' وہ اس نئی ٹیکنالوجی کے تحت محض 45 منٹ میں ہو سکتا تھا۔

جب اچھی طرح اس ٹیکنالوجی کا مطالعہ کر کے اختیار بیگ کو یقین ہو گیا کہ یہ کاروبار مناسب رہے گا تو اس لیبارٹری کو خریدنے کا ارادہ کیا گیا مگر اسے خریدنے کے لیے ان کے پاس موجود رقم کم پڑ گئی چنانچہ بینکوں سے لون لیا گیا چونکہ اختیار بیگ معروف بینکر تھے اس لیے لون وغیرہ حاصل کرنے میں کچھ خاص دشواری کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا۔ ''نورستو'' کمپنی کی مذکورہ فلم پروسیسنگ لیب خرید کر متحدہ عرب امارات میں ''فوٹو میجک'' کے نام سے لیبارٹری قائم کی گئی۔ اس جدید مشینری کے ذریعے فوٹو گرافی میں انقلاب آ گیا۔ ''کونیک فوٹو لیب'' کے تحت فلم رولز جو پہلے تیس دن میں تیار ہوتے تھے' اب محض 45 منٹ میں تیار ہونے لگے۔ فوٹو میجک کی ایسی دھوم مچی کہ کسٹمرز کی لائنیں لگ گئیں۔ اختیار بیگ کا بزنس تیزی سے ترقی کرنے لگا۔ اس کامیابی پر

نوروسٹو اور کوڈک والے ابھی بہت خوش تھے۔ان کی جدید مشینری کو حیرت انگیز رسپانس ملا تھا۔اس کامیابی کو دیکھتے ہوئے متحدہ عرب امارات میں فوٹو میجک کی پچیس برانچز قائم کی گئیں۔تقریباً ہر قابل ذکر شاپنگ مال میں فوٹو میجک کی برانچ کھل گئی تھی۔یو اے ای میں فقید المثال کامیابی کے بعد اختیار بیگ نے مراکو کا رخ کیا۔وہاں بھی فوٹو میجک کی کوئیک فوٹو لیب نے کامیابی کے جھنڈے گاڑے پھر کراچی کے مصروف تجارتی علاقے صدر میں بھی فوٹو میجک کی بنیاد رکھی گئی۔کوئٹہ میں بھی برانچیں قائم کی گئیں۔یوں تھوڑے ہی عرصے میں اس انقلابی ٹیکنالوجی کے چرچے ہر جگہ ہونے لگے تھے۔اختیار بیگ اس انقلاب کے بانیوں میں سے تھے۔فوٹو میجک نے تھوڑے عرصے میں ایسی مثالی کامیابی حاصل کی کہ یہ ہاؤس ہولڈ نام بن گئی اور محض چھ ماہ کے مختصر ترین عرصے میں بینکوں سے لیا گیا لون سود سمیت واپس کر دیا گیا۔چند ماہ میں ہی فوٹو میجک اتنی ترقی کر گئی کہ اب وہ مختلف نوعیت کے فیشن ایونٹس اسپانسر بھی کرنے لگی تھی۔

1982ء میں ہی ہونے والے ایک فیشن شو کو فوٹو میجک نے اسپانسر کیا تھا جس میں دنیا بھر کی نامور ماڈلز نے شرکت کی تھی۔ان ہی میں ایک ماڈل بٹی اوکانر (Betty O conner) بھی تھی جو سال 1982ء کی مس انڈیا منتخب ہوئی تھی۔اس شو کو بٹی اوکانر نے ہی لیڈ کیا تھا۔مس انڈیا بٹی اوکانر کا تعلق بھارت کے صوبے مہاراشٹر سے تھا۔مس انڈیا کو دیکھ کر اختیار بیگ کے ذہن میں ایک خیال آیا جب شو ختم ہوا تو انہوں نے بٹی اوکانر سے ملاقات کے دوران اسے اپنی کمپنی فوٹو میجک جوائن کرنے کی آفر کر دی۔

”لیکن میرا اس شعبے میں کوئی تجربہ نہیں ہے؟“
بٹی اوکانر نے آفر کے جواب میں کہا۔



محترمہ بے نظیر بھٹو وطن واپسی کے موقع پر ڈاکٹر اختیار بیگ کے نام والا کیپ پہنی ہوئی ہیں

شہادت سے پہلے بے نظیر بھٹو کا آخری sms اختیار بیگ کے Cell فون پر ہی آیا تھا جس کے الفاظ تھے۔ "I hope you R happy. U must win this Bilawal House seat." اختیار بیگ کو آج بھی اس بات کا پچھتاوا ہے کہ وہ محترمہ کی یہ خواہش پوری نہ کر سکے اور ان کی نشست مصلحت کی بھینٹ چڑھ گئی۔

”آپ کا صرف نام استعمال کیا جائے گا تاکہ ہماری کمپنی کو مزید پبلسٹی ملے۔“

”اچھا تو آپ مجھے کتنا معاوضہ دے سکتے ہیں؟“
”جتنا آپ چاہیں۔“
”میں دس ہزار ریال لوں گی۔“
”او کے ڈن۔“

یوں بٹی اوکانر نے پروموشن اینڈ پبلسٹی منیجر کی حیثیت سے فوٹو میجک جوائن کر لی جس کا اعلان ایک پریس کانفرنس میں خود بٹی اوکانر نے کیا۔مس انڈیا کے ایک پاکستانی کمپنی جوائن کرنے سے UAE میں تہلکہ مچ گیا۔اگلے دن متحدہ عرب امارات کے اخبارات کی ہیڈ لائن تھی۔

Miss India joins Pakistani company

بٹی اوکانر کے آنے سے فوٹو میجک کو اختیار بیگ کی توقع کے مطابق بھرپور boost ملا۔پورے UAE سے بٹی اوکانر کے پرستار اس سے آٹو گراف لینے آتے تھے۔اس طرح فوٹو میجک ہاؤس ہولڈ نام بن گئی مگر دبئی میں کام کرنے والی اکثر بھارتی کمپنیوں کو ایک پاکستانی کمپنی کی یہ ترقی ہضم نہیں ہوئی۔انہوں نے ایک منظم طریقے سے بٹی اوکانر کے خلاف محاذ کھول لیا اور اس پر بھرپور دباؤ ڈالا کہ وہ فوٹو میجک سے استعفیٰ دے دے ورنہ اسے ملنے والا مس انڈیا کا ٹائیٹل چھین لیا جائے گا۔بٹی اوکانر نے اس دباؤ کی قطعی پروا نہیں کی اور دوٹوک الفاظ میں کہہ دیا کہ چاہے میرا ٹائیٹل چھین لیا جائے‘ مجھے کوئی پروا نہیں لیکن میں اپنے معاہدے کی پاسداری کروں گی۔بٹی اوکانر نے بہت ہمت و حوصلے سے اپنے ملک کی کمپنیز کی سازشوں کا مقابلہ کیا اور اس میں سرخرو ہوئی۔بٹی اوکانر کا فوٹو میجک جوائن کرنے کا فیصلہ محض پیسے کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ وہ اختیار بیگ کی شخصیت اور ان کی خود اعتمادی سے بے حد متاثر ہوئی تھی۔شاید یہی وجہ تھی کہ بٹی اور اختیار بیگ کے مابین پیشہ ورانہ تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔دونوں ہر پروموشن یا پبلسٹی کی تقریب میں اکثر ساتھ ساتھ نظر آتے‘ چنانچہ ان کے حوالے سے سرگوشیاں ہونے لگیں۔اس تعلق کو جو خالصتاً پیشہ ورانہ تھا‘ اسکینڈلائز کرنے کی کوشش کی جانے لگی۔ان سرگوشیوں کی بھنک اختیار بیگ کی والدہ اور بہنوں کے کانوں تک پہنچی تو انہیں تشویش ہونے لگی۔ماں فکر مند ہو گئی کہ ان کا لائق و فائق بیٹا کہیں واقعی اس خوبصورت بلا کے سحر میں تو نہیں جکڑ گیا؟ اس حوالے سے بیٹے سے باز پرس بھی کی گئی مگر اختیار کے لاکھ یقین دلانے کے باوجود ماں کی پریشانی ختم نہیں ہوئی لہٰذا اس مسئلے کا یہ حل نکالا گیا کہ بیٹے کو شادی کے بندھن میں باندھ دیا جائے۔لڑکی کی تلاش شروع ہوئی تو بہنوں نے اپنی ایک کلاس فیلو نورین کو بھائی کے لیے پسند کر لیا‘ یوں اختیار بیگ 1984ء میں رشتۂ ازدواج میں منسلک ہو گئے۔

زندگی اپنی ڈگر پر رواں دواں تھی۔اس دوران اختیار بیگ نے امریکہ سے ایم بی اے کیا اور پھر امریکہ سے ہی ڈاکٹریٹ PHD کی ڈگری حاصل کی اور پھر دن دونی رات چوگنی ترقی کرتا گیا۔چونکہ بیگ فیملی خاصی حد تک مذہبی بھی تھی اس لیے گھرانے میں روپے پیسے کی ریل پیل کے باوجود نماز‘ روزے کی سختی سے پابندی کی جاتی تھی اور گھر کے افراد کئی بار حج و عمرے کی سعادت بھی حاصل کر چکے تھے۔اختیار بیگ نے بھی متعدد بار حج اور عمرے کیے تھے۔اللہ کے گھر کی یہ زیارت تنہا بھی کی اور اماں کے ساتھ بھی گئے۔ایک بار اماں کو عمرہ کروا رہے تھے تو خانہ کعبہ کا طواف روک دیا گیا تھا کیونکہ سعودی بادشاہ کو رسم کعبہ ادا کرنا تھی۔یہ منظر دیکھ کر اس وقت اُن کے دل میں بھی یہ خواہش جاگی کہ کاش وہ بھی خانہ کعبہ کے اندر جا کر عبادت کرنے کا

شرف حاصل کرسکیں اور پھر اُن کی یہ خواہش چند برسوں بعد حیرت انگیز طریقے سے پوری ہوئی۔ ایک روز انہیں سعودی ایمبیسی سے فون آیا کہ انہیں یمن کے قونصل جنرل کی حیثیت سے اور اُن کے بھائی اشتیاق بیگ کو مراکش کے قونصل جنرل کی حیثیت سے شاہی مہمان کے طور پر غسلِ کعبہ کی رسم میں مدعو کیا گیا ہے۔ یہ اُن کے لیے زندگی کی سب سے بڑی خوش خبری تھی اور انہیں سمجھ نہیں آرہا تھا کہ اپنے مہربان رَب کا کس طرح شکر ادا کریں؟ کیونکہ ان کی دلی خواہش پوری ہوگئی تھی۔ مقررہ دن دونوں بھائی جب مکہ پہنچے تو معلوم ہوا کہ اس رسم میں شرکت کے لیے مختلف ممالک کے صدور، وزرائے اعظم، بادشاہ اور شہزادے آئے ہوئے تھے۔ یہ کل 32 افراد تھے جن میں اختیار بیگ اور اشتیاق بیگ بھی شامل تھے۔ ان سب کو شاہی پروٹوکول دیا گیا تھا۔ اُن تمام افراد کے تین گروپ بنائے گئے اور ہر گروپ کو دس دس منٹ دیئے گئے تھے۔ اختیار بیگ پہلے گروپ میں تھے۔ جب خانۂ کعبہ کے اندر داخل ہونے کا وقت آیا تو انہیں حجرِ اسود کے سامنے لے جایا گیا۔ اختیار بیگ دیوانہ وار اس مقدس پتھر کو بوسہ دینے لگے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں ہاتھ لگانا بھی مشکل ہوتا تھا۔ اختیار بیگ عقیدت واحترام سے حجرِ اسود کو بوسہ دیتے رہے لیکن انہیں منع نہیں کیا گیا اور نہ وہاں سے ہٹایا گیا۔ کیونکہ وہ ان کے مہمان تھے۔ اس کے بعد کعبے کے اندر جانے کا مرحلہ آیا۔ کعبے کے گیٹ پر ''الشعبی'' قبیلے کے سربراہ موجود تھے۔ یہ قبیلہ حضور ﷺ کے زمانے سے کعبے کی خدمت پر مامور ہے اور اس قبیلے کے پاس کعبے کی کنجیاں ہوتی ہیں۔ اختیار بیگ کعبے کے اندر قدم رکھنے لگے تو ''الشعبی'' قبیلے کے سربراہ نے عربی میں کہا۔ ''آپ کو مبارک ہو۔'' اختیار بیگ نے بھی عربی میں اُن کو جواب دیا اور اندر داخل ہوگئے۔ اندرونی حصے میں عجیب منظر تھا۔ ماحول عود وعنبر کی خوشبو سے مہک رہا تھا اور نیم اندھیرا تھا۔ ستونوں پر وہ برتن لٹک رہے تھے جو نبی اکرم ﷺ کے زیرِ استعمال رہے تھے۔ ایک جانب وہ جائے نماز بچھی تھی جس پر سرکار ﷺ نماز ادا کیا کرتے تھے۔ اس جائے نماز پر اختیار بیگ بے تابانہ گر سے گئے اور اُن کی آنکھوں سے بے اختیار آنسو جاری ہوگئے۔ اُس وقت انہیں وہ تمام دُعائیں بھول گئی تھیں جنہیں وہ یاد کرکے آئے تھے۔ وہ تو خود فراموشی کے عالم میں بس زاروقطار اشک بہائے جارہے تھے۔ اُس وقت دنیا سے اُن کا تعلق یکسر ختم ہوگیا تھا اور وہ خود کو اتنا ہلکا پھلکا محسوس کررہے تھے جیسے ہواؤں میں اڑ رہے ہوں۔ اس کیفیت میں جو کچھ دل میں آیا، اپنے رحیم وکریم رَب سے مانگتے رہے۔ دس منٹ گزر گئے، پہلا گروپ باہر چلا گیا مگر وہ وہیں بیٹھے رہے۔ دوسرا گروپ بھی اندر آکر دس منٹ بعد باہر چلا گیا مگر وہ اسی کیفیت میں جاء نماز پر بیٹھے رہے اور جب تیسرا گروپ بھی جانے لگا تو وہاں کے خادمین نے کہا۔ ''آپ کی عمر دراز ہو، وقت ختم ہوگیا ہے۔'' وہ آنسوؤں سے بھیگے ہوئے چہرے کے ساتھ اٹھے اور پھر غسلِ کعبہ دینے والوں میں شامل ہوگئے۔ عرقِ گلاب، آبِ زم زم اور سفید ململ سے غسل دیا گیا تھا پھر انہیں خانۂ کعبہ کے غلاف کا ٹکڑا، ململ اور بوتل میں غسل کا پانی تبرکاً دیا گیا۔ اختیار بیگ اپنے ہمراہ جو عطر لے کر گئے تھے، اُسے خانۂ کعبہ میں اِدھر اُدھر لگاتے رہے اور اُن کے کپڑوں میں وہ خوشبو رچ بس گئی۔ جب وہ باہر نکلے تو اُن کے ہاتھ میں خوشبو سے معطر ایک رومال تھا۔ باہر آتے ہی لوگوں نے والہانہ انداز میں انہیں گلے سے لگالیا۔ اُن میں زیادہ تر پاکستانی تھے۔ لوگوں نے اُن کے ہاتھ میں پکڑا رومال دھجیاں

دھجیاں کرکے آپس میں تقسیم کرلیا۔

اختیار بیگ اس مقدس اور روح پرور واقعے کو اپنی زندگی کا سب سے بڑا اعزاز مانتے ہیں اور اسے بہت فخر کے ساتھ بیان کرتے ہیں کہ ماں کی دُعاؤں کے طفیل اللہ نے انہیں اپنے گھر میں شاہی مہمان کی حیثیت سے بلایا تھا۔ غسل خانۂ کعبہ میں خصوصی شرکت حاصل کرنے کی سعادت کو وہ باعثِ افتخار سمجھتے ہیں۔

اختیار بیگ کی قسمت کا ستارہ عروج کی جانب گامزن تھا۔ اُن کا بزنس بہت تیز رفتاری سے ترقی کی منازل طے کرتا جارہا تھا جس سے اُن کی مالی حیثیت میں بے انتہا اضافہ ہوا تھا۔ وہ اب دبئی کے اہم بزنس مینوں میں شامل ہوچکے تھے کہ اچانک انہوں نے ایک عجیب فیصلہ کیا۔ وہ پاکستان آکر بزنس کرنا چاہتے تھے۔ اُن کے اس فیصلے کی مخالفت کرنے والوں میں اُن کی بیگم بھی شامل تھیں۔ اُن کا کہنا تھا کہ سرمایہ دار پاکستان چھوڑ کر دبئی آرہے ہیں کیونکہ پاکستان کے حالات کسی طور پر بھی بزنس کے لیے سازگار نہیں ہیں نہ وہاں جان کا تحفظ ہے نہ مال کا۔ اس صورتِ حال میں آپ کروڑوں کا سرمایہ پاکستان میں لگانا چاہتے ہیں؟ مگر اختیار بیگ فیصلہ کرچکے تھے، پاکستان میں کوئی انڈسٹری لگانی ہے چنانچہ انہیں کسی بھی قسم کی کوئی دلیل نہیں روک سکی اور وہ پاکستان آگئے البتہ اُن کی فیملی دبئی میں ہی رہی۔ یہاں آکر انہوں نے کچھ عرصے حالات کا جائزہ لیا، پیپر ورک کیا اور بیگ اسپننگ مل کے منصوبے پر کام شروع کردیا۔ اختیار بیگ نے پی ایچ ڈی کی ڈگری 'بیمار صنعتوں کی بحالی' کے موضوع پر مقالہ لکھ کر حاصل کی تھی۔ اپنی اس ڈگری کو کام میں لاتے ہوئے انہوں نے سوچا کہ بیمار صنعتوں کی بحالی سے پاکستان میں معیشت کا پہیہ چلایا جاسکتا ہے پھر عملی طور پر بھاوانی گروپ کی ایک بند مل کو بحال کرنے کا بیڑہ اٹھایا۔ مذکورہ مل ایک عرصے سے بند پڑی تھی اور انتہائی خستہ حالت میں تھی۔ مشینیں خراب پڑی تھیں، چنانچہ نئی مشینیں لگائی گئیں اور اختیار بیگ نے بذاتِ خود جاکر اس کی بحالی کے عمل میں حصہ لیا اور پھر ایک سال کے قلیل عرصے میں ان کی شبانہ روز محنت رنگ لائی اور یہ بیمار صنعتی یونٹ بیگ اسپننگ مل کی صورت ملک وقوم کے لیے ایک منافع بخش یونٹ میں تبدیل ہوگیا۔ ان کا یہ کارنامہ حکومتِ وقت سے پوشیدہ نہیں رہ سکا۔ اس وقت پاکستان پیپلز پارٹی کی حکومت تھی اور شہید محترمہ بے نظیر بھٹو وزیرِاعظم کی حیثیت سے مسندِ اقتدار پر تھیں۔ محترمہ نے ایک شاندار تقریب میں ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ کو اس کارنامے پر اپنے ہاتھوں سے ایوارڈ دیا۔ جب اختیار بیگ اپنا ایوارڈ وصول کرنے اسٹیج پر گئے تو اس وقت وزیرِاعظم محترمہ بے نظیر بھٹو کے ہمراہ اس وقت کے گورنر سندھ حکیم محمد سعیدؒ اور سرمایہ کاری بورڈ کے چیئرمین صفدر عباس زیدی بھی کھڑے تھے۔

بی بی کو باذوق، تعلیم یافتہ، ذہین اور خوش شکل لوگ پسند تھے اور اختیار بیگ میں یہ تمام خوبیاں تھیں یوں ہر گزرتے دن کے ساتھ پیپلز پارٹی کے ایک کارکن کی حیثیت سے ان کا تعلق محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا۔ محترمہ بے نظیر بھٹو ان کی صلاحیتوں سے بے حد متاثر تھیں اسی لیے بیس سالہ رفاقت کے دوران بیگ صاحب کو پارٹی کی اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔

محترمہ نے ایوارڈ دیتے ہوئے اختیار بیگ کو روک لیا اور پوچھا۔ "آپ نے ایک سال میں بیمار صنعتی یونٹ کس طرح چلا دیا اور منافع بخش بھی بنا دیا؟"

"میڈم' میری پی ایچ ڈی اسی موضوع پر ہے۔" اختیار بیگ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

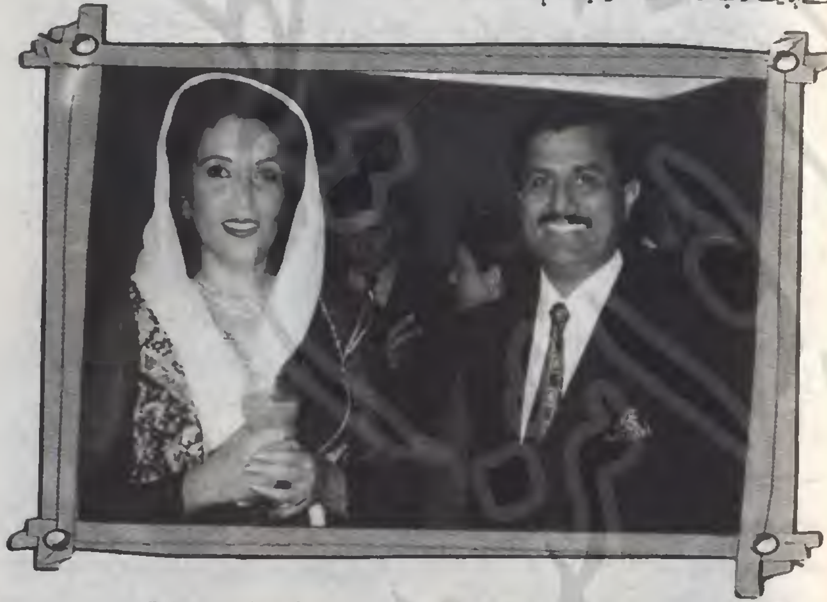
"بیگ صاحب' بیمار صنعتوں کی بحالی کے لیے آج سے آپ میرے خصوصی معاون ہوں گے۔" پھر محترمہ نے اپنا رخ صفدر عباس زیدی کی طرف کیا۔ "زیدی صاحب' کل ہی بیگ صاحب کے ساتھ میٹنگ کریں۔"

یہاں سے اختیار بیگ اور پیپلز پارٹی کے تعلق کی ابتدا ہوئی۔ انہوں نے پی پی پی کا اکنامک ایجنڈہ بنایا۔ بی بی کو باذوق' تعلیم یافتہ' ذہین اور خوش شکل لوگ پسند تھے اور اختیار بیگ میں یہ تمام خوبیاں تھیں یوں ہر گزرتے دن کے ساتھ پیپلز پارٹی کے ایک کارکن کی حیثیت سے ان کا تعلق محترمہ بے نظیر بھٹو کے ساتھ گہرا ہوتا چلا گیا چنانچہ جب الیکشن کا زمانہ آیا تو بی بی نے انہیں الیکشن لڑنے کے لیے کہا تو انہوں نے منع کر دیا جس پر مخدوم امین فہیم' رضا ربانی اور ناہید خان وغیرہ کے زور ڈالنے پر انہیں الیکشن میں کھڑا ہونا پڑا۔ وہ قومی اسمبلی کے حلقہ NA-250 کراچی سے حصہ لے رہے تھے۔ اس حلقے میں بلاول ہاؤس بھی واقع ہے اس لیے یہ بلاول ہاؤس کی سیٹ کہلاتی ہے۔ اس حلقے سے اختیار بیگ نے دو الیکشن لڑے' تاہم 2008ء کا الیکشن تلخ یاد کی صورت ہمیشہ اُن کے ذہن میں بسا رہتا ہے۔ میثاقِ جمہوریت کے وقت پی پی اور ن لیگ کے مابین طے پایا تھا کہ کچھ نشستوں پر ایک دوسرے کے مقابل امیدوار بٹھا دیئے جائیں گے اسی لیے NA250 کی اس نشست پر نواز شریف نے اپنا امیدوار اختیار بیگ کے حق میں بٹھا دیا تھا۔ 2008ء کے عام انتخابات میں اختیار بیگ حقیقتاً کامیاب ہو گئے تھے مگر پھر خفیہ قوتوں نے نتیجہ بدل دیا۔ اس نشست کو کھونے کا دکھ انہیں ہمیشہ رہتا ہے کیونکہ اس نشست پر بی بی نے خاص طور پر انہیں کھڑا کیا تھا اور جب اکتوبر 2007ء میں محترمہ بے نظیر بھٹو کئی سالوں کی جلاوطنی کے بعد وطن واپس آئی تھیں تو انہوں نے اختیار بیگ کی کنویننگ کے لیے ان کے نام والا کیپ نہ صرف خود پہن رکھا تھا بلکہ اپنے ہمراہ موجود تمام قابلِ ذکر رہنماؤں سے کہا تھا کہ یہ کیپس پہنو اور اختیار کی کنویننگ کرو۔ اس نشست کی اہمیت کا اندازہ اس واقعہ سے بھی لگایا جا سکتا ہے کہ جب محترمہ کی شہادت کے بعد نواز شریف ان کے سوئم پر نوڈیرو آئے تھے' اس وقت بے نظیر کی قبر پر فاتحہ پڑھنے کے بعد نواز شریف نے آنکھوں میں آنسو لیے اختیار بیگ سے کہا تھا کہ مجھے خوشی ہے کہ میں نے آپ کے لیے اپنی بہن کی بات مان لی۔ انہوں نے کہا تھا کہ بیگ صاحب کو اپنا مشترکہ امیدوار بنائیں گے۔ محترمہ بے نظیر بھٹو' اختیار بیگ کی صلاحیتوں سے بے حد متاثر تھیں اسی لیے بیس سالہ رفاقت کے دوران بیگ صاحب کو پارٹی کی اہم ذمہ داریاں سونپی گئیں۔ شہادت سے پہلے بے نظیر بھٹو کا آخری sms اختیار بیگ کے پاس ہی آیا تھا جس کے الفاظ تھے۔

"I hope you R happy now. U must win this Bilawal House seat."

اختیار بیگ کو آج بھی اس بات کا پچھتاوا ہے کہ وہ محترمہ کی یہ خواہش پوری نہ کر سکے اور ان کی سیٹ مصلحت کی بھینٹ چڑھ گئی۔

سیاست سے ہٹ کر اختیار بیگ بزنس کی دنیا میں کامیابیوں پر کامیابیاں حاصل کرتے چلے جا رہے تھے۔ بیگ اسپننگ مل کے بعد انہوں نے پاک گلف لیزنگ کمپنی کھولی اور اپنے بچپن کے دوست جہانگیر شاہ کو لیزنگ کمپنی کے انتظامی امور کا نگراں بنا کر دوستی کا حق ادا کر دیا پھر پاک ڈینم مل لگائی۔ گزشتہ پندرہ برس سے بیگ گروپ بیسٹ ایکسپورٹ ٹرافی پاکستان کے صدور اور وزرائے اعظم سے حاصل کر رہا ہے۔ حکومتِ پاکستان انہیں قومی سول ایوارڈ تمغۂ امتیاز سے نواز چکی ہے جبکہ مشرف حکومت میں انہیں گولڈ میڈل مل چکا ہے۔ اس کے علاوہ بے شمار گولڈ میڈلز' ٹرافیاں' شیلڈز اور اسناد وغیرہ اس بات کا ثبوت ہیں کہ ان کی صلاحیتوں کو تسلیم کیا گیا ہے۔ اختیار بیگ کے گھر کا ایک کمرہ ان اعزازات و اسناد سے نہایت خوب صورت انداز میں سجا ہوا ہے۔



اسپین کے میڈرڈ پیلس کی تقریب میں ڈاکٹر بیگ اور محترمہ بے نظیر بھٹو کی ایک یادگار تصویر

آج ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ حکومتِ پاکستان کے وفاقی مشیر برائے ٹیکسٹائل ہیں مگر اس عہدے پر وہ اعزازی طور پر کام کر رہے ہیں اور کوئی مالی پیکیج نہیں لے رہے ہیں۔ اختیار بیگ ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ بیگ گروپ کے چیئرمین ہونے کے ساتھ ساتھ وہ یمن کے اعزازی قونصل جنرل بھی ہیں اور تمام قونصل جنرل کے ڈین (صدر) بھی ہیں۔ ان کا گروپ ایک ملٹی نیشنل گروپ ہے جس کے آفس متحدہ عرب امارات' ترکی' مراکش اور نیویارک میں ہیں۔ ایک ماہر بینکر اور صنعت کار ہونے کے باعث ملکی معیشت پر ان کی گہری نظر ہے۔ اس حوالے سے انہوں نے چار کتابیں بھی تصنیف کی ہیں جن میں "شہ رگ" حصہ اول' حصہ دوم' "معاشی حقائق اور پاکستان" اور "پاکستان اور معیشت" شامل ہیں۔ وہ گزشتہ 12 برسوں سے باقاعدگی سے اخبارات میں کالم بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کی ماہرانہ آراء کو پالیسی سازوں کی طرف سے بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔ وہ ڈینم فیبرک کی بہترین ایکسپورٹ کارکردگی کی بنا پر مسلسل 13 سالوں سے ایف پی سی سی آئی اسپیشل ایکسپورٹ میرٹ ٹرافی حاصل کر رہے ہیں۔ معروف بین الاقوامی جریدے "اکانومسٹ" نے انہیں حصولِ کامیابی کا

سرٹفیکیٹ اور ایوارڈ سے نوازا ہے۔ حکومتِ پاکستان نے ان کی معاشی خدمات کو دیکھتے ہوئے انہیں بزنس پرسن کونسل (BPC) جو ملکی معیشت کا تھنک ٹینک ہے، میں نامزد کیا ہے۔ اس کے علاوہ ڈاکٹر اختیار بیگ لاعلاج بچوں کی آخری خواہش کی تکمیل کے بین الاقوامی ادارے ''میک اے وش فاؤنڈیشن'' پاکستان کے سیکریٹری جنرل بھی ہیں۔ وہ حال ہی میں ورلڈ فیڈریشن آف قونصلر (FICAC) کے بورڈ آف ڈائریکٹر کے رکن بھی منتخب ہوئے ہیں۔ ڈاکٹر بیگ کا دل دکھی انسانیت پر تڑپ اٹھتا ہے لہٰذا انسانیت کی فلاح و بہبود کے لیے انہوں نے اپنی والدہ کے نام پر ''قدسیہ ٹرسٹ'' بھی قائم کیا ہے جس کے تحت جامع قدسیہ، دارالعلوم قدسیہ اور ڈسپنسری کام کررہے ہیں۔

ڈاکٹر اختیار بیگ نے ایک متوسط گھرانے میں آنکھ کھولی تھی اور پھر انتھک محنت کرتے ہوئے وہ آج قابلِ حیثیت لوگوں میں شامل ہیں لیکن وہ خود اپنی تمام تر کامیابیوں کا کریڈٹ ماں کی دُعاؤں کو دیتے ہیں۔ ان کی والدہ قدسیہ بیگم حیات ہیں اور اپنے بچوں کی کامیابی پر ہمہ وقت مسرور رہتی ہیں کہ ان کی سخت تربیت نے اولاد کو آج اس مقام پر پہنچایا ہے۔ ڈاکٹر بیگ آج امیر کبیر شخصیت ہیں لیکن اگر ان سے امارت کے معنی پوچھیں جائیں تو وہ کہتے ہیں۔ ''امیر اسے کہتے ہیں جو ہر لحاظ سے عمومی طور پر ہر لحاظ سے امیر ہو۔ اخلاق میں بھی امیر ہو، علم میں بھی امیر ہو، نشست و برخاست میں بھی امیر ہو، منکسر المزاجی میں بھی امیر ہو، محض پیسے کی بنیاد پر امیر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔''

وہ اپنی زندگی کو تین ادوار میں تقسیم کرتے ہیں۔ پہلا دور وہ جس میں انہوں نے اپنا کیریئر بنایا اور خوب پیسہ کمایا۔ دوسرے دور میں عزت و شہرت حاصل کی اور اب زندگی کے تیسرے دور میں وہ اپنے ملک کو وہ کچھ دے رہے ہیں یعنی اپنی صلاحیتوں سے ملک و قوم کی خدمت کررہے ہیں۔ ڈاکٹر اختیار بیگ کامیابی کے گُر بتاتے ہوئے کہتے ہیں کہ زندگی میں کسی بھی شعبے میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے درست سمت میں انتھک محنت، صاف نیت، بہترین تعلیم، فیملی میں اتفاق اور سب سے بڑھ کر ماں کی دُعائیں بہت ضروری ہوتی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری ترقی میں دونوں بھائیوں میں اتفاق اور محبت کا بڑا ہاتھ ہے جو ان کی والدہ کی تربیت کا حصہ ہے۔ ڈاکٹر بیگ ملک کو غربت کی دلدل سے نکالنے کا ایک سادہ سا نسخہ بیان کرتے ہیں کہ ایسی پالیسیز بنائی جائیں جن سے چھوٹی اور درمیانی صنعتوں کو فروغ حاصل ہو کیونکہ 80 فیصد ملازمتیں چھوٹی صنعتوں سے حاصل ہوتی ہیں۔ کوریا اور جاپان جیسے ممالک آج چھوٹی صنعتوں کی بنیاد پر ہی ترقی کی معراج پر ہیں۔

ڈاکٹر بیگ کے تین بچے ہیں اور تینوں ہی ہونہار ہیں۔ ان کا بیٹا عمیر بیگ کراچی میں پولینڈ کا قونصل جنرل ہے اور اس نے ہارورڈ یونیورسٹی سے فنانس میں ماسٹر کیا ہے۔ ڈاکٹر اختیار بیگ نے حال ہی میں بیٹے کے لیے لکی کاٹن مل کے نام سے نوری آباد میں سو کروڑ کا پروجیکٹ لیا ہے اور اسے جدید خطوط پر استوار کیا جارہا ہے۔ بیٹی انعم بیگ نے کارڈف یونیورسٹی، یو کے سے اسٹریٹیجک مارکیٹنگ میں ماسٹر کیا ہے جبکہ دوسری بیٹی حیا بیگ نے LYCUME سے اے لیول کا امتحان دیا ہے۔

ڈاکٹر بیگ کا سفرِ زندگی رواں دواں ہے۔ وہ زندگی کی شاہراہ پر بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ آج ہمارا ملک جن گمبھیر مسائل میں گھرا ہوا ہے، ان سے نکلنے کا واحد طریقہ یہی ہے کہ ڈاکٹر مرزا اختیار بیگ جیسے Genius افراد کو اہم شعبوں میں اعلیٰ مناصب دیئے جائیں تا کہ وہ اس ملک کی تقدیر بدل دیں۔

......☆☆......

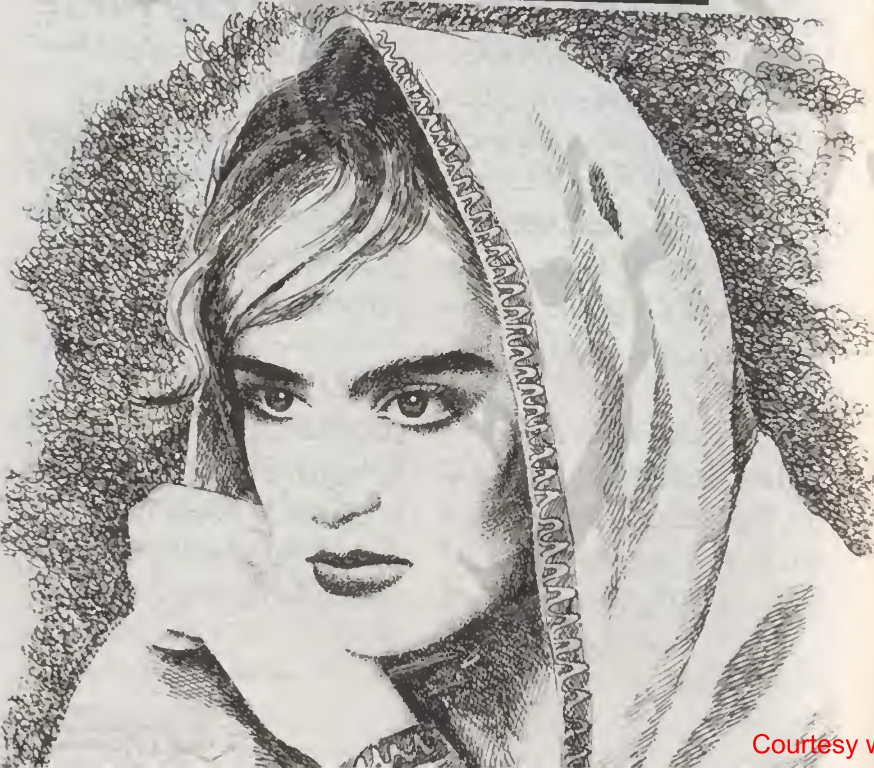
سلمیٰ غزل

آگہی کا ایک لمحہ

حمیرا راحت کا خیال

اڑانیں سلب کر لیں جس نے میری
اسی صیاد سے پَر مانگتی ہوں

شہر کراچی کے ایک نامور بزنس مین کی زندگی سے جڑی خصوصی کہانی



دھیمے سروں میں میوزک بج رہا تھا۔ ''خوشبو کلب'' میں رات کو بھی دن کا سماں لگ رہا تھا۔ لوگ خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ شہر کا جدید ترین مغربی طرز کا کلب تھا جس کی ممبر شپ بھی لاکھوں میں عام انسان کی پہنچ سے باہر تھی۔ یہاں اونچی سوسائٹی کے لوگ حسین شامیں اور رنگین راتیں مناتے آئے تھے۔ ایک کونے میں بیٹھی عائزہ چہرہ ہاتھوں کے پیالوں میں دھرے بڑے غور سے سب کو دیکھ رہی تھی۔ سلیولیس بلاؤز اور باریک سی ساری میں اس کا ہوشربا حسن اور سراپا قیامت ڈھا رہا تھا بلکہ ایک طرح سے سب کو دعوتِ نظارہ دے رہا تھا مگر جانے کیوں وہ اِس ماحول کا حصہ نہیں لگ رہی تھی' ڈری ڈری' سہمی سہمی' متوحش خوف زدہ ہرنی کی طرح' معصومیت سے پلکیں جھپک کر اُمڈتے ہوئے آنسو پینے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے وہ بہت زیادہ مغموم نظر آ رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی۔

'یہ مغربی رنگ کب تک ہم سیدھی سادی مشرقی لڑکیوں پر غالب رہے گا اور کب تک ہم یونہی آنکھیں کھولے اپنی مرضی کے خلاف شوہر کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح ناچتے رہیں گے؟ ہماری خواہشات' ہماری آرزوئیں اور تمنائیں کب تک اس طرح سماج کے بنائے ہوئے خودساختہ اصولوں پر قربان ہوتی رہیں گی؟''

''شوہر کا گھر ہی اس کا اصل گھر ہوتا ہے۔'' بچپن سے یہ اقوال امائیں' بیٹیوں کے کانوں میں صورِ اسرافیل کی طرح ہر روز پھونکتی رہتی ہیں۔ کس کا گھر اور کیسا گھر؟ عورت کا تو کوئی گھر ہی نہیں ہوتا سوائے قبر کے! ہم تو زندہ لاشوں کی طرح مردوں کی اس دنیا میں صلیب پر مصلوب ہونے کے لیے پیدا ہوئے ہیں۔''

•......•......•......•

وہ موسم بہار کی چاندنی میں نہائی رات تھی۔ ہر شئے جانے کیوں اداس تھی' بے حد اداس اور خود عائزہ کے دل کو بھی وقت کے بے رحم ہاتھوں نے شہرِ الام میں دھکیل دیا تھا جہاں جان لیوا تنہائی تھی اور اداس راتیں' ویران شامیں تھیں اور سنسان آگ برساتی دوپہریں اور بجتی یادوں کے کھنڈر!

''یا رَب! زندگی تو ہر انسان کو ایک بار ہی ملتی ہے لیکن کیا میری ساری عمر اسی طرح روتے بسورتے اور جبر سہتے گزر جائے گی؟ کیا خوشیوں پر میرا کوئی حق نہیں؟ زہر کا گھونٹ پیتے پیتے یہ پہاڑ سی زندگی کیسے گزاروں؟''

عائزہ نے لاکھ ہنسی خوشی زندگی گزارنے کا سوچا' قہقہوں کے پیچھے پیچھے آنسوؤں کے طوفان کو مسکراہٹوں کے سیلاب میں ڈبو دینے کا فیصلہ کیا مگر اس کے لیے جینا مشکل ہو رہا تھا' اس نے آریان سے محبت کی تھی' اس کو دل کی گہرائیوں سے چاہا تھا' اسے اپنی معصوم' اَن چھوئی محبت کا حق دار ٹھہرایا تھا' وہ کیسے ان جذبوں سے منہ موڑ لیتی؟ محبت تو اس سے آریان نے بھی کی تھی مگر یہ کیسی خودغرض اور مطلبی محبت تھی جو صرف لینے کی طلب گار تھی' دینے کی نہیں جہاں ہر روز اس کی انا' خودداری اور نسوانیت مجروح ہوتی تھی۔ اسے بے حیائی کے کھلے عام برپا ابلیسی عمل میں اس کی مرضی کے خلاف زبردستی شامل کیا جاتا تھا۔

بارہ بج چکے تھے اور آریان اب تک گھر نہیں لوٹا تھا کیونکہ اس کی رات تو اس وقت شروع ہوتی تھی جب عائزہ فجر کی نماز کے لیے اٹھنے لگتی تھی۔ آج کی تنہائی اسے ناگن کی طرح ڈس رہی تھی۔ گزرا ہوا ماضی جو تلخ بھی تھا اور شیریں بھی' بار بار یادوں کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔

•......•......•......•

عائزہ عزت اور پیسہ دونوں لحاظ سے متمول ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی جو شادی کے دس سال بعد دل کی لگن' دعاؤں' التجاؤں اور طویل سجدوں کے بعد پیدا ہوئی تھی اور وہ دونوں اللہ کے دیئے ہوئے اس تحفے کی جی جان سے قدر کرتے تھے اور اس کی ہر فرمائش پوری کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر لفظ حرفِ آخر ہوتا تھا مگر اچھی بات یہ تھی کہ اُن کے لاڈ پیار نے عائزہ کی طبیعت میں کوئی بگاڑ پیدا نہیں کیا تھا۔ وہ دینی اور دنیاوی تعلیم سے مرصع ایک پروقار اور باکردار لڑکی تھی۔ ماں باپ کو اپنی تربیت پر فخر اور بیٹی پر ناز تھا۔

اُس شام عائزہ کے بابا عثمان علی خاں آفس سے گھر آئے تھے تو شام کی چائے پیتے ہوئے اچانک عائزہ نے کہا تھا۔

''بابا! میں سوات' کاغان' مری' گلگت' ہنزہ اور اسلام آباد گھوم پھر کر تھک گئی ہوں' کون سا پھول' کون سی پتی اور کون سا پتھر کہاں ہے' آنکھ بند کر کے بتا سکتی ہوں کیونکہ یہ جگہیں مجھے ازبر ہو چکی ہیں۔''

''میرا بیٹا اس مرتبہ چھٹیوں میں کہاں جانا چاہتا ہے؟'' عثمان علی خاں نے اپنی بیٹی کی بات کا مقصد سمجھتے ہوئے لاڈ سے پوچھا تھا۔

''بس بابا' اس مرتبہ ہم کراچی جائیں گے خالہ جانی کے گھر۔''

''میرے بچے' کراچی کے حالات ٹھیک نہیں ہیں' قتل و غارت گری' بم دھماکے اور آئے دن کی ہڑتالیں اور پرتشدد ہنگامے......''

''حالات تو بابا' پورے ملک کے خراب ہیں۔'' عائزہ جل کر بولی تھی۔ ''صرف کراچی ہی کیوں' لاہور میں کچھ کم قتل و غارت گری کا بازار گرم ہے' ہر جگہ' ملک کے گوشے گوشے میں غربت و افلاس اور بھوک اور مہنگائی نے انسان کو ایک مسلسل اضطراب میں مبتلا کر دیا ہے بلکہ جانور بنا دیا ہے۔ ٹینشن اور فرسٹریشن' یہ دو بنیادی مسائل ہیں جنہوں نے بھوک و افلاس سے جنم لیا ہے اور انسان کو جنگلی درندہ بنا دیا ہے اس لیے ہم کس کس بات پر روئیں گے اور کب تک ماتم کریں گے؟ چنانچہ ثابت ہوا کہ یہ سب آپ کی بہانے بازیاں ہیں' کیوں امی! میں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں؟ بس ہم کراچی ہی چلیں گے۔''

''جیسے تمہاری خوشی۔'' امی نے شفقت بھری مسکراہٹ سے کہا تھا۔

''چلو بھاگو پھر چلنے کی تیاری کرو' ہم پرسوں روانہ ہو جائیں گے۔ میں ذرا بکنگ کرلوں اور تمہاری امی اپنی بہن کو اطلاع دے دیں کہ ان کے گھر میں زلزلہ آنے والا ہے عائزہ کی صورت میں۔'' عثمان علی خان نے پیار سے اپنی بیٹی کی ناک کھینچتے ہوئے کہا تھا اور عائزہ خوشی خوشی اپنے کمرے کی طرف دوڑی تھی۔

•......•......•......•

قائداعظم انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر خالہ کی پوری فیملی اُن کے استقبال کو موجود تھی' روحہ' عائزہ کی کزن اس کی ہم عمر تھی اور بھائی شایان اُس سے دو سال بڑا تھا۔ عائزہ یہاں آ کر بے حد خوش تھی' روزانہ کوئی نا کوئی گھومنے پھرنے کا پروگرام بن جاتا۔ اگر خالہ اور امی شامل نہ ہوتے تو یہ تینوں ہی گھومنے نکل جاتے۔ کراچی کا کوئی ہوٹل یا ریسٹورنٹ ایسا نہیں تھا جہاں روحہ اور شایان اس کو لے کر نہ گئے ہوں پھر عثمان علی خان کے کاروباری دوست خصوصاً اکرام احمد جو عثمان علی خان کے دوست ہی نہیں' بزنس پارٹنرز بھی تھے اور کراچی کی برانچ انہوں نے ہی سنبھالی ہوئی تھی اور وہ کبھی لاہور میں اُن کے پڑوسی بھی رہ چکے تھے' اُن کے یہاں دعوتوں کا سلسلہ بھی جاری تھا' دوسری طرف ہر گزرتے دن کے ساتھ شایان' عائزہ سے

متاثر ہوتا جارہا تھا۔ اس کا دوپٹے کے ہالے میں دمکتا ہوا معصوم چہرہ شایان کے دل میں گھر کر گیا تھا۔ عام لڑکیوں کے مقابلے میں فیشن سے دور سیدھی سادی عائزہ اس کو اپنی روح سے قریب ہوتی محسوس ہونے لگی تھی۔

معاشی لحاظ سے خالہ کے گھرانے کا عائزہ کے گھر سے کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا کیونکہ عائزہ کے ابو بزنس مین اور شایان کے والد ایک کالج میں پروفیسر تھے۔ نیک، ایمان دار اور اپنے پیشے کو عبادت کا درجہ دینے والے، یہی تمام خوبیاں روحہ اور شایان میں تھیں، شایان C.A. کر رہا تھا جبکہ روحہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ شایان کو یقین تھا کہ C.A. مکمل ہوتے ہی ایک تابناک اور روشن مستقبل اس کے سامنے ہوگا اور پھر وہ عائزہ کا ہاتھ مانگنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کرے گا۔

ایک شام موسم بے حد خوشگوار تھا، آسمان پر ہلکے ہلکے بادل چھائے ہوئے تھے۔ وہ تینوں لان میں چائے پی رہے تھے کہ اُسی لمحے عثمان علی خان کی اکرام احمد اور اُن کے بیٹے کے ساتھ وہاں آمد ہوئی تھی۔ ان کا بیٹا آریان چند روز پہلے ہی M.B.A. کر کے امریکا سے واپس آیا تھا۔ ان کو دیکھ کر سب تعظیماً کھڑے ہو گئے تھے۔ عائزہ، آریان کو دیکھ کر چونکی ضرور تھی لیکن فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔ بابا نے سب سے اُن کا تعارف کرایا تھا اور پھر اکرام احمد کو لے کر اندر چلے گئے تھے جبکہ آریان وہیں اُن کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

''مجھے آریان کہتے ہیں۔ آپ سب لوگ بھی اپنا تعارف کرائیے۔'' عائزہ کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اُس نے کہا تھا جو سفید دوپٹے کے ہالے میں بڑی پیاری لگ رہی تھی۔

''میں شایان، میری بہن روحہ اور یہ ہماری کزن عائزہ عثمان انکل کی بیٹی۔'' شایان نے تعارف کرایا تھا۔

''تم عائزہ ہو؟'' اب حیران ہونے کی باری آریان کی تھی۔ ''مائی گاڈ! میں جب امریکا گیا تو تم اتنی سی تھیں، روتی بسورتی سڑی شکل کی اور اب...... تم تو بھئی، کافی خوبصورت ہوگئی ہو۔'' کئی سال مغربی ماحول میں گزار کر آنے والے آریان نے یوں بے باکی سے عائزہ کی تعریف کی تو شایان کی پیشانی پر بل پڑ گئے اور عائزہ کی پیشانی عرق آلود ہوگئی۔

''سوری، میں کچھ زیادہ ہی بول گیا۔'' وہ جھینپ کر بولا تھا اور پھر ماحول کی کشیدگی کم کرنے کے لیے روحہ ہنس کر بولی تھی۔

''آریان بھائی، آپ امریکا کتنے سال رہے؟''

''ایک تو پاکستان میں ہر لڑکی کو نام کے ساتھ بھائی لگانے کا بڑا شوق ہوتا ہے۔'' وہ شوخی سے بولا تھا۔ ''مگر مجھے روحہ، تمہارا بھائی کہنا بہت اچھا لگا کیونکہ میری کوئی بہن نہیں۔ آج سے شایان ہی نہیں، میں بھی تمہارا بھائی ہوں۔'' آریان کے پرخلوص اور بے ریا لہجے نے ایک دم ماحول خوشگوار بنا دیا تھا۔

•......•......•

وقت گزرنے کا پتہ ہی نہیں چلا اور عائزہ کے لاہور واپسی کے دن جب قریب آ گئے تو اکرام صاحب نے پوری فیملی کو اپنے گھر کھانے پر مدعو کر لیا۔ آریان ان کی اکلوتی اولاد تھا، وہ O لیول کر رہا تھا جب اچانک ماں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اُس وقت عائزہ پانچویں کلاس میں تھی اور اکرام صاحب لاہور ہی میں رہتے تھے۔ عائزہ اور آریان کی خاصی دوستی تھی پھر بیگم اکرام کے اچانک دنیا چھوڑ جانے سے دونوں باپ بیٹے بے حد اپ سیٹ ہو گئے تھے اور پھر اکرام صاحب نے اُسے مزید پڑھنے کے لیے امریکا

بھیج دیا اور خود لاہور سے کراچی شفٹ ہو گئے کیونکہ وہ گھر ان کو کاٹنے لگا تھا جہاں قدم قدم پر ان کی بیگم کی یادیں بکھری ہوئی تھیں۔ اس وقت عائزہ، آریان کے جانے پر بہت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور کئی دن بے چین رہی تھی اور اب آریان بہت سالوں بعد ایک وجیہہ اور خوبرو نوجوان کے روپ میں واپس آیا تھا تو اُسی پہلے والی بے تکلفی کے ساتھ عائزہ سے بات کرنا چاہتا تھا لیکن اب عائزہ کو اس کا سامنا کرتے حجاب آتا تھا۔ عائزہ کی پرورش اسلامی خطوط پر کچھ اس طرح ہوئی تھی کہ باوجود روک ٹوک نہ ہونے کے، وہ مخلوط تقریبات میں شریک ہونے سے گریز کرتی تھی۔ اس کو اپنی مذہبی اقدار اور معاشرتی ذمہ داریوں کا پوری طرح احساس تھا، پردہ نہ کرتے ہوئے بھی وہ پوری طرح ڈھکی چھپی رہتی تھی۔

عائزہ غیر معمولی طور پر خوبصورت تو نہیں تھی لیکن مناسب خدوخال، لمبے قد اور بے داغ و پرکشش رنگت میں دوپٹے سے ڈھکے سر کے ساتھ وہ بے حد معصوم و دلکش نظر آتی تھی اور اکثر اس کی یہ سادگی اسے سب کی توجہ کا مرکز بنا دیتی تھی اور پھر اس کی عاجزی، انکساری اور لبوں کی دھیمی مسکراہٹ، عائزہ کی شخصیت کے وہ پہلو تھے جو اُسے ہر جگہ نمایاں کر دیتے تھے۔

وہ سب لوگ اکرام صاحب کے بنگلے پر پہنچے تو آریان بے تابی سے گیٹ پر ٹہل رہا تھا۔ وہ عائزہ کو گاڑی سے اترتے دیکھ کر بے قراری سے آگے بڑھا تھا۔ سفید لونگ شرٹ اور چوڑی دار پاجامے میں دوپٹے سے سر ڈھکے وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ آریان نے بے تکلفی سے عائزہ کی جانب ہاتھ بڑھایا تھا۔ وہ ایک لمحے کے لیے تو پریشان ہوگئی تھی مگر دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھ کو نظرانداز کرتے ہوئے اطمینان سے بولی تھی۔

''السلام علیکم!''

آریان کھسیانا سا ہو گیا تھا۔ ''سوری، امریکا میں رہ کر سب سے ہاتھ ملانے کی عادت ہو گئی ہے۔''

''مگر آریان بھائی، اب آپ امریکا سے واپس آ جائیے اور آنکھ کھول کر دیکھیے کہ یہ پاکستان ہے اور یہاں ہماری کچھ مذہبی حدود و قیود ہیں۔'' روحہ بھلا کہاں چھوڑنے والی تھی۔

''بالکل، بالکل، میں بہت جلد یہاں کے رنگ میں رنگ جاؤں گا۔'' آریان جلدی سے بولا تھا اور پھر سارا وقت عائزہ، آریان کی نظروں کے حصار میں رہی تھی جو اسے الجھن میں مبتلا تو کر رہی تھی مگر وہ خوش تھی، آریان کی کچھ کہتی ہوئی نگاہیں اس کے دل سے مکالمہ کر رہی تھیں۔ آریان سے مل کر اُسے ایک عجیب سی اپنائیت کا احساس ہوا تھا اور پھر لاہور روانہ ہونے سے پہلے ایک سادہ سی تقریب میں عائزہ کو آریان کے نام کی انگوٹھی پہنا دی گئی تھی جس میں آریان کی خوشی کے ساتھ ساتھ عائزہ کی مرضی بھی شامل تھی لیکن اُسے لگا تھا کہ خالہ کے گھر میں کوئی بھی اس رشتے سے خوش نہیں، ملال کے رنگ سب کے چہرے پر نمایاں تھے۔ آخر کار عائزہ نے پوچھ ہی لیا تھا۔

''روحہ......! لگتا ہے، تم لوگ میری منگنی سے خوش نہیں ہوئے؟''

''ارے نہیں، یہ تم سے کس نے کہا، بس ہمیں یہ فکر ہے کہ آریان بھائی بہت سال امریکا رہ کر آئے ہیں، بے حد مغربی طرز زندگی کے دلدادہ و شیفتہ اور تم ٹھہریں سیدھی سادی مشرقی لڑکی!''

''تم دیکھنا، میں کس طرح ان کو اپنے رنگ میں رنگ لوں گی۔ محبت کا جادو سر چڑھ کر بولتا ہے اور مجھے یقین ہے، میری محبت ان کو کبھی بگڑنے نہیں دے

گی۔"

عائزہ نے یہ سب کچھ بے حد اعتماد اور یقین سے کہا تھا' جواباً روحہ نے مصنوعی خوشی کا اظہار کیا تھا لیکن الفاظ اس کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ مسکراہٹ پھیکی اور بے جان تھی۔ وہ عائزہ کو کیسے بتاتی کہ اس نے ان کے بھائی شایان کی آنکھوں سے حسین خواب چھین لیے تھے۔ اس کے دل کی دنیا ویران کردی تھی۔ اس کے بھائی کی دل کی دنیا بسنے سے پہلے اجڑ گئی تھی اور عائزہ کا جھکاؤ آریان کی طرف دیکھ کر اس کے بھائی نے اس موضوع پر بات کرنے سے سب کو سختی سے منع کردیا تھا کہ اس کو اپنے جذبوں کی بے توقیری پسند نہ تھی کیونکہ اس کا اور عائزہ کا معاشی طور پر کوئی مقابلہ ہی نہ تھا۔ شایان اسے وہ سب کچھ نہیں دے سکتا تھا جو اسے آریان کی رفاقت میں ملتا۔ محل جیسا گھر' نوکر چاکر' شان و شوکت' عائزہ جس کی عادی تھی' وہ جانتا تھا' مایا کو مایا کھینچتی ہے۔' جو اُن کے گھر کی باندی تھی۔

•......•......•

عائزہ کی لاہور واپسی ہوچکی تھی اور ٹھیک ایک ماہ بعد اس کی آریان سے شادی قرار پائی تھی۔ وہ بہت خوش تھی مگر کبھی کبھی اُسے آریان کی بے تکلفی اور بے باکی سے اُلجھن سی ہونے لگتی۔ وہ اس کے ساتھ گھومنا پھرنا چاہتا تھا' اس کے ساتھ زیادہ سے زیادہ وقت گزارنا چاہتا تھا مگر عائزہ کے انکار اور گریز نے اسے محتاط رہنے پر مجبور کردیا تھا اور پھر پلک جھپکتے ایک ماہ گزر گیا اور وہ دھوم دھام سے رخصت ہوکر کراچی آ گئی تھی اور پھر دونوں ہنی مون منانے کے لیے یورپ چلے گئے تھے اور جب واپسی میں خالہ جانی نے اُس کی دعوت کی تھی تو روحہ' عائزہ کو دیکھ کر حیران ہوگئی تھی۔ وہ شادی کے بعد زیادہ خوبصورت ہوگئی تھی' خوشی اس کے انگ انگ سے پھوٹی پڑ رہی تھی۔

روحہ نے بڑے خلوص سے اس کی دائمی خوشیوں کی دُعا کی تھی۔

عائزہ کا معمول تھا' وہ صبح جلدی اٹھ جاتی' نماز پڑھ کر لان میں ٹہلنے نکل آتی پھر کچھ دیر قرآن شریف کی تلاوت کرتی اور پھر چائے بنا کر اپنے سسر کے کمرے میں آ جاتی جو صحیح معنوں میں ایک باپ کی طرح بے حد مشفق اور مہربان تھے۔ وہ بھی نماز پڑھ کر اس کے انتظار میں بیٹھے رہتے تھے حالانکہ نوکروں کی کوئی کمی نہ تھی' دوسری طرف عائزہ کو اپنے سسر اور شوہر کا کام اپنے ہاتھوں سے کرنا اچھا لگتا تھا۔ شروع شروع میں تو عائزہ نے آریان کو بھی صبح سویرے اٹھانے کی بہت کوشش کی تھی مگر جب اس کا موڈ بگڑنے لگا تو اس نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا تھا۔

عائزہ کے اس معمول پر آریان بڑی جھنجلاہٹ محسوس کرتا تھا۔ اس کو عائزہ کا صبح صبح اٹھنا' نماز پڑھنا عجیب لگتا تھا کیونکہ وہ ان باتوں کا عادی نہیں تھا مگر بدمزگی سے بچنے کے خیال سے وہ چپ تھا لیکن کب تک؟ ایک صبح عائزہ کے سامنے آریان کا یہ سوال اور خیال موجود تھا۔

"مجھے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں صبح صبح اٹھنے کی تکلیف کیوں ہے؟ کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ جب میری آنکھ کھلے تو تم میری بانہوں میں محوِ استراحت ہو......؟"

"آریان' آپ کی خواہش سر آنکھوں پر......" وہ سنجیدگی سے بولی تھی۔ "مگر یہ بھی تو سوچیں' مجھے مجازی خدا سے پہلے حقیقی خدا کو بھی تو خوش رکھنا ہے۔ آپ کا نمبر تو بعد میں آتا ہے۔ اپنے رب کے آگے سجدہ کرکے میں اپنا فرض ادا کرتی ہوں۔ آپ کے اور اپنے ایمان' جان و مال کی سلامتی اور گناہوں سے بخشش کی دُعا مانگتی ہوں۔"

"گناہ......" آریان گھبرا کر اٹھ کے بیٹھ گیا۔ "کون سا گناہ' کیسا گناہ؟ بھئی' میں نے تو نہ کسی کو قتل کیا ہے نہ ڈاکہ ڈالا ہے نہ چوری کی ہے۔ تم سے کون سا گناہ سرزد ہوا ہے' یہ تم جانو۔" آخری جملہ وہ کچھ شوخی سے بولا تھا۔

"توبہ کریں آریان' کیسی باتیں کررہے ہیں؟ انسان کے گناہوں کا تو کوئی شمار ہی نہیں' کبیرہ گناہوں کا تو ذکر ہی کیا' ہمارے تو صغیرہ گناہ بھی بے شمار ہیں۔ بڑے بڑے اولیائے کرام اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہے۔ ہماری تو اوقات ہی کیا' ہم تو دانستگی اور نادانستگی میں نہ جانے کتنے گناہ کرلیتے ہیں' قتل و غارت گری' ڈاکہ چوری' ان کو چھوڑیں' نماز نہ پڑھنا' اللہ کے احکامات سے روگردانی کرنا' اس کی نوازشوں کا شکر ادا نہ کرنا' یہ کچھ کم گناہ ہیں؟"

"رَبِش......" آریان نے برا سا منہ بنایا تھا۔ "جانے تمہیں یہ الٹی سیدھی پٹیاں کون پڑھاتا ہے؟ تمہیں دینی تعلیم دینے والوں نے کیا یہ نہیں بتایا کہ شوہر کو ناراض کرنا اور اسے خوش نہ رکھنا بھی گناہ ہے؟"

"مگر میں نے ایسا کیا کردیا جو آپ ناراض ہورہے ہیں؟" عائزہ روہانسی ہوگئی تھی۔

"بس میں نے کہہ دیا ہے' کل سے' صبح تم میرے ساتھ ہی بستر سے نکلوگی۔" آریان کا لہجہ حتمی اور فیصلہ کن تھا۔ آریان کی باتیں سن کر عائزہ دکھی ہوگئی تھی مگر وہ نہیں چاہتی تھی کہ کوئی معمولی بات بھی ان دونوں کے درمیان رنجش کا باعث بنے اس لیے خاموشی سے کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ اس کا وہ سارا دن بے چینی اور اداسی میں گزرا جو اکرام صاحب کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکا۔ اس کی اداس شکل دیکھ کر وہ بولے تھے۔ "یہ ہماری چہکتی ہوئی بلبل آج خاموش کیوں ہے؟"

عائزہ نے اُسی لمحے بابا سے مدد لینے کا فیصلہ کرلیا تھا اور انہیں تمام بات بتادی تھی۔ عائزہ کا مسئلہ سن کر ان کے چہرے پر تفکرات کا جال سا بچھ گیا تھا اور وہ افسردگی سے بولے تھے۔

"بس بیٹا' اس میں تھوڑی کوتاہی اور غفلت ہماری بھی ہے' جس عمر میں بچے کو پیار و محبت اور صحیح تربیت کی ضرورت ہوتی ہے' اس عمر میں ہم نے آریان کو پڑھنے باہر بھجوادیا۔ دراصل تمہاری آنٹی کی وفات کے بعد ہم اتنے بکھر گئے کہ آریان بھی نظرانداز ہونے لگا' تب ہم نے اسے باہر بھیجنا ہی مناسب سمجھا لیکن ہم یہ بھول گئے کہ مردہ لوگوں سے زندہ لوگوں کی اہمیت زیادہ ہے اور یوں باہر جاکر وہ مذہب سے بیگانہ ہوگیا' نہ رہبر نہ رہنما نہ کوئی صحیح راستہ دکھانے اور سمجھانے والا' جس کی کوئی منزل نہ ہو' وہ تو اسی طرح بھٹکا ہوا مسافر ہوتا ہے۔ میرا بیٹا وہاں کے کچے رنگ چڑھا بیٹھا اور مذہب سے بھی دور ہو گیا۔ لگتا ہے اب کچھ کرنا ہی پڑے گا۔"

"نہیں پاپا' آپ انہیں کچھ مت کہیے گا ورنہ وہ سمجھیں گے' میں نے شکایت لگائی ہے۔" عائزہ گھبرا کر بولی تھی۔

"واہ بیٹا جی' شکایت بھی کرتی ہو اور ڈرتی بھی ہو مگر تم فکر نہ کرو اب یہ ہمارا مسئلہ ہے۔"

رات کا کھانا عموماً تینوں اکٹھے ہی کھاتے تھے۔ کھانے کے دوران ہی اکرام صاحب نے آریان کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا۔

"بیٹا' آج عائزہ صبح کی چائے پلانے سے معذرت کررہی تھی' شاید تمہاری طرح اس کو بھی دیر تک سونا ہوگا مگر ہم نے تو صاف کہہ دیا کہ ہم تو تمہارے ہاتھ کی ہی چائے پئیں گے۔ تمہاری امی مرحومہ کے بعد دس سال ہم بوا بشیراں کے ہاتھ

کا چائے نما جوشاندہ زہر مار کرتے رہے۔ اب بہو کی چائے کی عادت ہوئی ہے مگر یہ بہانے بنا رہی ہے۔ بیٹا' تمہیں تو کوئی اعتراض نہیں؟'' اکرام صاحب نے اچانک ہی بیٹے سے سوال کیا تھا۔ آریان نے گھبرا کر کہا تھا۔ ''ارے نہیں' مجھے کیا اعتراض ہوگا۔'' بہرحال جو کچھ بھی تھا' آریان کے دل میں باپ کا بہت احترام تھا۔ ان کی کوئی بھی بات ٹالنا یا حکمِ عدولی کرنا اس کے بس میں نہیں تھا۔ عائزہ نے تشکر بھری نگاہ اکرام صاحب پر ڈالی تھی اور وہ شفقت سے مسکرا دیئے تھے۔

اُس روز عائزہ صبح ہی سے بہت اداس اور پریشان تھی' آریان نے آفس جاتے ہوئے کہا تھا۔ آج ان کے اعزاز میں بزنس سرکل کی طرف سے ہوٹل میں دعوت ہے اس لیے وہ اہتمام سے تیار ہو اور اہتمام کا مطلب عائزہ کو اچھی طرح معلوم تھا' آریان کو خواتین کا مشرقی لباس خاص طور پر دوپٹہ بالکل پسند نہیں تھا اور وہ اکثر عائزہ کو ٹوکتا بھی رہتا تھا۔ بہرحال اس نے آریان کے آنے سے پہلے بہت نفیس کام کا خوبصورت سا گلابی کلر کا سوٹ پہنا تھا جس میں وہ خود بھی ایک گلاب کا تروتازہ پھول لگ رہی تھی۔ گھنے بالوں کی لمبی سی چٹیا باندھ لی تھی۔

''واؤ...... بے حد خوبصورت لگ رہی ہو۔'' آریان' عائزہ کو شانوں سے تھامتے ہوئے بے خودی سے بولا تھا لیکن اگر چٹیا کی جگہ اسٹائلش سے بوب کٹ بال ہوتے تو تم اور بھی غضب ڈھاتیں۔''

آریان کی یہ بات سن کر تو عائزہ اندر تک کانپ اٹھی تھی' اس کو اپنے لمبے لمبے گھنے بالوں سے عشق تھا اور جانے کیا کچھ لگا کر وہ ان کی حفاظت کیا کرتی تھی۔ وہ اندر ہی اندر خوف زدہ ہوگئی تھی۔ اب اس کو اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ اور آریان ندی کے دو کنارے ہیں' دونوں کی طبیعتوں میں زمین آسمان کا فرق تھا۔

ہوٹل میں سب نے بڑے پر جوش طریقے سے دونوں کو خوش آمدید کہا تھا اور کچھ من چلے تو آریان کے منہ پر ہی عائزہ کی تعریفوں میں زمین و آسمان کے قلابے ملانے لگے تھے جس پر عائزہ خجل اور آریان فخر محسوس کر رہا تھا پھر اس کی آنکھیں اس وقت حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئی تھیں جب بڑی بے تکلفی سے جام کے جام لنڈھائے جا رہے تھے۔ عائزہ سہمی سہمی نظروں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں تھا کہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر بھاگ جائے یا کوئی منتر پڑھ کر خود کو سب کی نظروں سے اوجھل کر دے اور جب آریان نے اپنے لیے وہسکی اور اس کے لیے کولڈ ڈرنک کا آرڈر دیا تو وہ ایک دم پریشان ہوگئی تھی۔

''آپ شراب پیتے ہیں؟'' اس نے بہت دکھ سے کہا تھا۔

''عادت تو نہیں لیکن یہ اسٹیٹس سمبل ہے اس لیے پینی ہی پڑتی ہے۔ ابھی تمہارے لیے یہ ماحول اجنبی ہے لیکن آہستہ آہستہ تم بھی اس کی عادی ہو جاؤ گی۔''

''اللہ نہ کرے۔'' عائزہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا تھا اور وہ خالی خالی بے جان نظروں سے آریان کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

گھر واپسی کے بعد عائزہ نے باقی رات بستر پر بے چینی سے کروٹیں بدلتے گزار دی تھی' عجب اضطراب اور بے چینی نے اس کا احاطہ کیا ہوا تھا۔ وہ آریان کو روح کی گہرائیوں سے چاہتی تھی اور پیار تو وہ بھی بہت کرتا تھا مگر طبیعتوں اور خیالات میں اتنا تضاد تھا کہ عائزہ کو لگتا تھا کہ کسی نہ کسی موڑ پر ان کا ٹکرانا لازمی ہے۔

•......•......•......•

عائزہ اندر ہی اندر اداس رہنے لگی تھی۔ ایک انجانا سا غم اسے دیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔ اس کی کوشش تو یہی ہوتی تھی کہ آریان کو کسی طرح ناراض نہ کرے مگر پھر بھی اکثر و بیشتر وہ خفا ہی رہتا تھا۔ ایک دن وہ شام کو آریان کے ساتھ کلب جانے کے لیے تیار ہو رہی تھی تو اُس نے اپنی پسند کا لایا ہوا جوڑا اس کے سامنے رکھ دیا تھا۔

''آج تم یہ پہنو گی' تمہارے دقیانوسی 1857ء کی جنگِ آزادی والے جوڑے دیکھ دیکھ کر میرا دل اُوب گیا ہے۔ اللہ نے اچھی خاصی شکل دی ہے مگر تم نے اس کو دوپٹے میں چھپا کر ستیاناس مار دیا ہے اپنا بھی اور میرا بھی۔''

اس جوڑے کو دیکھ کر عائزہ کا دل دھک سے رہ گیا تھا' سلیولیس' بغیر دوپٹہ والی شرٹ جس کا گلا بھی کافی ڈیپ تھا۔ ''آریان' میں نے کبھی اس طرح کے کپڑے نہیں پہنے؟'' اس کے لہجے میں دکھ اور تلخی تھی۔

''تو اب پہن لو میری خوشی کے لیے' ویسے بھی دوپٹہ آج کل کوئی نہیں اوڑھتا۔ تم ہی پردے کی بو بو بنی رہتی ہو۔''

''آریان' آپ چاہے کچھ کہیں' میں یہ کپڑے نہیں پہن سکتی۔ میں آپ کی بے جا خواہشات کے سامنے سر نہیں جھکاؤں گی۔'' جانے کیوں آج اس کو بھی ضد سی ہوگئی تھی۔

آریان نے وہ کپڑے اٹھا کر غصے میں دور پھینکے تھے اور طیش میں فلا ور واز کو ٹھوکر مارتا ہوا باہر نکل گیا تھا۔

آریان کے جانے کے بعد عائزہ کافی دیر تک پھوٹ پھوٹ کر روتی رہی تھی پھر اس کو لگا تھا' آریان کو ناراض کر کے اس نے کچھ اچھا نہیں کیا۔ اس نے بے دلی سے آریان کا لایا ہوا جوڑا پہنا تھا مگر خود کو آئینے میں دیکھ کر جیسے گھبرا سی گئی تھی پھر اُس نے اُس جوڑے سے ہم رنگ دوپٹہ پھیلا کر اوڑھ لیا تھا۔

عائزہ جب مون کلب پہنچی تھی تو سب خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ آریان نے اس کو دیکھ کر دوسری طرف منہ پھیر لیا تھا اور ساتھ بیٹھی ایک موڈرن سی لڑکی سے ہم کلام ہوگیا تھا۔ اس کی بے نیازی پر عائزہ پہلو بدل کر رہ گئی تھی اور پھر جوں ہی وہ لڑکی دوسری طرف گئی تھی' عائزہ نے موقع غنیمت جانا تھا اور ایک زبردستی کی مسکراہٹ چہرے پر سجا کر اسے مخاطب کیا تھا۔

''دیکھیے' میں آپ کی پسند کا جوڑا پہن کر آ گئی ہوں' اب تو خوش؟''

آریان نے اسے قہر برساتی نظروں سے گھور کر دیکھا تھا اور پھر ایک جھٹکے سے اس کا دوپٹہ سر سے کھینچ لیا تھا۔ اف' اتنی تذلیل وہ بھی بھری محفل میں؟ عائزہ کا دل چاہا تھا' زمین پھٹے اور وہ اس میں سما جائے اور پھر اس سے پہلے کہ سب کے سامنے اس کا تماشہ بنتا' وہ تیزی سے مڑی تھی اور اپنی کار میں بیٹھ کر گھر آ گئی تھی پھر ساری رات اس نے روتے روتے' کروٹیں بدلتے جاگ کر گزاری تھی۔

•......•......•......•

ہر گزرتے دن کے ساتھ آریان تہہ در تہہ اور پرت در پرت کھلتا جا رہا تھا اور عائزہ اس امید کے سہارے آریان کی ہر جائز و ناجائز خواہش پوری کرتی چلی آ رہی تھی کہ آریان کبھی تو بدلے گا لیکن اندر سے دل جیسے مر سا گیا تھا۔ اُس رات وہ حسبِ عادت رات کو اپنے بال کھولے آہستہ آہستہ انہیں سلجھا رہی تھی جب آریان نے اُسے پکارا تھا۔

''عائزہ' کل میرے ساتھ کسی اچھے سے بیوٹی پارلر میں چل کر ان لمبے بالوں کو کٹوا کر اچھا سا شیپ

دلوالیتا۔"

"آریان! مجھے اپنے بالوں سے عشق ہے۔" وہ بے بسی سے بولی تھی۔

"اور مجھ سے؟" عائزہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر آریان نے بڑے مان سے کہا تھا۔

جواب میں عائزہ بھیگی ہوئی پلکوں سے مسکراتے ہوئے بمشکل اس قدر ہی کہہ پائی تھی۔ "آپ کی خواہش ہی میری خوشی ہے۔"

عائزہ نے خود پر ہر جبر کرلیا اور وہ ہر ممکن حد تک بدل بھی گئی لیکن اس کی خاموشیاں' قربانیاں اور فرماں برداریاں اُس کے کچھ کام نہ آئیں اور اُس نے سنا کہ آریان ایک ماڈل گرل کے ساتھ دیکھا جارہا ہے' وہ عنقریب اُس سے شادی کرنے والا ہے۔

اکرام صاحب یہ سب کچھ خاموشی سے دیکھ رہے تھے' سن رہے تھے' آریان کی بے راہ روی کی داستانیں ان کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں اور اب تو پانی سر سے اونچا ہوگیا تھا۔ اس رات وہ سوئے نہیں تھے اور جب رات دو بجے آریان نشے میں چور لڑکھڑاتا ہوا گھر پہنچا تھا تو انہوں نے اسے بیڈروم میں جانے سے پہلے ہی جا لیا تھا۔ ان کی گرجدار آواز بیڈروم میں عائزہ کے کانوں تک آرہی تھی' وہ ہڑبڑا کر ننگے پاؤں دوپٹہ سنبھالتی ہوئی دروازے تک آئی تھی۔

"تم اتنی رات گئے کہاں سے آرہے ہو؟"

"دوستوں میں تھا۔"

"یہ تمہارے کون سے آوارہ دوست ہیں جو رات کے دو بجے تک اپنا گھربار چھوڑ کر تمہارے ساتھ رنگ رلیاں مناتے رہتے ہیں۔ آریان' کان کھول کر سن لو میں نے بہت برداشت کرلیا لیکن اب نہیں۔ عائزہ میری بہو نہیں' بیٹی ہے اور یہ وہی لڑکی ہے جس کے لیے تم مرے جارہے تھے' پاگل ہورہے تھے اسے حاصل کرنے کے لیے اور تمہاری محبت میں' میں بھی خود غرض ہوگیا تھا' جانتے بوجھتے ایک معصوم' فرشتہ صفت اور وفادار لڑکی کے لیے تم جیسے آوارہ اور شرابی کو یہ سوچ کر چن لیا تھا کہ شاید اس کی نیکی' اس کا کردار' اخلاص اور اس کی فرماں برداری تمہیں راہِ راست پر لے آئے مگر افسوس' میں غلط تھا۔ کیا وہ باوفا اس سلوک کی مستحق ہے؟ اس کے صبر کی انتہا دیکھو کہ میں روز یہ تماشہ دیکھتا ہوں' اُس سے سوال کرتا ہوں مگر وہ حرفِ شکایت زبان پر نہیں لاتی لیکن کیا میں اندھا ہوں' گونگا ہوں' بہرہ ہوں؟"

"پاپا' میرا خیال تھا' وہ میرے رنگ میں رنگ جائے گی' اپنی دقیانوسیت کے غلاف سے باہر آجائے گی۔"

"کون سا رنگ؟ کیسا رنگ؟ مانگے تانگے کا' بدی اور بے حیائی کا رنگ؟ صاحب زادے......! تم جس رنگ کی بات کررہے ہو' وہ کچا رنگ ہے' ناپائیدار اور دوغلا۔" اکرام صاحب جھنجلا کر بولے تھے۔

"آپ چاہے جو بھی کہیں' عائزہ کو میں اب مزید برداشت نہیں کرسکتا' یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"پھر میرا آخری فیصلہ بھی سن لو' میری زندگی میں یہ ناممکن ہے' عائزہ تمہاری پسند سے اس گھر کی بہو بنی ہے اور ہمیشہ رہے گی' یہ گھر پہلے اس کا اور بعد میں تمہارا ہے' ٹھنڈے دل سے سوچو وہ شمع محفل نہیں' شمع خانہ ہے تمہارے اور صرف تمہارے لیے۔"

"آپ چاہے کچھ کہیں' میرا اور عائزہ کا نباہ اب مشکل ہے کیونکہ وہ میرے دل سے اتر گئی ہے۔" یہ کہتے ہوئے آریان تیزی سے اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا تھا۔ عائزہ فوراً چادر اوڑھ کر سوتی بن گئی تھی۔

•......•......•......•

باپ کا لحاظ ختم ہوا تو آریان کی بے نیازیاں بڑھتی چلی گئیں' اب وہ صرف اپنی جسمانی ضرورت پوری کرنے کے عائزہ پر توجہ دیتا تھا اور پھر اسے اپنی ہتک جان کر عائزہ نے بھی الگ سونا شروع کردیا تھا۔ اس دوران میں عائزہ کے بابا نے بھی بیٹی کی محبت میں سارا بزنس کراچی شفٹ کرلیا تھا۔ آریان کے بارے میں کچھ خبریں تو انہیں لاہور میں بھی مل رہی تھیں لیکن آج تک عائزہ نے اس بارے میں کوئی بات نہیں کی تھی کہ شوہر کا بھرم رکھنا مقصود تھا اور وہ بیٹی کا مان رکھ رہے تھے مگر یہاں آکر داماد کے لیل ونہار دیکھ کر وہ دکھی ہوگئے تھے۔ اکرم صاحب ویسے ہی اُن سے بہت شرمندہ تھے۔ اسی دوران روحہ شادی کے بعد مسقط چلی گئی تھی اور شایان C.A. کرکے ایک اچھی سی پرکشش جاب کے لیے دوبئ چلا گیا تھا۔

کچھ دنوں سے عائزہ کی طبیعت خراب تھی' وہ اپنی امی کے ساتھ ڈاکٹر کے یہاں گئی تو ڈاکٹر نے جو خوشخبری سنائی تھی' اس نے گویا اس کے مردہ تن میں جان ڈال دی تھی' وہ ماں بننے والی تھی اور اُسے یقین تھا کہ اولاد کی خوشی آریان کو گمراہی کے اندھیروں سے نکال لے گی۔

اُس رات عائزہ کو بہت بے چینی سے آریان کا انتظار تھا۔ اس نے بطورِ خاص خود کو سجایا سنوارا تھا' آریان کی پسند کے کپڑے پہنے تھے' بھرپور میک اپ کیا تھا' شیشے میں خود کو دیکھ کر اس کو اپنا آپ بہت حسین لگ رہا تھا' کافی دنوں بعد اس نے اپنے اور آریان کے مشترکہ بیڈروم میں قدم رکھا تھا' پورا کمرہ خوشبوؤں سے مہک رہا تھا' اس کو یقین تھا کہ آریان اس کا سجیلا روپ اور اولاد والی خوش خبری سن کر خوش ہوجائے گا لیکن جب آریان کی آمد ہوئی تھی تو عائزہ کی آنکھیں حیرت اور صدمے سے پھٹ گئی تھیں' اس کے ساتھ وہ ماڈل تانیہ بھی تھی جس سے دوستی کے چرچے اور شادی کی افواہیں سرگرم تھیں۔

"آریان' اس کو آپ میرے گھر میں کیوں لائے ہیں؟" وہ نفرت سے چلائی تھی۔

"تم کسی اور کمرے میں چلی جاؤ۔ آج رات یہ یہیں رہے گی کیونکہ یہ میرا بیڈروم ہے۔" آریان نے تانیہ کی کمر میں ہاتھ ڈالتے ہوئے مخمور لہجے میں کہا تھا۔

"آریان' آج آپ نے لمٹ کراس کرلی' اس گندگی کی پوٹ کو لے کر اسی وقت اس کمرے سے نکل جائیں ورنہ میں اس لڑکی کے ساتھ کچھ کر بیٹھوں گی۔" عائزہ کا ضبط جواب دے گیا تھا۔

اُسی لمحے شور سن کر اکرام صاحب کمرے میں داخل ہوئے تھے اور وہاں کا منظر دیکھ کر ایک طمانچہ آریان کے منہ پر مارا تھا۔ "مجھے اندازہ نہیں تھا کہ تم اس حد تک گر جاؤ گے' نکل جاؤ اسی وقت میرے گھر سے اور اس گناہوں کی زندہ تصویر کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ' میں سمجھ لوں گا' میری کوئی اولاد ہی نہیں تھی۔" وہ غصے میں اس بری طرح چیخے کہ خود کو سنبھال نہ سکے اور سینہ پکڑے بیڈ پر گر گئے تھے' ان کو دل کا شدید دورہ پڑا تھا اور پھر عائزہ کی چیخیں بھی انہیں زندگی کی طرف واپس نہ لاسکی تھیں۔ بیٹے کی بے راہ روی نے ان کی جان لے لی تھی۔

"پاپا' آپ کے دم سے تو میرا اس گھر میں وجود تھا' اب میں اس گھر میں رہ کر کیا کروں گی؟"

عائزہ اُسی وقت اپنے آنسوؤں کو آنچل میں جذب کرتی' لٹی پٹی اُس گھر کو ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی تھی۔ امی بابا اتنی رات گئے اُسے گھر کے دروازے پر اکیلا دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔

"امی......! میں وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی ہوں' اب تو پاپا بھی نہیں رہے' میری وہاں اب کسی کو ضرورت نہیں' میں وہاں اب کس کے لیے رکتی؟"

امی نے آنکھیں پھاڑ کر اپنی لاڈلی اور اکلوتی بیٹی کی طرف دیکھا جو کسی بیوہ کی مانند اجڑی اجڑی لگ رہی تھی۔ ان کی ٹانگیں شدتِ غم سے لرزنے لگیں' انہوں نے قریب ہی کرسی کا سہارا لینا چاہا لیکن دل نے ساتھ دینے سے انکار کر دیا' گرنے کی آواز سن کر عائزہ پلٹی تھی۔

"امی......! امی......! آپ کو کیا ہو گیا؟" بیگم عثمان علی کی پلکیں لرز رہی تھیں اور وہ دھیمے دھیمے "اللہ میری عائزہ......!" کی آوازیں نکال رہی تھیں۔

عثمان علی کے ایک فون پر بڑے بڑے ڈاکٹر جمع ہو گئے لیکن سب کے چہرے پر مایوسی تھی۔ انہوں نے کسی سے نہ گلہ کیا نہ شکوہ' بس خاموشی سے بیٹی کا صدمہ دل پر سہہ کر اس سنگدل دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔

عثمان علی پر تہرا صدمہ تھا۔ بیٹی کے اجڑنے کا غم' رفیقۂ حیات کے ساتھ چھوڑنے کا دکھ اور پھر بھائیوں جیسے دوست کی جدائی' ان کی تو جیسے کمر ہی ٹوٹ گئی ہو' عائزہ اپنا غم بھلا کر ان کی دیکھ بھال میں لگ گئی۔ وہ ماں کو کھو چکی تھی' باپ کو کھونے کا اب اُس میں حوصلہ نہیں تھا۔ خالہ خالو بھی اُن کا بہت خیال رکھ رہے تھے' روحہ اور شایان کے بھی تسلی بھرے فون آتے رہتے تھے مگر آریان نے پلٹ کر اُس کی خبر نہیں لی تھی۔ جانے مصروفیت تھی یا شرمندگی!!

رات کو جب عائزہ سونے لیٹتی تو تکیہ آنسوؤں سے بھیگ جاتا۔ "کس قدر مطلبی اور سنگدل ہوتے ہیں یہ مرد حضرات' عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں' کھیلا اور دل بھر گیا تو پھینک دیا...... کیا عورت کا وجود صرف مرد کی دل بستگی کے لیے ہے؟ اللہ......! تو نے ہم عورتوں کو اتنا بے بس اور مجبور کیوں بنایا اور تمام حقوق ان کم ظرف مردوں کو کیوں دے دیئے؟"

اس کی زبان پر کبھی کبھی شکوہ مچلنے لگتا اور پھر وہ توبہ کر کے عبادت میں اور بھی زیادہ دل لگانے لگتی۔

آریان کے بارے میں اڑتی خبریں اس کے کانوں تک بھی پہنچ رہی تھیں کہ باپ کی موت نے اس کی دنیا بدل دی ہے' ہر برائی سے تائب ہو گیا ہے' اس کی تمام بری سرگرمیاں ختم ہو چکی ہیں مگر عائزہ کو اَب اس کے ذکر سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ تو بس اپنے آنے والے بچے کے خواب دیکھتی رہتی تھی۔

اُس روز جب عائزہ اپنے کمرے میں آرام کر رہی تھی' نوکر نے آ کر کہا تھا کہ صاحب ڈرائنگ روم میں بلا رہے ہیں۔

"اس وقت ابو کو کیا کام پڑ گیا؟" وہ دوپٹہ سنبھالتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئی تو غصے کی ایک لہر اس کے تن بدن میں سرایت کر گئی' اس کے سامنے وہ انسان بیٹھا تھا جس کی وجہ سے دو قیمتی جانیں چلی گئی تھیں' اس کی ماں بچھڑ گئی اور باپ جیسے سسر کی ہمیشہ کے لیے آنکھیں بند ہو گئیں' اس کی آنکھوں سے نفرت کے شعلے برسنے لگے۔

"بابا' یہ یہاں کیوں آئے ہیں؟ ان سے کہیے' فوراً اس گھر سے نکل جائیں۔"

"بیٹا' گھر آئے مہمان سے اس طرح نہیں کہتے خواہ وہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔" بابا نے اسے ٹھنڈا کرنا چاہا تھا۔

"بابا' یہ مہمان نہیں' وبالِ جان ہیں' میں ان کی ایک منٹ بھی شکل دیکھنا نہیں چاہتی۔"

"عائزہ......! خدارا' مجھے معاف کر دو' میں اپنے کیے پر پشیمان ہوں' شرمندہ ہوں' میرا تو تم سے بھی بڑا نقصان ہوا ہے' میری کوتاہی نے اس شخص کو مجھ سے جدا کر دیا ہے جو میرا سب کچھ تھا' ماں بھی اور باپ بھی' تمہارے دل میں تو بڑی وسعت ہے' تم نے ہمیشہ میری پردہ پوشی کی ہے' درگزر کیا ہے' مجھے یقین ہے' تم مجھے تلافی کا ایک موقع اور دو گی۔ تمہیں تمہاری اس محبت کی قسم جو تمہیں مجھ سے ہے۔" وہ بڑی لجاجت سے بولا تھا۔ اس دوران بابا کمرے سے جا چکے تھے۔

"محبت ہے نہیں' تھی' بھول جایئے اس عائزہ کو جو آپ کی محبت کا دم بھرتی تھی اور آپ کی ہر جائز و ناجائز خواہش کا یہ سوچ کر احترام کرتی تھی کہ کبھی تو میری وفائیں رنگ لائیں گی لیکن نہیں' آپ نے تو خود کو فرعون اور مجھے زرخرید لونڈی سمجھ لیا تھا۔ کیا عورت کی زبان نہیں ہوتی؟ مرضی نہیں ہوتی؟ خواہشات نہیں ہوتیں کہ وہ صرف مردوں کے اشارے پر ناچتی رہے؟ ان کی جنبشِ ابرو پر ایک روبوٹ کی طرح تھرکنا شروع کر دے؟ میں آپ سے کوئی تعلق نہیں رکھنا چاہتی نہ آج نہ کل اس لیے دوبارہ آنے کی یا مجھ سے ملنے کی کوشش مت کیجیے گا۔"

آریان یوں سر جھکا کر اُس گھر سے باہر نکلا تھا جیسے زندگی کی بازی ہار گیا ہو پھر بارہا اُس نے فون پر عائزہ کو منانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ آواز سنتے ہی فون بند کر دیتی تھی۔

بابا نے بھی اسے بہت سمجھایا تھا۔ "بیٹی......! گزری ہوئی باتوں کو بھول جاؤ' وہ اپنے ماضی پر پشیمان ہے' اُسے سبق مل چکا ہے' اگر صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔"

"اُسے بھولا نہیں' بھٹکا ہوا کہتے ہیں بابا' اور میں بھول جاؤں گی' معاف کر دوں گی' تلافی بھی ہو جائے گی اگر وہ مجھے میری ماں واپس لا دے' وہ قاتل ہے میری ماں کا اور میں اسے کبھی معاف نہیں کروں گی۔"

•......•......•

چند ماہ بعد عائزہ نے ایک بے حد خوبصورت بچی کو جنم دیا تھا جو بالکل آریان کی کاپی تھی' وہی نین نقش' وہی گورا رنگ' اٹھی ہوئی ناک اور خوبصورت دہانہ' وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور پھر بچی کا نام روشانے رکھا گیا تھا۔

روشانے کے کچھ بڑا ہونے پر عائزہ نے ایک پرائیویٹ فرم میں جاب کر لی تھی۔ اس نے LUMS سے گریجویشن کیا تھا اور اب ساتھ ہی M.B.A. بھی کر رہی تھی۔ روشانے نانا کے پاس یا پھر عائزہ کی خالہ کے پاس رہتی تھی۔ اسی دوران شایان بھی پاکستان آ گیا تھا۔ اسے عائزہ کے حالات جان کر بہت دکھ ہوا تھا۔ وہ آج بھی اس کا دیوانہ تھا اور اُس نے اب تک شادی نہیں کی تھی۔

وقت کا سفر جاری رہا تھا۔ روشانے کی عمر تین سال ہو گئی تھی۔ وہ اب اسکول جانے لگی تھی۔ ایک دن عائزہ آفس سے گھر آئی تو شایان آیا ہوا تھا اور روشانے سے کھیل رہا تھا۔ وہ اس کی غیر موجودگی میں اکثر آتا رہتا تھا اس لیے روشانے اُس سے بہت مانوس ہو گئی تھی۔

"عائزہ......! آریان کے بارے میں پتہ ہے' وہ کہاں ہے؟" شایان دانستہ یہ موضوع زیرِ بحث لایا تھا۔ عائزہ کے چہرے پر دکھ کے سائے لہرانے لگے تھے۔

"مجھ سے یہ سوال مت پوچھیے' میں اُن راہوں کو چھوڑ چکی ہوں جن پر وہ بھی میرا ہمسفر تھا۔ وہ کیسا ہے' کہاں ہے' میرا مسئلہ نہیں۔" عائزہ نے لاپروائی سے کہا تھا۔

"لیکن وہ تمہاری بیٹی کا باپ تو ہے!"

"صرف ولدیت کی حد تک ورنہ اس کی سب کچھ میں ہی ہوں۔" عائزہ نے اطمینان سے جواب

دیا تھا۔

''تم خلع کیوں نہیں لے لیتیں؟''

''میں خلع کیوں لوں؟ کیسی باتیں کر رہے ہیں؟'' وہ بگڑ کر بولی تھی۔

''عائزہ! اور کچھ نہیں تو خالو جان اور روشانے کے بارے میں سوچو' تم نے کبھی سوچا ہے ان کے سو برس پورے ہو گئے تو تمہارا کیا بنے گا؟ یہ پہاڑ سی زندگی کیسے گزارو گی؟ روشانے کی زندگی میں باپ کی کمی کیسے پوری ہوگی؟''

عائزہ کا دل تو چاہ رہا تھا کہ وہ شایان کو سخت سا جواب دے دے مگر احتراماً خاموش رہی تھی اور کمرے سے نکل آئی تھی اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ بابا اور خالہ کی جانب سے بھی اُس پر خلع کے لیے اصرار بڑھنے لگا تھا۔ شایان کی آمدورفت بھی جاری تھی۔ آخرکار ایک دن بلی تھیلے سے باہر آ گئی تھی۔ شایان نے صاف صاف کہہ دیا تھا۔

''دیکھو عائزہ! جو بات میں ساری زندگی صرف تمہاری خوشی کے لیے نہ کہہ سکا جو بات میری زندگی کا سب سے بڑا سچ ہے' اسے آج مجھے کہنے سے کوئی نہیں روک سکتا کہ...... میری زندگی تمہارے بغیر ادھوری ہے' میں نے پہلے یہ بات کبھی اس لیے نہیں کہی کہ تمہاری خوشی آریان تھا اور میں اس کے مقابلے میں معاشی طور پر زیرو تھا' اب میں ہر لحاظ سے تمہارے قابل ہوں' اب تمہاری زندگی میں آریان نہیں رہا تو کیوں خود پر خوشیوں کے دروازے بند کر رہی ہو؟ میں نے کبھی نہیں چاہا کہ تمہاری زندگی میں خزاں کا بسیرا ہو۔ میں نے ہمیشہ تمہاری دائمی خوشیوں کی دُعا کی لیکن اب جبکہ آریان تمہاری زندگی میں نہیں رہا تو خدارا! مجھے اپنی زندگی میں شامل کرلو' میں تمہیں وہ سب کچھ دوں گا جس سے آریان نے تمہیں محروم رکھا اور روشانے کو بھی باپ کی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ تم یقین کرو' میں پاکستان صرف تمہاری وجہ سے آیا ہوں۔'' عائزہ تو بس چپ چاپ شایان کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

•......•......•

شایان کی تمام تر منتوں اور پاپا کی کوششوں کے باوجود عائزہ خود کو اس نئے رشتے کے لیے آمادہ نہ کر سکی تھی' ساری رات کروٹیں بدلتے گزر جاتی تھی۔ سلیپنگ پلز بھی بے کار ثابت ہو رہی تھیں۔ خالہ کا اصرار' روحہ کی محبت بھری نصیحتیں' بابا کی خاموش التجائیں' زندگی کی ویرانی کا احساس اسے بھی بری طرح ستانے لگا تھا۔ پہاڑ جیسی زندگی سامنے تھی اور چھوٹی سی بچی کا ساتھ' وہ اکثر سوچتی!

''کیا مجھے شایان کا ہاتھ تھام لینا چاہیے؟ کیا آریان کی بے وفائیوں کے باوجود میں اپنی پہلی محبت کو بھلانے میں کامیاب ہو سکوں گی؟ کیا مجھے اپنی شکست تسلیم کر لینی چاہیے؟ کیا حالات کے آگے میں سپر ڈال دوں؟''

وہ عجب الجھن کا شکار تھی' شایان نے بھی اس سے اب کچھ کہنا چھوڑ دیا تھا لیکن جب بھی وہ آتا' اس کو خاموشی سے دیکھتا رہتا جیسے کہہ رہا ہو۔ ''لگاتار محرومیوں کے بعد میں نے تمہیں پایا ہے۔ اگر اب بھی تم میری نہ ہو سکیں تو یہ زندگی کس کام کی؟ میں تنہائیوں کا زہر پیتے پیتے مر جاؤں گا......'' اور اس سے عائزہ گھبرا جاتی' اس کو لگتا' وہ اپنے فیصلے میں کمزور پڑنے لگی ہے۔

ایک روز عائزہ آفس سے آئی تو ڈرائنگ روم سے روشانے کے ہنسنے کی آواز سن کر وہ ادھر ہی بڑھ گئی اور پھر اس کے قدم جم سے گئے۔ آریان اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ کھڑا تھا' اس کے چہرے پر ندامت' شرمندگی اور پچھتاوا تھا۔

''عائزہ' میں معافی کے قابل تو نہیں مگر ایک مرتبہ موقع دے دو میری بیٹی کی خاطر۔'' اس دوران میں بابا بس خاموشی سے بیٹی کو دیکھ رہے تھے۔

''یہ صرف میری بیٹی ہے' چار سال بعد آپ اسے اپنی بیٹی کس حق سے کہہ رہے ہیں؟'' وہ ترش لہجے میں بولی تھی۔

''یقین کرو' مجھے روشانے کے بارے میں اول دن سے پتہ تھا مگر میں جان کر تمہارے سامنے نہیں آیا کہ مجھے خود کو تمہارے قابل بنانا تھا' تمہارے رنگ کو اپنانا تھا' میں خود کو تلاش کر رہا تھا' ڈھونڈ رہا تھا کہ رَب تو ہمارے اندر ہوتا ہے۔ پاپا کی وفات نے میرے قدم برائی سے اکھاڑ دیئے تھے' میری دنیا بدل دی تھی' میں جو سراب کے پیچھے بھاگ رہا تھا' ایک گہری کھائی میں' ایک نادیدہ دلدل میں دھنس چکا تھا۔ مجھے اللہ نے اندھیروں سے نکال کر ایمان کی روشنی عطا کی تو مجھے لگا' میرے اللہ نے مجھے معاف کر دیا۔ کیا تم مجھے معاف نہیں کرو گی؟ میرے گناہ بے شمار سہی لیکن تمہارا تو دل بہت بڑا ہے۔''

عائزہ اب ایک دوراہے پر کھڑی تھی۔

''آزمائے ہوئے کو آزمانا کارِ جہل است۔'' کچھ اس طرح کے جملے بابا اٹھتے بیٹھتے بولتے رہتے تھے اور وہ سوچ میں پڑ جاتی تھی آریان جس نے اسے دکھوں اور نارسائی کے جہنم میں دھکیلا تھا اور پھر شایان! جس نے قدم قدم پر اس کا ساتھ دیا تھا' اس کی پوجا کرتا تھا' ایک بن باس کاٹا تھا' تنہائیوں کا زہر پیا تھا' وہ آج بھی اس کا طلب گار تھا پھر خالہ اور بابا سے لے کر ہر شخص کا ووٹ شایان کے ساتھ تھا۔

•......•......•

وہ ایک روشن دن تھا' روشانے' نانا کے ساتھ پارک گئی ہوئی تھی اور عائزہ نے شایان کو بلایا تھا تا کہ اسے اپنے فیصلے سے آگاہ کرے۔ وہ شایان کو مایوس نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی سب گھر والوں کو ناراض کر سکتی تھی' خلع کی صورت آریان کو واپس اپنی دنیا میں لوٹنا تھا' وہ بے چینی سے شایان کی منتظر تھی' جب ہی آریان کی آمد ہوئی تھی۔ عائزہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات دیکھ کر وہ شرمندگی سے بولا تھا۔

''پلیز عائزہ! ایک مرتبہ اور ٹھنڈے دل سے غور کرلو' میں تمہاری ہر شکایت کا ازالہ اور ہر دکھ کی تلافی کروں گا' صرف ایک موقع دے دو' میں' تم اور ہماری بیٹی یہاں سے اپنے گھر نہیں' پہلے خدا کے گھر جائیں گے' کعبے کے سامنے میں ایک بار پھر اللہ اور تم سے اپنے گناہوں کی معافی مانگوں گا اور اسے گواہ بنا کر تم سے وعدہ کروں گا کہ آنے والی زندگی میں میرے ماضی کا کوئی سایہ بھی تم پر اور ہماری بیٹی پر کبھی نمودار نہیں ہوگا۔''

مسرت اور محبت سے سرشار شایان کی جب عائزہ کے گھر آمد ہوئی تھی تو وہ سیدھا اُس کے کمرے کی جانب آیا تھا۔ اُس نے دھیرے سے کمرے کا پردہ ہٹایا تھا اور اندر کا منظر دیکھ کر اس کے قدم ساکت ہو گئے تھے۔ اب کہنے سننے کو کچھ باقی نہیں بچا تھا' وہ بے آواز قدموں سے واپس پلٹ گیا تھا...... کمرے میں عائزہ' آریان کے سینے پر سر رکھے سسک رہی تھی۔

•......•......•

واپسی کے سفر کے دوران شایان سوچ رہا تھا کہ عائزہ کا فیصلہ اچانک بدل کیسے گیا تھا؟ اب اُسے یہ بات کون بتاتا اور سمجھاتا کہ عائزہ نے اپنا فیصلہ آریان کے لیے اُس کی باتوں پر یقین کر کے نہیں بدلا تھا بلکہ اپنی بیٹی کے باپ کے لیے بدلا تھا جو ایک نئی زندگی کے لیے اس اللہ کو گواہ بنا رہا تھا جو اپنے گناہ گاروں پر توبہ کے دروازے کبھی بند نہیں کرتا!!



مون شاہ بخاری

میری گڑیا رانی

صفیہ سلطانہ مغل کا خیال

جل گئے ہیں خواب سارے بجھ گئی ہیں خواہشیں
کس تواتر سے ہوئیں مجھ پر غموں کی بارشیں

سوتیلی ماں کے ظلم اور ستم سہتی ایک مظلوم لڑکی کی غم آلود خصوصی کہانی

شام کے سائے گہرے ہوتے جا رہے تھے۔ وہ اداس بیٹھی مستقبل کے تانے بانے بُننے میں مصروف تھی۔ اس کی ماں کو دنیا سے گئے ہوئے آج دسواں روز تھا۔ اب وہ خود کو اس بھری دنیا میں تنہا محسوس کر رہی تھی۔ صرف وہی نہیں بلکہ اس کے باقی تین بہن بھائی بھی بے یارومددگار ہو گئے تھے۔ ماں کی شفقت بھری چھایہ اب اس کے سر پر نہیں تھی۔ اگرچہ باپ موجود تھا مگر نہ ہونے کے برابر۔ اسے اپنے بچوں کی کوئی فکر نہیں تھی۔

''نازیہ...... اے نازی' کہاں گم ہے تو؟ چل اٹھ کر ہانڈی پکا لے' لے پکڑ' سبزی بھی لے آیا ہوں۔'' کریم الدین نے سبزی والی تھیلی اس کے قریب چارپائی پر رکھتے ہوئے کہا۔ وہ خاموشی سے تھیلی اٹھا کر چھپر والے باورچی خانے کی طرف بڑھی۔ ماں کی زندگی میں کبھی اس نے یہ کام نہیں کیا تھا۔

وہ کہتی تھی۔ ''نازیہ' تجھے بہت پڑھنا ہے' ابھی تیری عمر نہیں کام کرنے کی' بس تو جی لگا کر پڑھ۔'' انہی خیالوں میں اس نے سالن اور کھانا تیار کر لیا۔

چنگیر میں روٹی سالن رکھ کر اس نے باپ کے سامنے رکھ دیا۔ ابھی ابا نے ایک نوالہ توڑ کر منہ میں رکھا ہی تھا کہ اس کے منہ کے زاویئے بگڑنے لگے۔ اس نے پانی کا گلاس غصے سے زمین پر پٹخا۔

''یہ سالن پکایا ہے تو نے؟ اتنا نمک...... اور روٹیاں دیکھ...... کچی پکی اور موٹی موٹی' میرا تو حلق دکھنے لگا ہے۔'' اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اس نے سہم کر باپ کو دیکھا۔

''ابو......! وہ...... مم...... میں نے...... پپ...... پپ...... پہلی بار......''

''بس' بکواس نہ کر' بہت زبان چلنے لگی ہے تیری' کہا تھا تیری ماں کو رہنے دے پڑھائی' لڑکی ذات ہے' کام دھندے سے لگا مگر اس جاہل عورت نے میری ایک نہیں مانی۔'' کریم الدین کے غصیلے انداز سے گڈو' پپو اور منی بھی سہم گئے تھے۔ وہ بکتا جھکتا سونے کے لیے کمرے میں چلا گیا مگر نازی آنسو بہاتی رہی۔ اس نے منی' گڈو اور پپو کو کھینچ کر سینے سے لگایا۔ ابھی وہ صرف بارہ سال کی تھی لیکن اپنے



بہن بھائیوں کو ماں کی طرح چاہنے لگی تھی۔ ماں کے جانے سے اس کے نازک کاندھوں پر بڑی بھاری ذمہ داری آن پڑی تھی۔

دن تیزی سے گزرتے چلے گئے' ماں کا چہلم بھی ہو گیا' تاہم وقت نے اس میں سمجھداری پیدا کر دی تھی۔ آہستہ آہستہ وہ ہر کام میں طاق ہو گئی تھی لیکن ابا کی تیوریاں ہمیشہ چڑھی رہتی تھیں۔ وہ معمولی سی باتوں پر غصہ کرتا اور اکثر بچوں کو روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا تھا۔ وہ بچوں کو بوجھ سمجھنے لگا تھا۔ نازی نے اسکول جانا بھی چھوڑ دیا تھا مگر گڈو اور پپو گاؤں کے پرائمری اسکول میں جاتے تھے۔

منی ابھی ایک سال کی تھی' وہ گھر کے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد سارا وقت منی کے ساتھ گزارتی۔ اس تھوڑے سے عرصے میں اس کی سوچ میں پختگی آ گئی تھی۔ کم عمری میں پیش آنے والے حالات نے اسے خواہشات کو مارنا سکھا دیا تھا۔ بظاہر وہ بچی تھی مگر اپنی سنجیدہ باتوں سے سمجھدار عورت کی طرح لگتی تھی۔

کریم الدین کراچی میں ڈرائیوری کرتا تھا۔ وہ دو ماہ گاؤں میں رہ کر واپس چلا گیا۔ ابا کے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلی رہ جاتی مگر بھلا ہو کہ برابر میں اس کے تایا کا گھر تھا جو ان سب کو بہت چاہتے تھے۔ مختلف مزاج ہونے کے باعث اس کے تایا اور ابا کی آپس میں کبھی نہیں بنی۔ تایا ابا ہر کام میں تائی سے مشورہ لینے کے عادی تھے جبکہ کریم الدین ان کا مذاق اڑاتا اور انہیں زن مرید ہونے کا طعنہ دیتا تھا اسی لیے قریب رہ کر بھی دلوں میں دوریاں تھیں لیکن یہ تایا کی محبت کا نتیجہ تھا کہ انہوں نے دونوں گھروں

کے درمیان اٹھی دیوار گروادی تھی جس پر نازیہ نے خدا کا شکر ادا کیا تھا۔ اب دونوں گھرانوں کا کھانا پینا تو الگ تھا مگر تائی' تایا کی نگرانی سے اسے حوصلہ مل گیا تھا۔

ابا کراچی جا کر بچوں کو بالکل بھول گیا تھا۔ گھر کے خرچے کے لیے جو پیسے بھیجتا تھا' وہ بھی اس نے بند کر دیئے تھے۔ ان حالات میں تایا رحیم الدین اپنے پانچ بچوں کی کفالت کے ساتھ اپنے بھائی کے بچوں کا بوجھ بھی اٹھانے لگا تھا۔ تایا تو خوشی خوشی بھائی کے بچوں کو پال رہا تھا مگر تائی اگرچہ منہ سے کچھ نہ کہتیں لیکن ان کی آنکھوں سے جھانکتی ناگواری نازی سے چھپی نہ رہ سکی تھی۔ تائی بے چاری بھی کیا کرتی' ان کے اخراجات بھی تو کم نہیں تھے اور پھر آمدنی کا واحد ذریعہ بھی تو سائیکل ورکس کی معمولی سی دکان تھی جس کی آمدنی سے خود ان کا گزارہ بمشکل ہو پاتا تھا لیکن تایا ان سب کے باوجود اپنے فرائض نبھانے میں ہرگز کوتاہی نہیں کرتا تھا۔ زندگی گھسٹ گھسٹ کر جیسے تیسے چل رہی تھی کہ چھ ماہ بعد ہی کریم الدین کی کراچی سے آمد اُن کی زندگی میں پھر سے زہر گھول گئی۔ وہ اپنے ہمراہ ایک عورت بھی لایا تھا۔

''سلام کر' یہ تیری ماں ہے۔'' کریم الدین نے منہ کھولے کھڑی نازی سے کہا۔

گہرا کالا رنگ' موٹے نقوش' معمولی سوٹ میں ملبوس' عجیب کرختگی لیے صورت والی عورت...... نہیں' یہ اس کی ماں نہیں ہو سکتی۔ اس کی ماں تو بہت خوبصورت تھی' نازی اپنی ماں کا پرتو تھی۔ اس کے نازک لب کپکپائے۔

''پپ...... پپ...... پر ابا......! یہ......''

''زبان بند رکھ' یہ ہی تیری ماں ہے اور اس کی عزت کرنا ورنہ گھر سے نکال باہر کروں گا' سمجھی؟ چل سلام کر۔''

ابا کی گرج دار آواز سن کر تائی اپنے کمرے سے نکل کر صحن میں آ گئی تھی اور بولی۔ ''یہ کون ہے کریم الدین؟''

''بیوی ہے میری' میں نے شادی کر لی ہے اس کے ساتھ' بھرجائی' اس گھر کو عورت کی ضرورت تھی جو یہ ذمہ داریاں نبھا سکے۔''

''ماشاءاللہ' نازی سمجھدار ہے کریم الدین' اور پھر وہ اپنی سب ذمہ داریاں بخوبی نبھا رہی ہے۔ اس عمر میں تجھے شادی کی ضرورت تو نہ تھی؟'' تائی کو بھی یہ بات پسند نہیں آئی تھی۔

''بھرجائی' نازی کتنی ہی سمجھدار ہو جائے' پر ہے تو کم عمر' کل کلاں کو اس کی شادی بھی تو کرنی ہے پھر گھر کون دیکھے گا؟''

''میرا خیال ہے' تب تک گڈو اس قابل ہو جائے گا کہ اس کی شادی کر دی جائے۔'' تائی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ابا دھاڑا۔

''بھرجائی' یہ میرے گھر کا معاملہ ہے' تم کو ضرورت نہیں اس معاملے میں بولنے کی' ان بچوں کی خاطر تو میں نے نکاح کیا ہے۔''

''بس کر کریم الدین' اگر تم کو ایسا ہی احساس ہوتا تو خرچ کیوں بند کرتا؟ اپنی ذمہ داریاں ہم پر کیوں لادتا؟ سچ تو یہ ہے کہ تم کو شادی کا شوق تھا ورنہ اگر تمہارا ہی معاملہ تھا تو اپنی ان چار مصیبتوں کو بھی اپنا معاملہ سمجھتے نا کہ ہماری جان کا عذاب بناتے۔'' تائی نے غصے سے کہا تو کریم الدین کو جیسے آگ لگ گئی۔

''مجھ پر احسان نہیں کیا' نہ گراتے دیوار' میرے بچے تو نہ سنبھالنا پڑتے۔ بھرجائی' میں نے کب تم سے ہاتھ جوڑ کر کہا تھا' ان کو سنبھال' نہ سنبھالتی۔''

''واہ' نیکی کر دریا میں ڈال' اے بھائی میاں' نہ سنبھالتی تو زمانہ باتیں بناتا' احسان ماننے کی بجائے تم تو گلے پڑ گئے۔ کیسی شرافت ہے یہ' بھلائی کا تو زمانہ ہی نہیں رہا نہ سنبھالتے تو مر گئے ہوتے یہ سب۔''

''زمانے کے خوف سے تم نے بچوں کو سنبھالا' ہمدردی کی وجہ سے نہیں۔ اگر مرتے تھے تو مرنے دیتے' میری بھی جان چھوٹتی۔''

تائی کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ عورت بول اٹھی۔ ''بڑی ہی چالاک عورت ہے تمہاری بھرجائی' وہ احسان ہی کیا جو جتلایا جائے' میں تو کہتی ہوں' دیوار پھر سے اٹھوا دو ورنہ یہ خوامخواہ ہمارا گھر خراب کرے گی۔'' اس کالی کلوٹی عورت کی بے باک زبان نے نازی کو دہلا کر رکھ دیا۔

''ہاں' ہاں' دیکھ لوں گی تجھے بھی' کیسے پالے گی یتیموں کو' جانے کس قماش کی عورت ہے؟ اللہ جانے' بھاگ کر آئی ہے کہ بے نکاح؟ تیری تو شکل سے ہی لگتا ہے کہ کسی بھنگی' چمار کی اولاد ہے۔ آئی بڑی ہوشیار لومڑی' اٹھوا دے دیوار' ہمیں بھی شوق نہیں ایسی نیکیوں کا جس کا کوئی ماننے والا بھی نہ ہو' الٹا سر میں خاک پڑے۔ توبہ توبہ' پہلے ہی دن سے گز بھر کی زبان چل رہی ہے۔''

''بھرجائی......! اپنا منہ بند کر لے ورنہ......''

''ورنہ کیا؟'' تائی نے چلا کر کہا۔

''ورنہ تیری زبان کھینچ لوں گا۔'' ابا اچھا خاصہ بدلحاظ ہو گیا۔ وہ تائی کے منہ پر تھپڑ مارنے والا تھا کہ تایا آ گیا۔ اس نے کریم الدین کا بازو پکڑ لیا۔

''واہ...... کریم الدین...... آج یہ دن بھی دیکھنا تھا کہ تو نے اپنی ماں جیسی بھرجائی پر ہاتھ اٹھایا' ہوا کیا ہے؟''

پھر تائی نے تایا کو ساری بات بتائی۔ تایا کو بھی ابا کے فیصلے سے اختلاف تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اگلے دن ہی دیوار پھر سے اٹھ گئی تھی اور یہ سب کروانے والی وہی کالی تسلیم بی بی تھی۔ دُعائیں مانگتی

قطعہ

یوں نہ غم میں جلیں عید نزدیک ہے
بھول کر غم ہنسیں عید نزدیک ہے
دوستوں ساتھیوں اور پردیسیو!
آؤ سب گھر چلیں عید نزدیک ہے

نسیم نیازی۔ کراچی

نازی کا دل بری طرح ٹوٹا تھا۔ وہ سوچنے لگی' یہ عورت کتنی خبیث ہے' جس نے آتے ہی ابا اور تایا میں رنجش پیدا کر دی تھی۔

سخت سردی کی اس رات نازی اور اس کے چھوٹے بہن بھائیوں نے برآمدے میں ٹھٹھرتے ہوئے گزاری تھی۔ گھر کے واحد کمرے میں ابا اپنی نئی بیوی کے ساتھ ایسے مزے سے سوئے تھے کہ اگلے دن دوپہر بارہ بجے تک کمرے سے باہر نہیں نکلے تھے جبکہ اس کمرے کے آگے بنا برآمدہ گڈو' پپو' منی اور نازی کا ٹھکانہ تھا۔ کھلے برآمدے میں ٹھنڈی ہوا ساری رات اُن کے جسم میں چھید کرتی رہی۔ گڈو اور پپو تو کچھ سمجھدار تھے مگر ایک سالہ منی سے سردی برداشت نہیں ہو پا رہی تھی۔ ایسے میں نازی اسے اپنی بانہوں میں بھر کر' سینے سے بھینچ کر اسے اپنے وجود کی گرمی پہنچانے کی ناکام کوشش کرتی اور بمشکل بہلا پاتی۔ اب وہ اپنی معصوم ننھی منی سی بہن کو کیسے بتاتی کہ اس کمرے سے بے دخل کرنے میں ان کی سوتیلی ماں ہی نہیں بلکہ سگا باپ بھی شامل تھا۔ وہ باپ جو بظاہر بچوں کا خیال رکھنے کے لیے تسلیم بی بی کو بیاہ کر لایا تھا مگر ان ہی بچوں کے وجود سے یکسر لاپروا تھا۔

گھر کا کام ابھی بھی نازی ہی کرتی تھی جبکہ سوتیلی ماں تمام دن اس پر حکم چلاتی رہتی تھی مگر ابا کے کام سے واپسی کے وقت وہ سر پر دوپٹہ باندھے ہائے ہائے کرتی روٹیاں پکانے لگتی اور ابا کو لگتا کہ سارا

دن تسلیم بی بی کام کرتی ہے' یہ دیکھ کر وہ نازی کو ڈانٹ دیتا جبکہ وہ اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں میں آنے والے آنسوؤں کو روکے خاموش نظروں سے باپ کو بس دیکھتی رہ جاتی' وہ باپ کو نہ بتا پاتی کہ سارا کام وہی کرتی ہے' تسلیم بی بی تو اسے دکھانے کو کسی نہ کسی کام میں مصروف ہو جاتی ہے۔ وہ یہ باتیں صرف سوچ سکتی تھی' اگر کہتی تو گھر سے نکال باہر کیا جاتا' یوں بھی اب اس کے دل میں ابا کے ساتھ ساتھ تسلیم بی بی کا خوف بھی جگہ بناتا جا رہا تھا۔

•......•......•......•

تسلیم بی بی کو آئے ہوئے دو ماہ ہو گئے تھے۔ اب تو اسے آرام کی عادت ہو گئی تھی' بس حکم چلاتی رہتی۔

''نازی...... میرے سر میں درد ہے' چائے بنا دے۔'' کبھی کہتی۔ ''سر میں مالش کر دے۔'' دن کے کسی وقت بھی وہ نازی کو بیٹھنے نہ دیتی' سب کاموں سے فارغ ہو کر اگر وہ تھوڑا سا ستانے کے لیے لیٹتی تو وہ اسے جھڑک کر اٹھا دیتی۔

''اٹھ' سونے لگی ہے' کام تیرا باپ کرے گا؟ چل' میرے پاؤں داب۔ آج تو بدن ٹوٹ رہا ہے۔'' اور وہ اپنی اوڑھنی درست کرتے ہوئے تسلیم بی بی کے پیر دابنے لگتی۔ پیر دابتے دابتے وہ نیند سے بے حال ہو جاتی۔ نیند بھری آنکھوں کو بمشکل کھولے وہ تسلیم بی بی کی خدمت میں مصروف رہتی جبکہ تسلیم بی بی خراٹے بھر رہی ہوتی۔ جب کروٹ بدلتی تو نازیہ کو دیکھ کر ڈانٹ دیتی۔

''ہٹی کٹی ہے' پر تیرے ہاتھوں میں دم نہیں' ٹوٹے ہیں کیا؟ چل جا سو جا' کوئی کام بھی ڈھنگ سے نہیں کرتی۔'' نازیہ بے بسی سے اپنے دکھتے ہاتھوں کو رگڑتی' جھلنگا سی چارپائی پہ منی کے پاس جا کر لیٹ جاتی۔

•......•......•......•

اُس دن گڈو اور پپو اسکول گئے ہوئے تھے۔ نازی گھر میں منی کے ساتھ اکیلی تھی۔ تسلیم بی بی محلے میں گئی ہوئی تھی' ویسے بھی یہ اس کا من پسند مشغلہ تھا جب تک وہ سارے محلے کے گھروں میں چغلیاں نہ کر لیتی' اسے سکون نہیں ملتا تھا۔

نازیہ' منی کو کپڑے پہنا رہی تھی کہ اس کے کانوں میں سبزی والے کی آواز آئی۔

''چل تو یہاں بیٹھ کر کھیل' میں سبزی لے آؤں' اماں تو پتہ نہیں' کہاں رہ گئی ہے؟'' نازیہ نے منی کو چارپائی پہ بٹھاتے ہوئے کہا اور کھلونے اس کے سامنے رکھ کر دروازے میں کھڑے ہو کر سبزی والے کو آواز لگائی۔

''چاچا......! ذرا رک' سبزی دیتا جا۔'' جونہی وہ سبزی لے کر مڑی' اس کی نظر برابر والے گھر سے نکلتی تسلیم بی بی پہ پڑی۔ اس کے چہرے پہ پھیلے ناگوار تاثرات کو دیکھ کر نازی اندر ہی اندر لرز کر رہ گئی' جانتی تھی کہ اب اس کی خیر نہیں اور پھر یہی ہوا تھا' جیسے ہی وہ گھر پہنچی' پیچھے ہی تسلیم بی بی بھی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ سے سبزی والا شاپر چھین کر چارپائی پر پھینکا اور زوردار تھپڑ اس کے نازک رخسار پر جڑ دیا۔

''بول...... کیا کر رہی تھی تو باہر؟''

''اماں......! وہ سبزی...... میں سبزی لینے گئی تھی۔''

''بکواس بند کر...... سبزی لینے گئی تھی کہ آنکھ مٹکا کرنے؟ میں اچھی طرح سمجھتی ہوں تیری چالاکیوں کو......''

''نہیں ماں' میں نے سوچا' ہو سکتا ہے' کوئی اور سبزی والا نہ آئے تو میں شام کے لیے......''

''کیا سمجھتی ہے تو مجھے بے وقوف بنائے گی' میں تیری باتوں میں نہیں آنے والی...... تو میری آنکھوں میں دھول نہیں جھونک سکتی' تیرا باپ آئے گا تو دیکھنا' تیری کیسی درگت بنواتی ہوں؟ تیرے سارے کرتوت بتاؤں گی' کہہ دوں گی' تیری لاڈلی کی جوانی بے لگام ہوئے جا رہی ہے' اس کا بیاہ کر دے۔ غضب خدا کا' میں پڑوس میں ہی گئی تھی' مر تو نہ گئی تھی؟ خود تیرا باپ دور پردیس میں بیٹھا ہے' کل کلاں کو تو نے کوئی گل کھلا دیا تو دنیا والوں کی تھو تھو میرے حصے میں آئے گی ناں' کیا جواب دوں گی' سوتیلی ماں ہی کہلواؤں گی۔''

نازیہ چپ چاپ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔ کیسے کیسے الزام لگ رہے تھے اس کی ذات پر' وہ اپنی صفائی بھی پیش نہیں کر پا رہی تھی۔

''اب رونا بند کر' نحوست پھیلا رکھی ہے۔ مجھے بھوک لگ رہی ہے' جلدی سے کھانے کا انتظام کر' ابھی کچھ دیر میں تیری ماں کی دوسری جیسی یاجوج ماجوج کی فوج بھی آنے والی ہے' خود تو مر گئی' میری جان عذاب میں ڈال گئی......'' تسلیم بی بی اسے جھنجھوڑ کر کمرے میں چل دی۔

•......•......•......•

زندگی روز بہ روز مشکل ہوتی جا رہی تھی اور وہ اب اس زندگی سے تنگ آ چکی تھی۔ اس کا جی چاہتا' اسے اس قید سے رہائی مل جائے۔ اگر وہ تنہا ہوتی' کب کی جا چکی ہوتی مگر منی کا خیال آتا تو کلیجہ کٹ کر رہ جاتا۔ سوچتی' میرے بعد منی کا کیا ہو گا؟ گڈو' پپو کس حال میں رہیں گے؟ اماں کی روح تڑپ جائے گی۔ اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی خاطر وہ سوتیلی ماں کا ہر ظلم برداشت کر رہی تھی لیکن کب تک؟ اس کی عمر اور سوچ پختہ نہیں تھی' یہی وجہ تھی کہ اس نے سوچے بنا بہت بڑا قدم اٹھانے کا فیصلہ کر لیا۔

اُس روز بھی معمولی سی بات پر اماں نے ہنگامہ کھڑا کر دیا نہ صرف اسے ڈانٹا بلکہ اسے دھنک کر رکھ دیا۔ نازی کو پیٹنے کے بعد جب تسلیم بی بی محلے کے راؤنڈ پر نکلی تو نازی نے ایک اہم فیصلہ کر لیا۔ اس نے ایک تھیلی میں منی کے چند پرانے کپڑے ڈال کر اور ایک جوڑا اپنا رکھ کر منی کو سینے سے لگایا اور جانے کے لیے تیار ہو گئی۔ یہ چھوٹا سا گھر جسے جنت بنانے کی کوشش میں اس کی ماں منوں مٹی تلے جا سوئی تھی۔ اُس کی ماں کو اپنی اولاد کو پڑھانے' اچھے اچھے کپڑے پہنانے کا بہت شوق تھا۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کے بچے بڑے ہو کر کامیاب اور اچھے انسان بنیں مگر اس کے یہ خواب ادھورے رہ گئے۔ تمام تمناؤں کو دل میں لیے وہ ان کو چھوڑ کر چل بسی۔ ماں کو یاد کرتے ہوئے اس کے گال آنسوؤں سے بھیگ گئے پھر آنسو پونچھ کر وہ جلدی سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ گڈو اور پپو اسکول گئے ہوئے تھے' اُن کو خدا کے سپرد کر کے نازی نے الوداعی نظر اپنے گھر پر ڈالی اور باہر نکل آئی۔ تیز تیز قدم اٹھاتی وہ آبادی سے کافی دور آ چکی تھی کہ ایک رکشہ اس کے قریب آ رکا۔

''بی بی' کہاں جانا ہے؟'' رکشے والے کے سوال پر وہ چونکی' یہ تو اس نے سوچا ہی نہیں تھا کہ جانا کہاں ہے؟ کچھ دیر یونہی سوچنے کے بعد اچانک اس کے ذہن میں اپنی پھوپھی کا خیال آیا جو دو تین گاؤں چھوڑ کر ۹۰ چک میں رہتی تھی۔ دوپٹے کے پلو میں بندھا پچاس کا نوٹ کھول کر اس نے رکشے والے کی طرف بڑھایا۔

''مجھے ۹۰ چک جانا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے وہ منی کو سنبھالتی ہوئی رکشے میں بیٹھ گئی۔

پھوپھی حمیدہ اس کی بڑی پھوپھو تھی۔ مزاج میں بالکل ابا پر گئی تھی۔ ابا سے کسی بات پر خفا تھی اس لیے بہت کم اُن کے ہاں آتی جاتی تھی لیکن اس وقت نازیہ کو اس کے گھر کے علاوہ کوئی ٹھکانہ نظر

نہیں آیا۔ اس کا ننھیال تو ویسے بھی لاہور میں تھا' اتنی دور کیسے جا پاتی؟ جب اس کی اماں فوت ہوئی تھیں تو اس کے ننھیال والے آئے تھے اور بچوں کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے لیکن ابا نے جانے نہیں دیا۔ اس کی وجہ یہ نہیں تھی کہ وہ ان بچوں سے پیار کرتا تھا بلکہ وہ چاہتا تھا کہ اس کی شادی نازی کی چھوٹی خالہ سے ہو جائے مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ وہ ابا کی فطرت کو اچھی طرح جان گئے تھے۔ اس نے پہلے ان کی بڑی بیٹی کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا تھا تو دوسری کا کیا حال کرتا۔ اسی ضد میں ابا نے بچوں کو ننھیال جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ ملنے جلنے سے بھی روک دیا۔

''نوے چک آ گیا ہے بی بی......!'' رکشے والے کی آواز پر وہ سوچوں سے باہر نکل آئی اور رکشے سے اتر کر پھوپھو کے گھر کی طرف بڑھ گئی۔ ماں کے مرنے کے بعد اُسی پھوپھی نے بچوں کو کچھ دن اپنے ساتھ رکھا تھا مگر جلد ہی اکتا کر واپس بھیج دیا تھا۔ اگرچہ نازی' پھوپھو کے پاس آنا نہیں چاہتی تھی لیکن ایک امید تھی جس کے سہارے وہ یہاں تک چلی آئی تھی۔ اس نے لکڑی کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دروازہ پھوپھی کی بہو نے کھولا تھا۔

''نازی......! تو......؟''

''ہاں' بھابھی......!''

''خیر تو ہے ناں؟'' اس نے کڑی نظروں سے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور ہنوز دروازے میں کھڑی رہی۔

''بھابھی......! خیر ہی ہے۔'' اس نے مزید کچھ کہنے کے لیے لب کھولے ہی تھے کہ پیچھے سے حمیدہ پھوپھی کی آواز آئی۔

''کون ہے پروین' دروازے پر؟''

''چاچی' ساتھ والے گاؤں سے نازی آئی ہے۔'' پروین ایک طرف ہٹ گئی تو وہ گھر میں داخل ہوئی۔ اسے دیکھتے ہی پھوپھی منہ بناتی ہوئی پاس آ کھڑی ہوئی۔

''اکیلی آئی ہو؟''

''نہیں' منی بھی ساتھ ہے۔''

''آئے ہائے' میرا مطلب ہے' ابا یا اماں نہیں آئے؟''

''نہیں پھوپھو' ابا تو کراچی میں ہی' میں اکیلی آئی ہوں۔'' پھر اس نے پھوپھی کو ڈرتے ڈرتے گھر چھوڑنے کے بارے میں بتایا تو پھوپھی نے اسے گھور کے دیکھا البتہ منہ سے کچھ نہیں کہا اور خاموشی سے اٹھ کر کمرے میں چل دی۔ نازیہ کے لیے یہ بھی غنیمت تھا۔ پروین بھابھی نے اسٹیل کے بدرنگ گلاس میں اسے پانی دیا جسے اس نے ایک سانس میں خالی کر دیا۔ اسے اب بھوک بھی لگ رہی تھی مگر مروت میں کچھ کہہ نہ سکی۔ پروین نے اسے کھانے کا تو نہیں پوچھا بلکہ ایک کچے سے چھپر نما کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''وہ تمہارا کمرہ ہے' وہاں سو جانا۔''

منی کو اٹھا کر جب وہ کمرے کی طرف جانے لگی تو منی نے کہا۔ ''باجی......! بھوک لگی ہے۔''

اُس نے بے بسی کے عالم میں منی کا معصوم چہرہ دیکھا اور پھر نلکے پہ برتن دھوتی پروین کے قریب گئی۔

''بھابھی' دودھ ہوگا؟ منی کو بھوک لگی ہے۔''

پروین نے کٹوری پٹخی اور بڑبڑاتی ہوئی چھوٹے سے کچن میں چلی گئی۔ اس ذلت پر نازی نے بمشکل امڈتے آنسوؤں کو روکا اور دودھ کا کپ بھابھی کے ہاتھ سے لے کر چھپر کی طرف بڑھ گئی۔

دوسری طرف تسلیم بی بی نے پورے گاؤں میں ڈھنڈیا مچائی ہوئی تھی۔ جب کہیں سے سراغ نہ ملا تو سر پہ کپڑا باندھ کر واویلا کرنے لگی۔ ''ہائے...... میرے خدا......! یہ دن بھی دیکھنا تھا مجھے؟ میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ اس چھوکری کے چھن اچھے نہیں' یہ ضرور کسی دن بھاگ جائے گی' بیڑہ غرق ہو چنڈالن کا' دنیا تو مجھے ہی طعنے دے گی۔ نازی......! آگ برسے تیرے نصیبوں پر...... جنموں جلی' میرے منہ پر کالک مل گئی۔''

اس کے قریب بیٹھے پپو اور گڈو سوچ رہے تھے کہ اماں کا منہ تو پہلے ہی کالا ہے' مزید کالک کس نے مَل دی جو اماں کو اتنا غصہ آ رہا ہے؟ نازیہ کو کوسنے دیتے دیتے تسلیم بی بی کی نظر اُن دونوں پہ پڑی۔ وہ کھول اٹھی۔ بازو سے پکڑ کر کھینچا اور لگی اُن کو پیٹنے...... جانے کتنی دیر تک اُن کو یونہی پیٹتی رہتی کہ برابر والے گھر سے تائی آ گئیں۔

''چھوڑ ان کو کلموہی...... تیرے اسی ظلم کی وجہ سے بچی گھر سے چلی گئی ہے۔'' تائی نے دونوں کو کھینچ کر پیچھے کیا تھا۔

''نہ...... کیا مطلب ہے تیرا؟ کون سے ظلم ہوتے تھے اُس پر؟ وڈی آئی' بڑی ہمدرد' سنبھالتی ناں پھر ان کو؟''

''جو کچھ تو ان کے ساتھ کر رہی ہے' وہی نازی کے ساتھ کرتی تھی۔''

''میں کہتی ہوں' اپنی زبان بند کر لے اور یہاں سے چلی جا...... ہمارے معاملے میں بولنے کی اجازت کس نے دی ہے تجھے؟ کیوں آئی ہے یہاں؟ چلی جا...... ورنہ چٹیا سے پکڑ کر نکال باہر کروں گی۔''

''اتنی ہمت ہے تو مجھے ہاتھ لگا کے دکھا' جا رہی ہوں میں' مجھے بھی شوق نہیں خوامخواہ کی دردسری کا۔ وہ تو بے چارے معصوم بچوں کا خیال آتا ہے' تجھ سے تو خدا ہی پوچھے گا۔'' تائی بلند آواز میں بولتی اپنے گھر چلی گئی تو وہ ایک بار پھر دونوں بچوں پر پل پڑی۔

•......•......•

''تجھے اپنی ماں کا نمبر یاد ہے نازو......؟'' وہ صحن میں جھاڑو لگا رہی تھی جب پھوپھی نے اُس سے پوچھا۔ وہ سہم گئی کہ کہیں پھوپھی اسے واپس جانے کا نہ کہہ دے حالانکہ یہاں بھی اسے نوکرانیوں کی طرح ہی رہنا پڑ رہا تھا مگر تسلیم بی بی کے دوزخ سے کہیں بہتر تھا۔

''کک...... کیوں پھوپھو؟''

''میں اُسے اطلاع دے دوں کہ تو یہاں ہے۔ پریشان ہوتی رہے گی۔ خیر' پریشان تو کیا ہونا ہے' پورے گاؤں میں تماشا بنا دے گی۔'' پھوپھی نے جل کر کہا۔

''وہ پریشان نہیں ہوگی پھوپھو' وہ تو خوش ہوگی۔''

''مگر ہمیں تیری خاطر خود پر الزام تو نہیں لگوانا' کیا خبر تو پہلے کہاں سے بھٹکتی ہوئی یہاں آئی ہے؟''

''نن...... نہیں...... میں اور کہیں نہیں گئی' سیدھی آپ کے پاس آئی ہوں۔'' وہ رو دینے کو تھی۔

''چل' پنڈ کون سا دور ہے' میں خود جا کر کہہ دوں گی۔''

''پر پھوپھو......! مجھے وہاں نہیں جانا۔''

''دیکھ' کیسے زبان چلاتی ہے' اسی وجہ سے اس سے مار کھاتی ہوگی۔ تجھے کون واپس جانے کا کہہ رہا ہے؟'' پھوپھو کے آخری جملے پر خوش ہو کر وہ انہیں نمبر بتانے لگی جو انہوں نے قریب بیٹھے اپنے بیٹے سکندر کو ملانے کے لیے کہا۔

''ہیلو...... ہاں' ہاں' میں ہوں تیری نند حمیدہ' 90 چک سے بول رہی ہوں۔ اچھا چل چھڈ' مجھے پتہ ہے' تجھے زیادہ مکر کرنے کی ضرورت نہیں' یہ بتانے کے لیے ہی فون کیا ہے کہ نازیہ ہمارے پاس ہے اور

ہاں! ایک بات اور سن' کریم الدین کا فون آئے تو اسے بتا دینا' نازیہ اب یہیں رہے گی' کہیں نہیں جائے گی۔ میں اس کا نکاح کردوں گی۔'' پھوپھی نے سکندر کو موبائل پکڑایا۔ پھوپھو کی باتوں سے نازی کی ڈھارس بندھ گئی تھی۔

''کیا کہتی تھی مامی؟'' سکندر نے پوچھا۔

''کہتی تھی کہ کریم الدین اعتراض کرے گا۔ میں نے بھی اسے کہہ دیا' میں کریم کی وڈی بہن ہوں۔ وہ میرے فیصلے پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ میں جہاں چاہوں گی' نازی کا دیاہ کردوں گی۔''

اور پھر وہی ہوا جو پھوپھو نے چاہا تھا۔ ابا کو بہن کے فیصلے سے کوئی اختلاف نہیں تھا لیکن تسلیم بی بی چیں بہ چیں ہوئی تھی۔ آخر اس کے ہاتھوں سے مفت کی نوکرانی جو نکل گئی تھی۔ پھوپھو نے فوراً ہی اس کا دیاہ اپنے شادی شدہ بیٹے سکندر سے کردیا۔ اس فیصلے پر پروین روٹھ کر میکے جا بیٹھی۔ پھوپھو نے پوتے کی آس میں بیٹے کی دوسری شادی کی تھی۔ پروین کی پانچ لڑکیاں تھیں' وہ کوئی لڑکا پیدا نہ کرسکی جبکہ پھوپھو کو پوتا چاہیے تھا۔ پھوپھی نے اس جنون میں نازی اور سکندر کی عمروں کا فرق بھی بالائے طاق رکھ دیا تھا۔ سکندر اس سے پورے اٹھارہ سال بڑا تھا۔ نازیہ کے پاس پھوپھی کی بات مان لینے کے علاوہ کوئی چارہ بھی نہ تھا۔ اس نے اس خیال کے تحت یہ سب قبول کرلیا تھا کہ اسے اور منی کو تحفظ مل جائے گا اور وہ ہمیشہ کے لیے اس کے پاس رہے گی۔ یوں ایک سادہ سی شام کو پرانے کپڑوں میں اُس کا نکاح سکندر بخش سے ہوگیا۔ نہ ڈھولک بجی' نہ سرخ جوڑا اُس کے تن پہ سجا اور نہ ہی مہندی سے ہاتھ رچے۔ کسی نے سر پر شفقت سے ہاتھ بھی نہ رکھا۔ وہ ماں کو یاد کرکے دُکھی ہوگئی تھی۔

نکاح کے اگلے روز بڑا ہنگامہ ہوا۔ تسلیم بی بی' منی کو واپس لے جانے کی بات کررہی تھی اور یہ سن کر نازی کی روح تک کانپ گئی۔

''نہیں...... میں اپنی منی' اپنی گڑیا کو واپس نہیں جانے دوں گی اس دوزخ میں...... نہیں' ہرگز نہیں......''

لیکن پھوپھو کے آگے اس کی ایک نہ چلی۔ یوں بھی منی کی خوراک یہاں کم تھی۔ اس کی نشوونما ہی نہیں ہو پا رہی تھی۔ خود اس کا بھی یہی حال تھا لیکن اسے خود کی پروا کب تھی' بادلِ ناخواستہ اس نے منی کو تیار کیا اور بے طرح روتے ہوئے اسے تسلیم بی بی کے ساتھ بھیج دیا۔

وہ کتنے ہی دن مغموم رہی۔ اکثر رات کو سونے سے پہلے منی کو یاد کرکے چپکے چپکے روتی رہتی تھی۔

•......•......•......•

تسلیم بی بی' منی کو لے تو آئی تھی مگر اُس کو بے کار سمجھ کر جیسے ایک طرف پھینک دیا تھا۔ منی' نازی کو یاد کرکے روتی تو وہ اسے اور مارتی۔ گڈو اور پپو اپنی ننھی بہن کو سینے سے لگائے پھرتے۔ انہوں نے تو اسکول جانا بھی چھوڑ دیا' کہیں ہماری گڑیا کو وہ بلا نگل نہ لے......

وقت اسی طرح گزر رہا تھا۔ منی اب چار سال کی ہوگئی تھی۔ ہر چیز کو سمجھنے اور پرکھنے لگی تھی۔ اس عمر میں بچے شرارتیں کرتے ہیں' کھیلتے ہیں لیکن حالات کی ستم ظریفی نے اُس سے اُس کا بچپنا چھین لیا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں ہر وقت احساسِ محرومی اور خوف نمایاں رہتا۔ بھائی خود مار کھا لیتے لیکن اپنی گڑیا کو اپنی سوتیلی ماں کے سائے سے دور رکھتے تھے مگر ایسا کم ہی ہو پاتا۔ وہ منی کے جسم پر پڑے نیل اور آنکھوں کے نیچے لگی چوٹوں کے نشان دیکھ کر دل مسوس کر رہ جاتے اور سوچتے۔ 'کاش' نازی باجی نے منی کو اس کے ساتھ نہ آنے دیا ہوتا۔' وہ کڑھتے

رہتے۔ منی بہت کمزور اور دھان پان سی تھی۔

•......•......•......•

نازی نے حالات کے ساتھ سمجھوتہ کرنا سیکھ لیا تھا۔ وہ ہروقت گھر کے کاموں اور پروین کی بچیوں کی جی حضوری میں لگی رہتی۔ اگر اس سے ذرا سی بھی دیر یا بھول ہو جاتی تو بری طرح روئی کی طرح دھنک کر رکھ دی جاتی۔ پھوپھو کو اس کے وجود سے نہیں بلکہ اس کے اندر پلنے والے وجود سے غرض تھی۔ وہ ماں بننے جارہی تھی اور اب اپنے وجود سے ایک زندگی کو جنم دینے والی تھی۔ پھوپھی اور سکندر خوش تو تھے لیکن ساتھ ہی لڑکے والی بات بھی ذہن نشین کرا دی گئی تھی۔ نازی نے بہت کوشش کی کہ پروین کی بچیاں اُس سے مانوس ہو جائیں مگر وہ تو اس کے سائے سے بھی دور بھاگتی تھیں۔ اپنے گھر سے سسرال تک اس کے حالات میں صرف اتنا فرق تھا' ایک جہنم سے نکل کر وہ دوسرے جہنم میں آ گئی تھی۔ وہ دن بہ دن کمزور ہوتی جارہی تھی حالانکہ اس حالت میں جبکہ وہ پہلی بار ماں بننے کے عمل سے گزر رہی تھی' اس کی صحت کا خیال رکھا جانا چاہیے تھا۔ اس نے بھی اپنی پروا کرنی چھوڑ دی تھی۔

ایک روز اچانک ہی اُس کی طبیعت بگڑی تھی' فوراً دائی کو بلایا گیا اور کچھ ہی دیر میں اُس نے پیاری سی بچی کو جنم دیا۔ بچی کی پیدائش پر گھر میں گویا سب کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ پھوپھی نے طنزیہ جملوں کی بارش کر دی اور سکندر نے منہ موڑ لیا۔

•......•......•

دن پر دن گزرتے رہے' سکندر کا مزاج بگڑتا جارہا تھا۔ بچی کی پیدائش نے اُسے چڑچڑا کر دیا تھا پھر ایک دن کسی معمولی سی بات پر سکندر نے نازی کو طلاق دے دی۔ اُس کا گھروندہ بکھر گیا' وہ کتنی ہی دیر ساکت رہی' ہوش آنے پر اس کمرے میں چلی آئی جو کبھی اُس کا ہوا کرتا تھا۔ اُس نے ایک تھیلے میں اپنے اور بیٹی نیناں کے چند کپڑے رکھے اور وہاں جانے کے لیے تیار ہونے لگی جس گھر کو وہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ آئی تھی۔ فرق صرف اتنا تھا کہ اب اس کی گود میں منی نہیں' نیناں تھی۔ صحن میں کھڑی پھوپھی نے اُسے دیکھ کر رخ پھیر لیا اور نازیہ نے سر جھکا کر دہلیز پار کر لی۔

•......•......•......•

جب وہ گھر پہنچی تو بیرونی دروازہ کھلا ہوا تھا' وہ اندر چلی آئی۔ چھوٹے سے صحن میں پپو اور منی مٹی کے کھلونے بنا کر کھیل رہے تھے۔

''پپو......! منی......!'' اُس نے آواز دی تو دونوں خوش ہو کر اُس کی جانب دوڑے۔

''باجی آ گئی۔''

نازیہ نے افسردگی سے پھٹے' میلے کچیلے کپڑوں میں بے حال سے پپو اور منی کو دیکھا اور پیار کیا۔

''اماں اور گڈو کہاں ہیں؟''

اُس کے پوچھنے پہ پپو بولا۔ ''گڈو تو کام پر گیا ہے۔''

''کام پر......؟'' اُس نے حیرانی سے پپو کو دیکھا۔

''ہاں باجی......! اماں نے اُسے شہر کے ورکشاپ میں ڈال دیا ہے' وہ نہیں جاتا تھا تو اماں نے اسے مارا بھی اور پھونکنی مار کر اس کا سر بھی پھاڑ دیا تھا۔ وہ باہر بھاگ گیا' اُس کے سر سے خون بہہ رہا تھا۔ وہ تو شبیر اعوان ہے ناں' دکان والا' اُس کے بھتیجوں نے اُس کی پٹی کروا کر اُسے گھر چھوڑا تھا اور اماں تو اب رانی کو لے کر ڈاکٹر کے پاس گئی ہے۔''

''رانی......؟ کون رانی......؟'' نازی نے اچنبھے سے پوچھا اور ساتھ ہی گود میں سوئی نیناں کو

چار پائی پہ لٹایا۔

''ہماری نئی بہن ہے' تمہیں نہیں پتہ؟ ابا بھی آیا تھا۔ پھوپھو نے کہا تو اسے دکھ ہوا کہ ابا اس سے ملنے نہیں آیا۔''

''ابا واپس چلا گیا ہے کیا؟''

''ہاں' کل ہی گیا ہے۔ باجی......! پانی دوں؟'' پپو نے سمجھداری سے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ پانی کا گلاس ابھی لبوں سے لگایا ہی تھا کہ تسلیم بی بی گھر میں داخل ہوئی۔

''السلامُ علیکم! اماں......!''

''وعلیکم السلام!'' تسلیم بی بی نے بے زاری سے جواب دیا۔ ''خیر تو ہے تو کیسے آ گئی؟''

''وہ...... اماں......! مجھے سکندر نے بیٹی پیدا کرنے کے جرم میں طلاق دے دی ہے......''

''کیا......؟'' اُس کا منہ کھل گیا۔ ''اصل وجہ کچھ اور ہوگی' تیرے لچھن تو شروع سے ہی خراب تھے۔ خیر تو یہ گھر چھوڑ کر گئی تھی ناں تو پھر کیا لینے آئی ہے؟ اتنی غیرت والی تھی تو نہر میں ڈوب کر جان دے دیتی......'' نازی خاموشی سے اماں کے طنز پی گئی' اب ایسے ہی طنز اسے سننا تھے۔

اُس نے گھر کا نظام ایک بار پھر سنبھال لیا۔ تسلیم بی بی کو بھی فرصت مل گئی۔ گھریلو جھنجھٹوں سے آزاد ہو کر اس نے پرانی روش اختیار کر لی بلکہ اپنی بیٹی کی ذمہ داری بھی اس کے سر ڈال دی۔ ایک روز وہ منی کے کپڑے بدلنے لگی تو اس کے جسم پر جگہ جگہ پڑے نیل دیکھ کر حیران رہ گئی۔

''یہ کیا ہوا ہے منی؟''

''میں گر گئی تھی باجی......!'' اس کے لہجے میں موجود خوف اور آنکھیں جھوٹ کی چغلی کھا رہی تھیں۔

''تم جھوٹ بول رہی ہو ناں' اِدھر دیکھو میری طرف' تمہیں اماں مارتی تھیں ناں؟'' نازی نے اس کا چہرہ اوپر کر کے کہا تو منی کی آنکھوں میں موٹے موٹے آنسو تیرنے لگے۔

''ہاں باجی......! پتہ ہے' پپو کو بھی اماں نے گرم چمٹے سے مارا تھا۔''

''کیا......؟'' نازیہ تڑپ گئی۔ اُس نے فوراً پپو کو بازو سے پکڑ کر سامنے کیا جو چارپائی پہ بیٹھا تھا۔ اُس کی گردن پر جلنے کا نشان تھا۔ اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ اُس نے دونوں کو اپنی بانہوں میں بھر لیا۔

''میری جان! مجھے معاف کر دو' میں تم لوگوں کے لیے کچھ نہ کر سکی۔'' وہ تینوں سسک رہے تھے جبکہ آسمان اُن کی بے بسی پر خاموش تھا اور زمین اُن کے وجود کا بوجھ لیے کھڑی تھی۔

وقت تو بس گزرتا ہے اور گزرتا چلا جاتا ہے۔ انہی دنوں ابا کے رشتے کی بہن اپنے بیٹے کے لیے نازی کا رشتہ لینے چلی آئی۔ تسلیم بی بی تو راضی نہیں تھی مگر پھوپھی تاج بھی جونک کی طرح چمٹی تو رشتہ لے کر ٹلی۔ ابا نے بھی سُکھ کا سانس لیا۔ نازیہ بے شمار خدشات کا شکار تھی' ایک تو اسے مستقبل کی فکر تھی تو دوسری طرف اس کے معصوم بہن بھائی تھے جو پھر سے تسلیم بی بی کے رحم و کرم پہ ہوتے۔ وہ شادی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر ابا کے خوف سے انکار نہ کر سکی' یوں وہ طعن و تشنیع کے جہیز کے ہمراہ رخصت ہو کر اپنے دوسرے شوہر نعمان کے گھر آ گئی۔

نعمان' خوبرو اور اس کا ہم عمر تھا۔ اس نے اور اس کے گھر والوں نے کھلے دل سے نیناں کو بھی قبول کر لیا تھا' یوں تقدیر نے یکا یک اس پر خوشیوں کے در کھول دیئے تھے۔ اسے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا گیا تھا۔ وہ چند دنوں میں ہی اتنی محبتیں پا کر نہال سی ہو گئی اور خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھکتی لیکن اسے معلوم نہ تھا' یہ وقتی خوشی ہے' ابھی تقدیر نے ایک اور امتحان لینا ہے۔ اس بار جب وہ میکے گئی تو منی اور پپو کو کچھ دنوں کے لیے اپنے پاس لے آئی۔ دونوں بہن بھائی مہینہ بھر اسی کے ساتھ رہے پھر ابا اُن دونوں کو لینے آ گیا کہ تسلیم بی بی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔ نازیہ نے دونوں بہن بھائی کو گلے لگایا اور خوب پیار کر کے ابا کے ساتھ رخصت کر دیا حالانکہ اس کا دل انجانے خوف اور واہمے سے دھڑک رہا تھا۔ دونوں کو رخصت کرتے ہوئے اس کے لبوں پر یہی دُعا تھی۔

''یااللہ! تو میرے بہن بھائیوں کی حفاظت فرما۔''

اُس رات وہ سونے کے لیے لیٹی تو منی کی یاد نے اسے بے چین رکھا' تب ہی اس نے فیصلہ کر لیا کہ اپنی گڑیا رانی کو ہمیشہ کے لیے اپنے پاس لے آئے گی بلکہ اُس نے نعمان سے بھی کہا تھا جسے کوئی اعتراض نہیں تھا۔ یہ فیصلہ کر کے وہ مطمئن ہو کر سو گئی مگر تھوڑی دیر بعد ہی چیخ مار کر اٹھ بیٹھی۔ نعمان گھبرا کر اس کے پاس چلا آیا۔

''کیا ہوا نازی؟'' اس نے سہمی ہوئی نازی سے پوچھا تو وہ رو پڑی۔

''نعمان......! میری منی...... میری گڑیا...... خدا کے لیے' اسے بچا لو' وہ مار ڈالے گی اسے' وہ ڈائن ہے۔'' وہ سسک اٹھی۔ نعمان اُسے بانہوں میں بھر کر اسے تسلی دینے لگا۔

''کچھ نہیں ہوگا ناں' تم نے خواب دیکھا ہے' ہم منی کو لے آئیں گے۔ پریشان مت ہو۔'' اسے کچھ تسلی ہوئی تو خاموش ہو گئی۔ نعمان بھی سونے کے لیے لیٹ گیا اور وہ تمام رات جاگ کر اپنی بہن کے لیے دُعائیں مانگتی رہی۔

اگلی صبح نازی جاگی تو اُس کا دل گھبرا رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ رات کو اُس نے خواب بھی تو بہت برا دیکھا تھا۔ وہ دُعائیں مانگتی ہوئی کام نمٹا رہی تھی۔ ایک ایک لمحہ اس کے لیے اذیت بن کر گزر رہا تھا۔ انجانا سا خوف اُس کے اندر سرایت کر گیا تھا۔ ساس نے نازی کے چہرے کو دیکھا تو اُسے آرام کرنے کا کہہ کر خود باقی کے کام نمٹانے لگی۔

سہ پہر تین بجے اس کا موبائل بج اٹھا۔ اس کا دل واہموں اور اندیشوں میں گھر گیا۔

''ہیلو...... کون؟'' بمشکل اس کے منہ سے نکلا۔

''نازی...... نازو...... ہماری منی مر گئی......'' دوسری طرف سے ابا کی بین کرتی آواز آئی۔ اس کے ہاتھ سے موبائل چھوٹ گیا۔ وہ زمین پر بیٹھتی چلی گئی۔

''نہیں...... میری منی' میری گڑیا رانی نہیں مر سکتی...... ابا جھوٹ بولتا ہے...... وہ کیسے مر سکتی ہے......'' اس کے رونے کی آواز سن کر پھوپھی تاج دوڑی دوڑی آئیں۔ نازی' پھوپھی کے گلے لگ کر مچل اٹھی۔ ''پھوپھی......! میری گڑیا اس دنیا میں نہیں رہی...... میں مر جاؤں گی پھوپھی......! اسے کہو ناں پھوپھی......! ایسا نہ کرے۔ ابا سے کہو' ایک بار کہہ دے' یہ جھوٹ ہے۔'' وہ صدمے سے نڈھال ہو کر بے ہوش ہو گئی' ہوش آیا تو پھر سے دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔

''نہیں...... جھوٹ ہے...... میری منی نہیں مر سکتی......'' مگر یہ سچ تھا۔ منی مری نہیں تھی' اُسے قتل کیا گیا تھا اور اُسے مارنے والی کوئی اور نہیں' تسلیم بی بی تھی لیکن اس نے اقرار نہیں کیا۔ پورے گاؤں میں ایک کہرام سا برپا تھا۔ منی کی ناگفتہ بہ لاش گاؤں کے چوہدریوں' نمبرداروں اور ملکوں سے انصاف مانگ رہی تھی۔

•......•......•......•

اُس روز منی کو بہت تیز بخار تھا۔ گڈو اور پپو

دونوں کام پر ورکشاپ گئے ہوئے تھے۔ بیمار ہونے کے باوجود منی نے گھر کے تمام کام کیے تھے۔ وہ ابھی لیٹی ہی تھی کہ تسلیم بی بی نے اُسے دوبارہ چائے بنانے کا کہا۔ بیماری نے آٹھ سالہ منی کو کمزور کردیا تھا۔ اُس نے چارپائی سے اٹھنا چاہا مگر نیچے گر گئی۔ حکم عدولی پر تسلیم بی بی کی آنکھوں میں جیسے خون اتر آیا۔ اُس نے دروازے کی کنڈی چڑھائی اور منی کو گھسیٹتی ہوئی گھر کے واحد کمرے میں لے گئی۔ بھری دوپہر کا وقت تھا، گلیاں سنسان تھیں جبکہ گھر میں اس کی دو سالہ بیٹی رانی کے علاوہ کوئی نہیں تھا۔ وہ سو رہی تھی۔ اسے اپنا کام کرنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آئی۔

''مکر کرتی ہے...... کام سے جان چھڑاتی ہے...... میرے حکم کو نہیں مانتی...... دیکھنا آج میں تیرا وہ حشر کروں گی تو یاد رکھے گی تو روئے گی، تڑپے گی مگر میں تجھ پہ رحم نہیں کروں گی۔'' تسلیم بی بی نے تیز دھار چھری اُس کی آنکھوں کے سامنے نچائی۔

''خاموش...... تجھے ذبح کردوں گی...... آواز نہ نکلے......'' خوف سے منی کی چیخ حلق میں ہی گھٹ کر رہ گئی۔ وہ اس سفاک عورت کے سامنے اپنے ہاتھ جوڑنے لگی۔

''مجھے مت مارو اماں......! میں نہیں روؤں گی...... میں تیری ہر بات مانوں گی...... اللہ کا واسطہ مجھے چھوڑ دو۔''

مگر اس ظالم پر ان التجاؤں کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس نے درندگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے چھری منی کے سر میں گھونپ دی۔ خون کی گرم دھار تیزی سے نکلی اور معصوم تڑپنے لگی اور آن کی آن میں ٹھنڈی ہوگئی پھر اسے ٹھکانے لگانے کا سوچا۔ جلدی جلدی اپنے اور اُس کے خون آلود کپڑے اتار کر صاف کپڑے پہن لیے اور اُسے بھی پہنا دیئے۔ زمین پر سے خون اچھی طرح صاف کر کے چھری اور خون آلود کپڑے اپنے گھر کے ساتھ خالی پلاٹ میں چھپا دیئے۔ منی کے جسم میں ایک بھی قطرہ خون کا نہ تھا لیکن وہ نہیں جانتی تھی کہ قدرت اس کا راز افشا کردے گی۔ اس کی بیٹی نے یہ سب دیکھ لیا تھا لیکن خوف اور دہشت سے چپ تھی۔ اس نے منی کے قتل کو حادثاتی موت قرار دیا۔ کبھی کہتی، غسل خانے سے گر گئی اور کبھی کہتی، سیڑھیوں سے...... منی کی لاش پنچائیت کے سرپنچوں کے منہ پر طمانچہ تھی، وہ لوگ اچھی طرح جانتے تھے کہ اس گھر میں بچوں کے ساتھ کیسا انسانیت سوز ظلم ہورہا ہے۔ اس کے باوجود وہ خاموش تماشائی بنے رہے، کس لیے؟ صرف اس لیے کہ ان کا کسی معاملے سے کوئی تعلق نہ تھا۔ اگر تعلق نہیں تھا تو پھر یہ انصاف کے علمبردار کیوں بنے ہوئے تھے؟ گاؤں کے بااثر لوگوں نے معاملے کو دبانے کی کوشش کی مگر قدرت کو یہ منظور نہ تھا۔ پولیس تفتیش کے لیے آئی تو تسلیم بی بی کی بیٹی رانی نے آنکھوں دیکھا سچ بتا دیا۔ جانے اس ننھی سی جان میں اتنی ہمت کیسے آ گئی کہ جو اب تک ڈری ڈری سی خاموش تھی، اچانک بول پڑی مگر اس کا سگا باپ...... ہاں، سگا باپ یہ ماننے کو تیار نہیں تھا کہ منی کو تسلیم بی بی نے قتل کیا ہے۔ پولیس نے تسلیم بی بی کو گرفتار کرلیا پھر جب تھانے لے جا کر پولیس نے اپنے انداز میں پوچھا تو تسلیم بی بی نے اقبالِ جرم کرلیا اور اسے عمر قید کی سزا ہوگئی لیکن ابھی ایک عدالت باقی ہے جہاں انصاف ہوتا ہے اور جو جتنا ظلم کرتا ہے، وہاں اسے اتنی ہی سزا ملتی ہے۔ گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ نازی کو بھی صبر آ گیا ہے مگر جب بھی منی کی یاد شدت سے آتی ہے تو وہ تڑپ اٹھتی ہے۔



منزہ سہام مرزا



علامہ اقبال کی پرواز خیال

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن
نہ مالِ غنیمت، نہ کشور کشائی

قوم کو حیات بخشنے والے شہیدوں کی سوچ پر مبنی ایک دل گداز سلسلہ

پیارے ہم وطنو......! ماہِ رمضان اور پھر عید کی ڈھیروں خوشیاں مبارک۔ میری دُعا ہے کہ اس رمضان اللہ تمام پاکستانیوں کی دُعائیں قبول فرمائیں اور ہمارے پیارے وطن میں امن وامان قائم ہو جائے مگر یہ بھی سچ ہے کہ دُعا کے ساتھ ساتھ دوا بھی ضروری ہے۔ عملی قدم بھی اٹھانے ہوں گے۔ کالی بھیڑوں کو ہمیں خود اپنے درمیان سے ڈھونڈ کر باہر پھینکنا ہوگا۔ جب حالات ایسے ہو جائیں کہ طلباء کی بسوں کو بھی دھماکے سے اڑا دیا جائے، تب اپنے رَب کے حضور گڑگڑا کر معافی طلب کرنی چاہیے کیونکہ دشمن ہماری آیندہ نسل کو بھی سلامت نہیں دیکھنا چاہتا۔

مجھے یاد ہے، جب میں چھوٹا سا تھا، تب فرعون سے بہت ڈرتا تھا۔ اماں نے ہمیشہ ہر برائی کو فرعون سے منسوب کر کے ہی مجھے سمجھایا لہٰذا مجھے وہ بہت ہیبت ناک کردار لگتا تھا جس کا نام لینے سے ہی اللہ ناراض ہو جائے گا۔

آج مجھے بہت پرانا قصہ یاد آیا جب گرمیوں کی چھٹیوں میں، میں نے اُردو کی کاپی سے صفحے پھاڑ کر کشتیاں بنا ڈالی تھیں، تب اماں نے مجھے خوب پیٹا تھا۔ کھانا بھی بند کردیا تھا۔ رات جب میں بھوکا ہی سو گیا تھا، تب وہ میرے پاس آ کر چارپائی پر بیٹھ گئی تھیں اور میرا سر سہلانے لگیں۔ میں جاگے جانے پر بھی سوتا بنا پڑا رہا، تب پیار سے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔

''پتر......! کتاب دشمن فرعون ہوتا ہے۔ اچھے بچے کتابیں پھاڑا نہیں کرتے۔''

تب میں نے اماں سے کہا۔ ''اماں......! یہ فرعون کیا بہت طاقتور ہے جہاں کوئی برا کام ہوتا ہے، یہ ضرور وہاں ہوتا ہے؟ یہ کون ہے، بھوت ہے؟ سایہ ہے؟''

تب اماں نے مجھے بتایا کہ فرعون کا مطلب ہے' خدائی کا دعویٰ کرنے والا۔ فرعون مصر کا بادشاہ نہیں تھا بادشاہ سے درخواست کر کے اس نے قبرستان کا ٹھیکہ لیا تھا۔ مردے دفنانے کے پیسے لیتا تھا۔ اسی سال مصر میں پھوٹ گئی اور اس کی خوب کمائی ہوئی۔ پہلے وہ وزیر بنا اور پھر بادشاہ کے منصب پر قبضہ کر لیا۔ اس کا مشیر ہامان جو بہت ہی عیار اور مکار تھا' اس نے فرعون کو مشورہ دیا کہ اگر اپنی رعایا پر ہمیشہ حکومت چاہتے ہو تو ان کو تعلیم سے دور کر دو۔ علماء کو قید میں ڈال دو۔ جب لوگوں کے پاس تعلیم ہی نہیں ہوگی' تب وہ دین سے بھی دور ہو جائیں گے اور پھر ایسا ہی ہوا۔ اہلِ مصر بتوں کو سجدہ کرنے لگے تو پتر......! کتاب سے دوری دراصل دین سے دوری ہے اور میں تجھے آخرت کا سودا نہیں کرنے دوں گی۔"

بس اماں کی وہ بات پھر مجھے ہمیشہ یاد رہی۔ میں چاہتا ہوں' اب لوگ بھی یہ یاد رکھیں اور فرعون کی پالیسی پر عملدرآمد نہ ہونے دیں۔ اپنے طلباء اور اساتذہ کی عزت کریں۔ وہ ہمارا سرمایہ ہیں۔ ان کی سلامتی اور بقا میں اب سب کی بقا ہے۔

شہیدِ وطن



ان لوگوں کی سچی و تلخ کہانیاں جن کی زندگی سڑکوں پر سانس لیتے گزرتی ہے

سڑک کہانی

مینا



حزیں صدیقی کا خیال

یہ کاروبارِ مشیت ہے کس طرح مانوں
کسی کے گھر میں چراغاں کسی کے گھر میں سائے

روٹی پکا کر روزی حاصل کرنے والے روٹی کو ترستے ایک کردار کی سچی کہانی



"دو وقت کی روٹی کے لیے تگ و دو میں لگے ہیں۔"

"بس دال روٹی چل رہی ہے۔"

روٹی سے جڑے ایسے جملوں کو ہم برسوں سے سنتے چلے آرہے ہیں۔ روٹی ہماری زندگی کا لازمی جزو ہے۔ یہاں تک کہ سیاسی لیڈر تک روٹی کو اپنی سیاست کا حصہ بناتے ہوئے عوام کو اپنی جانب راغب کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

دوسری طرف اگر غریب کو بھی اپنی بھوک کا احساس دلانا ہوتا ہے تو وہ اپنے گلے میں روٹی باندھ کر حکومت سے احتجاج کرتا سڑک پر نظر آتا ہے۔

"دوستی دور کی اور روٹی تندور کی اچھی۔"

جیسے محاورے بھی ازراہِ مذاق جملوں میں استعمال کیے جاتے ہیں۔ بات کسی طرح سے بھی ہو، پر اس بات پر ٹھوس یقین ہے کہ روٹی کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں ہے۔ روٹی کو پیٹ کا دوزخ بھرنے کا ذریعہ بنانے والے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اپنا اور اپنے اہلِ خانہ کا پیٹ بمشکل بھر پاتے ہیں۔

روٹی اور روٹی بنانے والے کا چولی دامن کا ساتھ ہے، گاؤں، دیہات ہوں یا شہر، نان بائی کی دکان یکساں اہمیت کی حامل ہوتی ہے۔ کسی بھی نو آباد جگہ کے آباد ہوتے ہی کوئی اور کاروبار شروع ہونا ہو، سب سے پہلے نان بائی کی دکان کھل جاتی ہے جو پہلے تو علاقے کی تعمیر میں لگے مزدوروں کے پیٹ بھرنے اور بعد میں رہائشی لوگوں کی سہولت کا باعث بنتی ہے۔

گزرے وقتوں میں اکثر گھرانے آٹا گوندھ کر قریب کے ہوٹل میں تندور میں روٹیاں بنوا لیتے تھے کہ عام تصور یہ تھا کہ تندور والے آٹا بغیر چھانے استعمال کرتے ہیں یا آٹا گوندھتے وقت صفائی کا خیال نہیں رکھتے اور ان خدشات کے پیشِ نظر گھروں سے آٹا گوندھ کر تندور سے روٹیاں بنوانے کا رواج عام تھا مگر آج چھ، سات روپے کے عوض حاصل کی جانے والی ایک عدد روٹی نے دورِ حاضر کی مصروفیت اور نفسا نفسی نے لوگوں کو آٹا گوندھنے جیسے عمل سے بھی کنارہ کش کر دیا ہے۔

مگر وہ جو اس مصروفیت بھرے دور میں روٹیاں پکا کر اپنی زندگی کی گاڑی دھکیلنے میں لگے ہیں، اس تگ و دو میں ان کے ہاتھ کی پکی روٹیاں دوسروں کے دوزخ تو بھر دیتی ہیں مگر ان کے اپنے دوزخ ہنوز خالی کے خالی رہ جاتے ہیں۔ ایک خوشحال زندگی تو ایک طرف انہیں تو پیٹ بھر روٹی بھی خال خال ہی نصیب ہوتی ہے۔

محمد اللہ اور غلام محمد ایسے ہی دو کردار ہیں جو تمام دن تپتے ہوئے تندور میں روٹیاں تھاپ کر اپنی غربت بھری زندگی کی تپش کو کم کرنے میں دن رات کوشاں ہیں۔

محمد اللہ چھبیس سالہ نوجوان ہے جو کہ چمن کا رہنے والا ہے۔ اپنے شہر سے اور اہلِ خانہ سے دور کراچی جیسے مصروف شہر میں روزی روٹی کی غرض سے جلتے تندور کی آگ جھیلنے میں مصروف ہے۔

"محمد اللہ! ایک روز میں کتنی آمدنی ہو جاتی ہے؟" تندور کی گرم لپٹوں سے خود کو ہر ممکن طریقے سے دور رکھتے ہوئے میں نے اس سے پوچھا۔

"چار سو روپے بن جاتے ہیں پھر اس میں آٹا اور دوسرا سامان گھی، تیل وغیرہ کا خرچہ نکالتے ہیں اور کچھ بچت کرنے کی بھی کوشش کرتے ہیں۔"

"تو کیا کھانا ہوٹل سے نہیں لیتے؟"

"نہیں، ام لوگ صرف ہوٹل سے چائے منگواتا ہے اور دو نان اپنے لیے ڈال لیتے ہیں، یہی امارا (ہمارا) کھانا ہوتا ہے۔ ناشتا بھی امارا ایسا ہی ہوتا ہے۔"

"کتنی بچت کر کے گاؤں بھیجتے ہو؟"

"جی دس ہزار، کبھی آٹھ ہزار دو تین مہینے بعد اپنے گاؤں بھیجتے ہیں۔"

"دو تین مہینے بعد رقم بھیجتے ہو، ہر مہینے نہیں؟"

"ہر مہینے ام نہیں بھیج سکتا۔ بس کافی ہے بی بی، بچوں، ماں باپ اور ایک بہن اپنا گزر کر لیتے ہیں ان پیسوں سے۔"

"اور باقی پیسوں سے تمہارا گزارہ ہو جاتا ہے؟"

"مت پوچھو بی بی، گزارہ تو کرنا ہوتا ہے۔ ادھر سردیوں میں تو راستہ بند ہونے پر بڑی مشکل پڑ جاتی ہے، پر اللہ تعالیٰ نے ام لوگوں کو ایسا ہی بنایا ہے ہر حالات میں گزارہ کرنے والا۔"

"لالہ......! پانچ چپاتی دینا۔" ایک گاہک نے ہانک لگائی۔

"جی اچھا، غلام محمد! پانچ چپاتی۔" اور گیارہ سالہ بچہ پیڑے کو بیل کر جلدی جلدی محمد اللہ کی طرف بڑھانے لگا جو کہ انہیں پھرتی سے تندور میں تھاپنے لگا پھر روٹیاں اخبار کے ٹکڑے میں لپیٹ کر پیسے وصول لیے گئے۔

"یار، تم لوگ بھی نا، عقل نام کو نہیں۔ اب میں گھر تک ان روٹیوں کو لے کر ایسے جاؤں گا؟ ہوا لگنے سے ٹھنڈی ہو جائیں گی۔ کمانے بیٹھے ہو تو طور طریقے بھی سیکھو۔" بڑبڑاتے ہوئے وہ شخص آگے بڑھ گیا جبکہ گیارہ سالہ غلام محمد روٹی دینے اور باتیں سننے کے بعد حیرت سے جاتے شخص کو دیکھ رہا تھا۔

"اچھا، یہ بتاؤ غلام محمد، تم کہاں رہتے ہو؟"

"یہ امارے ساتھ ہی رہتا ہے۔ یہ بھی چمن کا رہنے والا ہے۔ اس کا خاندان بھی وہیں گاؤں میں امارے گھر کے پاس میں رہتا ہے۔"

"پر یہ اکیلا پریشان نہیں ہوتا اپنی فیملی سے دور رہنے پر؟ اور اس کی تنخواہ کتنی دیتے ہو؟"

"اکیلا کدھر، ام لوگ ہیں نا، امارے ساتھ رہتا ہے اور تنخواہ اس کی کھانا اور کپڑا ہے۔"

"کیا!!! اتنی محنت یہ چھوٹا بچہ کر رہا ہے، وہ بھی صرف کھانے، کپڑے پر؟"

"بی بی، ادھر ام خود مشکل سے گزارہ کرتا ہے، اس کو تنخواہ کیا دے گا اور پھر چمن میں تو کھانے، کپڑے پر بھی کوئی کام نہیں ملتا۔"

"وہ کیوں بھلا؟"

"اُدھر امارا دشمن داری بوت (بہت) ہے، اس وجہ سے کام کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"کیسی دشمنی؟"

"کوئی نہ کوئی وجہ ہو جاتی ہے پھر امارا نسل اسی دشمنی کو لے کر چلتا ہے، بس ام لوگوں کا غصہ عذاب بن جاتا ہے۔ اگر جرگہ فیصلہ کرا کے معاملہ حل کر دے تو الگ بات ہے، وہ بھی بڑی دیر بعد فیصلہ ہوتا ہے جب تک ایک دو بندے ختم ہو چکا ہوتا ہے۔ امارے نصیب کے ساتھ دشمن داری جڑا ہوتا ہے۔

اب ادھر کو لے لو، ادھر ام لوگوں کو بلاوجہ دشمنی کے ساتھ لگا دیا جاتا ہے۔ اُدھر بنارس میں اگر کوئی جھگڑا ہو، فوراً اِدھر کا لڑکا لوگ ام لوگوں کا دکان توڑ پھوڑ کرتا ہے۔ کئی روز تک ام لوگ دکان نہیں کھولتا۔ کاروبار خراب ہوتا ہے، ساتھ میں اپنا خانہ خراب الگ ہو جاتا ہے۔ اب تم خود بتاؤ، ام لوگوں کے نصیب میں دشمن داری لکھی ہے نا، چاہے قصور ہو نا ہو، زبردستی دشمن داری گلے پڑ جاتی ہے۔"

"تمہارے گھر کی عورتوں کا غصہ بھی ایسا ہی ہوتا ہو گا؟ آخر وہ بھی تو پٹھان ہوتی ہیں۔"

"نہیں بی بی، ان کی نظریں نہیں اٹھتیں ام مردوں کے سامنے۔ غصہ تو دور کی بات ہے، بہت کم اُن کا آواز سنائی دیتا ہے۔ امارے ماموں کی بی بی نے یہ کوشش کی تھی زبان چلانے کی، غصہ دکھانے کی، امارے ماموں نے اسی ٹیم (ٹائم) اس کا زبان چھری

سے کاٹ ڈالا۔ اب اس کو دیکھ کر باقی خاندان کی عورتوں نے عبرت پکڑ لیا۔''

''یہ تو بہت ظلم ہے؟''

''اب ظلم ہو یا کچھ ہو' ہمارے یہاں ایسا ہی ہوتا ہے۔''

''او لالہ......! کیا کھڑے کھڑے باتیں بنا رہا ہے؟ جلدی سے بیس کلچے بنا کر دے اور تل بھی لگا دینا۔ کل تو نے جو حرکت کی تھی نا' نان کی جگہ چپاتی دے کر' میری تو شامت آ گئی تھی۔ بیگم صاحبہ نے وہ سنائی کہ توبہ بھلی۔ آج میں اپنے سامنے کلچے بنواؤں گی تاکہ تو غلطی نہ کر سکے۔'' بنگالن ملازمہ مسلسل بولے جا رہی تھی۔

''اچھا' ادھر بیٹھ جاؤ' ابھی دیتا ہوں۔ غلام محمد تل کی بوتل اِدھر کو رکھو۔'' اور مستعدی سے محمد اللہ کلچے پر تل لگا کر تندور میں تھاپنے لگا۔ میں حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی کہ جس قوم کے مرد اپنی گھر کی عورت کو اونچی آواز میں بات کرنا پسند نہیں کرتے' وہ بھلا ایک عورت' وہ بھی کسی کی ملازمہ کی کڑوی کسیلی بک بک سن کر کیسے چپ ہے؟ اس عورت نے ساٹھ روپے محمد اللہ کی ہتھیلی پر رکھے اور بڑبڑاتی ہوئی شاپر میں کلچے رکھ کر چلتی بنی۔ میں نے چور نگاہوں سے محمد اللہ کے چہرے پر نظر ڈالی مگر وہاں غصے کی کوئی جھلک دکھائی نہ دی بلکہ وہ مسرور انداز میں روپے ٹین کے ایک ڈبے میں ڈال رہا تھا۔

''لالہ' آپ لوگوں کی رہائش کہاں پر ہے؟''

''ام لوگ اسی دکان میں رہتے ہیں۔ بھاڑے (کرایہ) کی جگہ نہیں لے سکتے۔ دکان کا ہی کرایہ بڑی مشکل سے ادا ہوتا ہے۔ رات میں شٹر گرا کر سو جاتے ہیں۔''

''گرمی میں کیسے گزارہ ہوتا ہے؟ شٹر گرانے سے تو گرمی بڑھ جاتی ہو گی؟''

''اب اِدھر گرمی' سردی دیکھیں یا اپنی جیب کو؟ بھاڑے پر الگ جگہ لے کر رہیں تو بچت نہیں ہوتا۔ جو بھی ہو' گزارہ تو کرنا پڑتا ہے نا' اب گرمی کا مہینہ شروع ہو گیا ہے۔ سارا سارا دن تندور کے آگے کھڑا رہنا عذاب سے کم نہیں مگر کیا کریں' کام تو کرنا ہی ہے نا۔''

''پانچ چپاتی پکڑا دو لالہ......!''

''لالہ......! سات کلچے مجھے بھی دو۔''

''چار روٹی مجھے پہلے پکڑا دو۔''

دیکھتے دیکھتے لوگوں کا رش بڑھنے لگا تھا۔

''او خان' جلدی کر' گرمی میں کھڑا ہونا دشوار ہو گیا ہے۔ خود تو یہیں آرام سے کھڑا ہے۔'' روٹیاں لے کر بیس روپے پکڑاتے ہوئے وہ نوجوان چڑچڑاتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

''کیا مصیبت ہے لالہ......! یہاں گرمی سے جان نکلی جا رہی ہے اور تم دیر پر دیر لگائے جا رہے ہو؟ دو ملازم اور لگا لو تاکہ کام جلدی سے نپٹ جائے۔'' پچاس کا نوٹ دیتے ہوئے دوسرے آدمی نے بھی دو باتیں سنانا اپنا فرض سمجھا۔

''یار' ان لوگوں سے کام دام ہوتا نہیں' بس دکان کھول کر بیٹھ جاتے ہیں اور ہمارے گھر والے ہمیں ان کی دکان میں روٹیاں لینے بھیج دیتے ہیں۔'' ایک نوجوان نے تقریری انداز میں دوسرے کھڑے لوگوں سے کہا جبکہ تمام باتیں جیسے محمد اللہ کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھیں' صرف اس کی نظریں گاہک سے موصول ہوتے پچاس' بیس اور دس روپے پر تھیں۔

''لالہ......! ایک بات پوچھوں گر برا نہ مانو؟''

''ضرور پوچھو۔''

''آپ لوگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ آپ لوگوں کو غصہ بہت جلد آ جاتا ہے اور پھر جو لوگ آپ سے ٹیڑھی زبان میں بات کریں پھر تو سمجھو شامت مگر مجھے اتنی دیر میں ایسا کچھ بھی نظر نہیں آیا؟''

''ابھی امارے پاس پہلے ہی بوت (بہت) پریشانی ہے۔ بچہ لوگ الگ پریشانی اٹھاتا ہے۔ گھر والے الگ پریشان ہے۔ ابھی ام غصہ کرے گا تو سب بے موت مارا جائے گا۔''

''مگر بعض گاہک تو بہت غلط رویہ اختیار کرتے ہیں' اس وقت کیا سوچتے ہو آپ؟''

''بی بی' یہ تو غلط طریقے سے بات کرنے والے کو سوچنا چاہیے کہ امارا بھی عزت ہوتا ہے۔ کام چھوٹا ہو یا بڑا' ام بھی تو محنت کر رہا ہے۔ کوئی بھیک تو نہیں مانگ رہا۔ پیسے دے کر روٹی لے کر جاتا ہے' پر پیسے دیتے وقت ایسا احسان جتاتا ہے جیسے بھیک دے کر جا رہا ہے' پر اب ام نے دھیان دینا چھوڑ دیا ہے۔ شروع میں بڑا تکلیف ہوتا تھا' پر اس کا کوئی علاج نہیں۔ ام سمجھ گیا ہے' اس شہر میں روزی کمانا ہے تو یہ سب تو برداشت کرنا ہو گا' بس اس جگہ' اسی شہر میں سب کو عادت ہے' دو باتیں اپنے سے کم حیثیت والے کو جب تک سنا نہ دیں' چین نہیں آتا۔''

''خان' دو چپاتی جلدی پکڑانا۔'' نئے گاہک کے آتے ہی میں نے واپسی کی راہ لی۔

یہ حالات سے لڑتے لوگ اپنی اور اپنے سے وابستہ افراد کی دو وقت کی روٹی کے لیے جھلستے تندور میں جتے ہیں' تندور کی گرمی میں جھلس رہے ہیں' محنت کر رہے ہیں' کیا ان کی عزتِ نفس کی کوئی اہمیت نہیں یا پھر ہم نے ان کی عزت اور غیرت کو بھی جھلستے تندور میں جھونک دیا کہ جس کا جو جی چاہے' دام کے ساتھ چار باتیں سنا کر چلتا بنے۔ سڑک کا یہ کردار جو روٹی پکا کر لوگوں کی بھوک مٹانے کا سبب بنتا ہے' اس کا اتنا حق تو ہم پر بنتا ہے کہ ہم اگر اس کی غربت دور نہیں کر سکتے تو کم از کم اس کی عزتِ نفس کو تو تندور کی نذر نہ کریں اور اسے بھی اپنے جیسا ہی ایک انسان سمجھیں۔

اعتراف

میں تیری محبت میں سرشار دیوانہ وار
چاہت کی وادی میں گھومتا رہا
تیری ترنم بھری آواز پر مدہوش ہوتا رہا
تمنا کے سرابوں میں تجھے ڈھونڈتا رہا
خوابوں کی چوکھٹ پہ تجھے دیکھتا رہا
تب نا گہاں' یہ انکشاف ہوا کہ......
ہمارے درمیان رسموں کی فصیلیں ہیں
میں نے تیری چاہت میں
قصیدے تو لکھے
مگر ان رسموں سے لڑنے کی جرأت نہیں
میں یہ اعتراف کرتا ہوں
میرے پیار میں جذبوں کا
سمندر موجزن تو ہے
مگر ان رواجوں کو بہا لے جانے والے
طوفان نہیں

پریم



سلیم فاروقی

آتشِ جنون

شاعر کا خیال

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو جب چھیڑی پیار کی لے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں جب ہم نے رقص آغاز کیا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت، اس کے دل میں انتقام کا جوالا مکھی بھڑک رہا تھا۔ قسط نمبر 6

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں' ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے' نہایت جرأت منداوراپنی عزت وانا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے...... ارسلان کچھ لاابالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لانچیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان' راشد کی لانچ پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سفر کے دوران اُن کا راشد کی لانچ پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم غنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ غنی' راشد کی لاعلمی میں اس کی لانچ کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ غنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں' اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرا کے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں منتقل کر دیا ہے۔ عمران جب

گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس' عمران کے گھر پر ریڈ کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورت حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہ ہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا' اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے نڈھال تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے' عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان' بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے..... عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں.....

عمران' تیمور سے درخواست کرتا ہے کہ وہ اس کے چھوٹے بھائی عدنان کو ملک سے باہر لے جائے۔ اسی دوران مشہدی کے ایک خاص آدمی ہاشم کی آمد ہوتی ہے۔ وہ تیمور اور عمران کو بتاتا ہے کہ اس نے مشہدی کا ساتھ چھوڑ دیا ہے' ساتھ ہی یہ اطلاع بھی دیتا ہے کہ عمران کی بہن شائستہ زندہ ہے اور مشہدی کی قید میں ہے۔ دوسری طرف بابر خان اپنے ایک نہایت ہی خاص اور خطرناک آدمی شیر خان کو ساتھیوں سمیت عمران اور تیمور وغیرہ کو اغوا کر کے لانے کے لیے بھیجتا ہے لیکن وہ لوگ عمران وغیرہ کے قابو میں آ جاتے ہیں اور ریوالور کی نال پر شیر خان' بابر خان کو یہ اطلاع دیتا ہے کہ وہ عمران وغیرہ کو لے کر آ رہا ہے۔

(اب آگے ملاحظہ کیجیے۔)

''ہم لوگ راستے میں ہیں باس......''

''اور تمہارے بقیہ ساتھی؟''

تیمور کے اشارے پر اس نے کہا۔ ''وہ اپنی گاڑی میں آ رہے ہیں۔''

''جلدی کرو' مجھے تیمور اور ارسلان سے بہت اہم مسائل پر بات چیت کرنا ہے۔''

''جی باس' بس ہم پہنچنے والے ہیں۔''

شیر علی نے جھک کر یوں ظاہر کیا جیسے وہ اپنی پنڈلی کھجا رہا ہو۔

وہ سیدھا ہوا اور اچانک ریوالور تیمور کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ شاید ریوالور اس نے پنڈلی کے ساتھ باندھ رکھا تھا پھر وہ غرا کر بولا۔ ''تم میرے نام کا مذاق اڑا رہے تھے نا' اب میں تمہیں بتاؤں گا کہ شیر علی کیا کر سکتا ہے۔'' پھر وہ پیچھے مڑ کر مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''بھیا' جو کچھ بھی تمہارا نام ہے' اپنا ریوالور پھینک دو۔ میں مرتے مرتے بھی تیمور کو مار دوں گا......''

میں نے خاموشی سے ریوالور ایک طرف ڈال دیا۔

''اپنا ریوالور میرے حوالے کرو۔'' شیر علی نے درشت لہجے میں تیمور کو حکم دیا۔

''تم جانتے ہو کہ اس کا انجام کیا ہو گا؟'' تیمور نے سرد لہجے میں کہا۔

''شیر علی کو انجام کی پروا کبھی بھی نہیں رہی۔'' اس نے غرور سے کہا۔ ''اگر انجام کی پروا ہوتی تو آج میں ہائی وے کے کنارے کوئی ڈھابہ نما ہوٹل چلا رہا ہوتا۔''

''اچھا تو تمہارا ڈھابہ تھا؟'' تیمور نے اسے باتوں میں گھمانا چاہا۔

''اب یہ بکواس بند کرو اور خاموشی سے گاڑی چلاؤ۔'' شیر علی نے حکم دیا۔

''بہت بہتر۔'' تیمور نے سعادت مندی سے کہا لیکن اس کے لہجے میں چھپا ہوا طنز شیر علی نے بھی محسوس کر لیا۔

''بہت زیادہ چہک رہے ہو۔'' وہ تپ کر بولا۔ ''ابھی ساری شوخی ہوا ہو جائے گی۔''

''یہ تو تمہیں بابر خان کے پاس جا کر معلوم ہو گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''وہ کبھی یہ پسند نہیں کرے گا کہ اس کے آدمیوں کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔'' تیمور نے کہا پھر اس نے گاڑی کی رفتار اچانک بڑھا دی اور مسلسل رفتار بڑھاتا ہی گیا۔

''آرام سے چلاؤ۔'' شیر علی غرایا۔ ''تم کیا چاہتے ہو' پولیس کی کوئی موبائل وین تیز رفتاری پر ہمیں روک لے؟''

''میں صرف باس کے پاس جلد سے جلد پہنچنا چاہتا ہوں۔'' تیمور نے جواب دیا اور گاڑی کی رفتار خوفناک حد تک بڑھا دی۔

''میں کہتا ہوں کہ اسپیڈ کم کرو۔'' شیر علی دہاڑا۔

تیمور نے عقبی آئینے میں دیکھا۔ ارسلان کی گاڑی بہت پیچھے رہ گئی تھی۔

اس نے اچانک بریک لگا دیے۔ ہائیڈرولک بریک لگنے سے گاڑی ایک دم رکی اور سڑک پر خاصی دور تک گھسٹتی چلی گئی۔

بریک لگنے سے شیر علی بری طرح ونڈ اسکرین سے ٹکرایا' خود میں بھی بہت بری طرح پسنجر سیٹ سے ٹکرایا اور سر میں اچھی خاصی چوٹ آئی۔

تیمور نے اچانک شیر علی کے ریوالور پر ہاتھ ڈال دیا جو بوکھلاہٹ میں فوراً ہی اس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ میں نے فوراً ہی اپنا دوسرا ریوالور نکال لیا کیونکہ میرا پھینکا ہوا ریوالور تو گاڑی کے دھچکے میں نہ جانے کہاں چلا گیا تھا۔ میں نے فوراً ہی ریوالور کی نال شیر علی کی کنپٹی پر رکھ دی اور درشت لہجے میں بولا۔ ''تو خود کو بہت زیادہ ہوشیار سمجھ رہا تھا۔ اب بتا' تجھے کہاں گولی ماروں؟''

شیر علی خاموشی سے گہرے گہرے سانس لیتا رہا۔

اس دوران میں تیمور نے بھی اپنا ریوالور اٹھا لیا تھا۔ اس نے ریوالور کی نال شیر علی کے کھلے ہوئے منہ میں ڈال دی اور کرخت لہجے میں بولا۔ ''دل تو چاہ رہا ہے کہ تجھے ابھی یہیں ٹھنڈا کر دوں۔ باس کو میں خود جواب دے لوں گا۔ مجھے باس کا پتا بتا۔'' اس نے ریوالور کی نال اس کے سر سے لگاتے ہوئے کہا۔

''باس...... نے کہا تھا...... کہ......''

''باس نے تجھ سے کیا کہا تھا' مجھے اس سے کوئی غرض نہیں۔'' تیمور نے کہا۔ ''مجھے بتا' اس وقت باس کہاں ہے؟''

''یہ...... تو...... میں...... نہیں بتا...... سکتا۔'' وہ اٹک اٹک کر بولا۔

''کیوں؟'' تیمور نے کہا۔ ''کیا باس کو مجھ سے بھی کوئی خطرہ ہے؟''

''یہ تو باس ہی جانے۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''ٹھیک ہے پھر مرنے کے لیے تیار ہو جا......'' تیمور نے کہا۔ ''باس کا پتا تو ان لوگوں سے بھی معلوم ہو جائے

گا جو تیرے ساتھ آئے تھے۔'' تیمور نے کہا۔ ''جلدی کرو ورنہ میرے پاس وقت نہیں ہے۔''

''باس...... اس وقت ڈیفنس سکس میں ہے' وہ علاقہ ابھی خاصہ غیر آباد ہے۔ وہاں......''

''اب صرف مجھے بتا کہ باس کہاں ہے؟''

اسی وقت ارسلان کی گاڑی ہمارے نزدیک آ کر رکی۔ اس نے پوچھا۔ ''تیمور' خیریت تو ہے؟ تم نے اتنی ایمرجنسی میں بریک کیوں لگائے؟ کیا کوئی سامنے آ گیا تھا؟''

''یہ کتے کا بچہ...... کچھ زیادہ ہی ہیرو بننے کی کوشش کر رہا تھا۔'' تیمور نے کہا پھر ارسلان سے بولا۔ ''ذرا اس کی پنڈلیوں کی تلاشی بھی لے لو۔ نعیم نے غلطی یہ کی کہ اس کی پنڈلیوں کی تلاشی نہیں لی۔ اس الو کے پٹھے نے اپنی پنڈلی پر بھی ایک ریوالور باندھ رکھا تھا۔''

ارسلان گاڑی سے اترا اور تیمور کی گاڑی کا دروازہ کھول کر شیر علی کی پنڈلیوں پر ہاتھ پھیرا تو اس کی دوسری پنڈلی سے ہلکے پھل والا ایک دوطرفہ دھار دار خنجر برآمد ہوا۔

''اب اس کے ہاتھ پیر باندھ دو۔'' تیمور نے کہا۔ ''رسی میری گاڑی کی ڈگی میں ہے۔''

ارسلان نے فوراً تیمور کی گاڑی کی ڈگی کھولی اور رسی کا ایک لچھا نکال لیا۔ اس نے بہت بے رحمی سے شیر علی کے ہاتھ پیر باندھے اور اسے سیٹ سے بھی باندھ دیا۔

''اب بتاؤ' کس طرف چلنا ہے؟'' تیمور نے شیر علی سے پوچھا۔

شیر علی راستہ بتاتا گیا اور تیمور اس طرف بڑھتا رہا۔ فیز سکس واقعی وہاں سے کافی دور تھا' وہاں ابھی زیادہ آبادی نہیں تھی' کچھ بنگلے ضرور تھے لیکن ان کے درمیان میں دو دو اور تین تین خالی پلاٹ تھے۔ کچھ بنگلوں کے اسٹرکچر نظر آ رہے تھے۔

شیر علی نے وہاں پہنچ کر ایک وسیع وعریض بنگلے کی طرف اشارہ کیا اور بولا۔ ''باس اس بنگلے میں ہے۔''

''اگر تو نے اب بھی کوئی ہوشیاری یا چالاکی دکھانے کی کوشش کی تو میں تجھے کسی بھی قیمت پر زندہ نہیں چھوڑوں گا چاہے بعد میں مجھے اس کی جتنی بھی سزا ملے۔''

''میں اب کیا چالاکی دکھاؤں گا؟'' شیر علی نے شکستہ لہجے میں کہا۔

''فرض کرو یہ بنگلہ پولیس کے کسی اعلیٰ سرکاری افسر یا کسی بیوروکریٹ کا ہوا تو؟'' تیمور نے پوچھا۔

''تو کیا؟'' میں نے کہا۔ ''تم گیٹ پر بابر خان کا نام لینا۔ اگر بنگلہ کسی اور کا ہو تو معذرت کر کے آگے بڑھ جانا۔ آگے یوں بھی مزید ویرانی ہے' وہاں شیر علی کی لاش پھینکنے میں آسانی رہے گی۔'' میں نے اسے خوف زدہ کرنے کو کہا۔

''تم بنگلے کے سامنے پہنچ کر ہارن بجاؤ۔'' شیر علی نے کہا۔ ''گیٹ تو خود بخود کھل جائے گا۔''

''بنگلے میں باس کے علاوہ کتنے آدمی ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''اب تو باس کے پاس صرف دو ہی آدمی ہوں گے۔ تین آدمیوں کو تو تمہارے آدمی لے گئے۔ چوتھا میں ہوں' اندر دو چوکیدار ہیں۔''

''ہم اس بنگلے سے کافی فاصلے پر کھڑے تھے۔ ارسلان بھی گاڑی سے اتر کر میرے پاس آ گیا تھا۔

تیمور نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے ارسلان سے کہا۔ ''میں بنگلے کے گیٹ پر جا رہا ہوں' تم اپنی گاڑی

اندر مت لانا۔ اسے ایسی جگہ پارک کر دو کہ اگر ہمیں عجلت میں وہاں سے نکلنا پڑے تو آسانی رہے۔'' یہ کہہ کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

بنگلے کے گیٹ پر دونوں طرف خاصی تیز روشنی والے گلوب نما بلب جل رہے تھے۔ بنگلہ بھی نو تعمیر شدہ تھا اور گیٹ پر کوئی نیم پلیٹ بھی نہیں تھی۔

اچانک تیمور نے کہا۔ ''میں باس کا سیل نمبر ملا رہا ہوں۔ تم اسے بتاؤ کہ تم مجھے اور ارسلان کو لے کر یہاں پہنچ چکے ہو۔''

''لیکن اس کے بدلے اگر......''

''بکواس مت کرو۔'' تیمور نے اس کے منہ پر الٹے ہاتھ کا جھانپڑ رسید کیا۔ ''جیسا میں کہہ رہا ہوں' ویسا ہی کرو۔''

اس نے جیب سے سیل فون نکالا اور نمبر ملانے سے پہلے بولا۔ ''باس سے کہنا کہ میرے سیل فون میں بیلنس ختم ہو گیا ہے اس لیے میں تیمور کے سیل فون سے بات کر رہا ہوں۔'' پھر اس نے بابر خان کا نمبر ڈائل کر دیا۔ لائن ملتے ہی اس نے سیل فون کا اسپیکر آن کر دیا۔

''ہاں تیمور' کہاں ہو تم اس وقت؟''

''میں شیر علی بول رہا ہوں باس......'' شیر علی نے کہا۔ ''میں ارسلان اور تیمور کو لے آیا ہوں اور گیٹ پر موجود

ہوں۔"

"تمہارا سیل فون کہاں گیا جو تم تیمور کے سیل فون سے بات کر رہے ہو؟"

"میرے سیل فون میں اتنا کریڈٹ نہیں ہے باس۔" شیر علی نے کہا۔

"اچھا' میں دروازہ کھلواتا ہوں۔" بابر خان نے کہا۔

تیمور نے سیل فون آف کر دیا اور شیر علی سے بولا۔ "تم ابھی اتنے ہوشیار نہیں ہو شیر علی کہ تیمور کو دھوکہ دے سکو۔ میں تو کئی برس سے مشہدی جیسے آدمی کی چالوں سے بچ رہا ہوں۔ تم مجھے ہی چکمہ دے رہے تھے؟"

"تم پتا نہیں کیا کہہ رہے ہو؟"

"بابر خان نے کہا ہوگا کہ گیٹ پر آ کر سیل فون پر مجھ سے بات کرنا ورنہ چوکیدار دروازہ نہیں کھولیں گے۔"

"تم کیسے جانتے ہو کہ باس نے یہ ہی کہا ہوگا؟"

"میں باس کے ساتھ گزشتہ کئی برس سے کام کر رہا ہوں۔ اس کے کام کرنے کے طریقے سے بھی واقف ہوں۔"

اچانک ہی گیٹ کھلا اور کسی نے ٹارچ کی روشنی گاڑی پر ڈالی۔ تیمور نے گاڑی کے ہیڈ لیمپس روشن کر دیے تھے تاکہ چوکیداروں کو شیر علی کی حالت کا علم نہ ہو۔ انہوں نے صرف شیر علی کی ایک جھلک دیکھی تھی۔ بیک سیٹ پر مجھے دیکھ کر وہ یہی سمجھے ہوں گے کہ یہ ارسلان ہے۔

گیٹ سے پورچ کا فاصلہ کافی تھا اس لیے فوری طور پہ چوکیداروں کی مداخلت کا خطرہ نہیں تھا۔ وہ گیٹ بند کر کے دوبارہ وہیں ایک چھوٹے سے کمرے میں چلے گئے تھے۔

گاڑی پورچ میں رکی تھی' وہاں برآمدے میں ایک لمبا تڑنگا اور سرخ و سفید شخص کھڑا تھا۔ اس کی عمر چالیس سے تجاوز کر چکی تھی لیکن اپنی قابلِ رشک صحت کی وجہ سے وہ اپنی عمر سے کہیں کم دکھائی دے رہا تھا۔

"یہ برآمدے میں کیا کر رہا ہے؟" تیمور نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔

میں سمجھ گیا کہ وہی بابر خان ہے۔

"خیر' دیکھا جائے گا۔" تیمور بڑبڑایا۔

تیمور گاڑی سے اترا تو وہ شخص بہت پرتپاک انداز میں تیمور سے ملا اور بولا۔ "شیر علی' اب تم بھی نیچے اتر آؤ یا میں تمہارے لیے گاڑی کا دروازہ کھولوں؟"

"شیر علی خود نیچے نہیں اتر سکتا باس۔" تیمور نے مسکرا کر کہا۔

"کیوں؟" بابر خان چونک کر بولا۔

"یہ مجھے گن پوائنٹ پر یہاں لانا چاہ رہا تھا۔ آپ تو مجھے جانتے ہیں باس' میں نے آج تک کبھی اپنی مرضی کے خلاف کہیں جانے کی کوشش نہیں کی۔"

"لیکن تم تو میرے پاس آ رہے تھے؟" بابر خان نے حیرت سے کہا۔

"میں اسی طرف آ رہا تھا۔ اس مردود نے اچانک مجھ پر ریوالور تان لیا۔"

"کیوں؟" بابر خان ابھی تک حیران تھا۔

"میں نے اس سے صرف اتنا پوچھ لیا تھا کہ تم ہو کون؟ میں نے تمہیں پہلے کبھی نہیں دیکھا۔ اب آپ ہی

بتائیے باس' ہمارے گروپ کا ایسا کون سا آدمی ہے جسے میں نہیں جانتا؟ اسے شاید اس میں اپنی سبکی محسوس ہوئی' بس اس نے آؤ دیکھا نہ تاؤ' فوراً ریوالور نکال لیا۔"

"یہ اس کی غلطی ہے۔" بابر خان نے کہا۔ "تیمور' تم تو جانتے ہو کہ عبداللہ کے بعد میں کتنی بڑی مصیبت میں پڑ گیا ہوں۔ مجھے اپنے آدمیوں پر بھی اعتماد نہیں رہا ہے۔ میں عام لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔ تنظیم کے کچھ لوگوں کا تو یہ خیال ہے کہ عبداللہ کو قتل کرنے میں میرا ہاتھ ہے۔ ایسے میں کس پر اعتبار کیا جا سکتا ہے؟ میں نے فوری طور پہ بالکل نئے لوگ ہائر کیے ہیں۔ یہ احمق اگر اس وقت بتا دیتا تو شاید بات اتنی نہ بڑھتی۔ کیا تم نے اسے زخمی کر دیا ہے؟"

"نہیں باس۔" تیمور نے کہا۔ "میرا زخمی کیا ہوا آدمی مشکل ہی سے زندہ بچتا ہے...... میں نے صرف اس کے ہاتھ پیر باندھے ہیں۔"

"اور باقی لوگ کہاں ہیں؟" بابر خان نے پوچھا۔

"وہ ارسلان کو لے کر آ رہے ہیں۔" تیمور نے اطمینان سے جواب دیا۔

"ارے' ارسلان نہیں ہے تو یہ پچھلی سیٹ پر کون ہے؟"

"یہ ارسلان کے بڑے بھائی عمران ہیں۔ انہیں بھی آپ سے اور عبداللہ سے ملنے کا بہت شوق تھا۔ اصل میں مشہدی ان کے پیچھے پڑ گیا ہے۔ عبداللہ بھائی سے تو دو ایک مرتبہ ان کی بات بھی ہوئی تھی۔ اب یہ بھی ہمارا ساتھ چاہتے ہیں تاکہ مشہدی سے بچ سکیں۔ اگر عبداللہ صاحب نہ ہوتے تو مشہدی کبھی کا انہیں قتل کرا چکا ہوتا۔"

"ہاں' میں جانتا ہوں' ان کی بہن اب بھی مشہدی کے قبضے میں ہے۔" پھر وہ بہت نرم لہجے میں بولا۔ "عمران صاحب' آپ بھی نیچے آ جائیں۔"

میں دروازہ کھول کر نیچے اتر آیا۔

"اب اسے بھی کھول دو۔" بابر خان نے شیر علی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"اسے ابھی یہیں رہنے دیں باس۔" تیمور نے چاپلوسی سے کہا۔ "اسے اپنے کیے کی کچھ تو سزا ملنی چاہیے' اس نے مجھ پہ ریوالور اٹھانے کی جرات کیسے کی؟"

"اب اس بے چارے کو معاف کر دو۔" بابر خان نے کہا۔ "اصل میں احمق آدمی کی عقل اس کے ٹخنوں میں ہوتی ہے۔" بابر خان ہنس کر بولا۔

"اس لیے یہ ریوالور اور خنجر اپنے ٹخنوں پر باندھتا ہے۔" تیمور ہنس کر بولا۔ "خیر' ابھی تو میں اسے کھولے دیتا ہوں لیکن آئندہ اس نے اس قسم کی کوئی گھٹیا حرکت کی تو میں اسے معاف نہیں کروں گا۔"

تیمور نے دروازہ کھول کر شیر علی کے ہاتھ پیر کھولے پھر اس کے دائیں ہاتھ کو خفیف سا جھٹکا دیا۔ اس کی یہ حرکت بابر خان نہیں دیکھ سکا تھا کیونکہ وہ دوسری طرف تھا۔

شیر علی کے منہ سے اذیت ناک کراہ بلند ہوئی لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ اس کا دایاں ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں جھول رہا تھا اور وہ شدید اذیت میں تھا۔

"مجھ سے زور آزمائی میں شاید اس کے ہاتھ کا کوئی جوڑ نکل گیا ہے لیکن پریشانی کی کوئی بات نہیں ہے' یہ دو چار دن میں ٹھیک ہو جائے گا۔"

''یہ ارسلان ابھی تک نہیں پہنچا؟'' بابر خان کے لہجے میں اضطراب تھا۔

''ارسلان بھی آ ہی رہا ہوگا۔ ممکن ہے' ان کی گاڑی کا کوئی ٹائر پنکچر ہو گیا ہو۔ آپ اندر تو چلیں یا ہمیں یہیں کھڑا رکھیں گے؟'' تیمور نے کہا۔

''ہاں' آؤ۔'' بابر خان نے کہا۔ ''مجھے اپنی پریشانی میں اس کا تو خیال ہی نہیں رہا۔''

اندر سے اچانک دو آدمی باہر نکلے' وہ دونوں مسلح تھے۔ میں انہیں دیکھ کر بری طرح چونک اٹھا' گویا بابر خان کے دو گارڈز اور بھی تھے۔ اس کا مطلب یہ ہی تھا کہ شیر علی نے ہم سے جھوٹ بولا تھا۔

''سب خیریت تو ہے باس؟'' ان میں سے ایک آدمی بولا۔ ''آپ کو برآمدے میں آئے ہوئے خاصی دیر ہو گئی تھی۔ ہم نے گاڑی کی آواز تو سنی تھی لیکن پھر جب آپ کافی دیر تک اندر نہیں آئے تو ہمیں پریشانی پیدا ہوئی۔''

''ارے' کوئی پریشانی کی بات نہیں ہے۔'' بابر خان نے کہا۔ ''یہ تیمور صاحب ہیں۔'' اس نے تیمور کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم نے شاید ان کا نام سنا ہوگا؟''

''انڈرورلڈ کا کوئی بھی آدمی تیمور صاحب کے نام سے ناواقف نہیں ہوگا۔ ہم نے تو ان کا بہت نام سنا ہے۔''

''کیا یہ آدمی بھی آپ نے ابھی حال ہی میں رکھے ہیں؟''

''حال میں ہی کیا' میں نے آج ہی انہیں رکھا ہے۔ میں اس وقت شدید خطرے میں ہوں تیمور! مشہدی نے مجھے دھمکی دی ہے کہ اب تو عبداللہ نہیں رہا۔ اب تم یا تو ہمارے ساتھ مل کر کام کرو یا ملک چھوڑ کر چلے جاؤ۔'' اس نے اندر کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔

وہ ہمیں ایک کشادہ اور آراستہ ڈرائنگ روم میں لے گیا اور بولا۔ ''ارسلان آ جائے تو ہم موجودہ صورت حال پر ڈسکس کریں گے۔''

''ارسلان کا انتظار مت کریں۔'' تیمور نے کہا۔ ''آپ بات چیت شروع کریں' کوئی خاص بات ہوگی تو میں ارسلان کو بتا دوں گا۔''

''ایک منٹ۔'' بابر خان نے کہا۔ ''عمران صاحب پہلی دفعہ یہاں آئے ہیں۔ میں انہیں کم سے کم کافی ہی پلا دوں۔ میں نے تو ابھی تک کوئی ملازم بھی نہیں رکھا ہے۔ ارسلان کے ساتھ جو آدمی ہیں' ان ہی میں سے ایک بہت اچھا کک بھی ہے۔ خیر' میں کافی بنا کر لاتا ہوں۔''

''باس آپ زحمت کیوں کرتے ہیں؟'' تیمور نے کہا۔ ''آپ عمران بھائی کے ساتھ بیٹھیں۔ کافی میں بنا کر لاتا ہوں' بس آپ مجھے کچن دکھا دیں۔''

''اچھا پھر میرے ساتھ آؤ۔'' بابر خان نے کہا اور تیمور کو ساتھ لے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ تھوڑی دیر بعد واپس آیا اور بولا۔ ''معاف کیجیے گا' مجھے کچھ دیر ہو گئی۔ اصل میں مجھے خود بھی کافی' چینی اور دودھ وغیرہ ڈھونڈنا پڑا۔''

''اب آپ کو اتنی بھی دیر نہیں ہوئی ہے کہ آپ مجھ سے لکھنوی انداز میں معذرت کریں۔'' میں نے ہنس کر کہا۔

''عبداللہ سے آپ کی بہت تعریف سنی تھی۔'' وہ ہنس کر بولا۔ ''وہ اکثر حیرت کرتا تھا کہ ایک صنعت کار اتنا

اچھا فائٹر کیسے ہو سکتا ہے؟''

''وہ یہ بات ارسلان کے لیے کہتے ہوں گے؟'' میں نے ہنس کر کہا۔

''نہیں' وہ آپ کی تعریف کرتے تھے۔ انہیں شاید اطلاع ملی تھی کہ آپ نے بھی ارسلان کی طرح اپنے کچھ دشمنوں کو مار بھگایا تھا۔''

''ارے' میں تو سیدھا سادہ بزنس مین ہوں۔ کالج اور یونیورسٹی کے زمانے میں ایتھلیٹ تھا۔ ہاں' خود کو فٹ رکھنے کے لیے باقاعدگی سے اب بھی جوگنگ کرتا ہوں اور جم جاتا ہوں۔''

''میں نے تو سنا تھا کہ آپ نے مارشل آرٹ کی تربیت بھی لی ہے؟'' بابر خان نے پوچھا۔

''وہ وقتی شوق تھا' بس معمولی سے دو چار داؤ پیچ سیکھ لیے تھے' اب تو شاید وہ بھی بھول چکا ہوں۔''

اچانک میرے کانوں میں کسی گاڑی کے انجن کی خفیف سی آواز آئی پھر غور کرنے پر اندازہ ہوا کہ وہ ایک نہیں بلکہ ایک سے زیادہ گاڑیاں ہیں۔''

بابر خان غور سے میری شکل دیکھ رہا تھا۔ اس نے ہنس کر کہا۔ ''شاید ارسلان آ گیا؟''

میرے ذہن میں تو خطرے کی گھنٹیاں بج رہی تھیں' میں تو جانتا تھا کہ ارسلان یوں بہ بانگ دہل نہیں آ سکتا۔

پھر مین گیٹ کھلنے کی آواز آئی اور گاڑیاں اندر آ گئیں۔ مجھے ان کے انجنوں کی آواز سے اندازہ ہوا کہ وہ دو گاڑیاں ہیں۔

میں گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔ ''یہ اس وقت کون آ گیا؟''

''پریشان نہ ہوں' ارسلان اور میرے آدمی آئے ہوں گے۔'' بابر خان نے کہا۔

اسی وقت تیمور بھاگتا ہوا آیا اور بولا۔ ''باس' شاید مشہدی کے آدمی آ گئے ہیں؟''

''مشہدی کے آدمی؟'' بابر خان نے حیرت سے پوچھا۔

''ہاں یہ دہی ہو سکتے ہیں۔ ارسلان جس گاڑی میں آ رہا تھا' وہ تو عام گاڑی تھی لیکن ان گاڑیوں میں ایک کرولا اور دوسری ڈبل کیبن پک اپ ہے۔ میں نے کچن کی کھڑکی سے دیکھا ہے۔'' اس نے پھرتی سے بابر خان کا ہاتھ پکڑا اور اسے کچن کی طرف کھینچتا ہوا بولا۔ ''ادھر آئیں باس' ہم خطرے میں ہیں۔ آپ بھی آئیے بھیا!'' اس نے مجھ سے کہا۔

میں نے سرعت سے اپنے دونوں ریوالور نکال لیے۔ میں نے اپنا دوسرا ریوالور بھی ڈھونڈ کر گاڑی سے اٹھا لیا تھا۔

تیمور کے ہاتھوں میں بھی مجھے ریوالور نظر آ رہے تھے۔ صرف بابر خان غیر مسلح تھا۔

تیمور پہلے ہمیں کچن کی طرف لے کر بھاگا پھر راستے میں اسے ایک زینہ نظر آ گیا۔ وہ بابر خان کا ہاتھ پکڑ کے اندھا دھند اس زینے پر چڑھ گیا۔ میں اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

''اگر خطرہ ہے تو مجھے اپنی گن تو لینے دو۔'' بابر خان نے کہا۔

''گن کو چھوڑیں' وہ لوگ برآمدے تک آ چکے ہوں گے۔ آپ کے دو گارڈز ان کا راستہ کب تک روکیں گے؟ اب گن لینے کا وقت نہیں ہے۔'' تیمور یہ کہتا ہوا چھت پر پہنچ گیا۔

بابر خان کسی روبوٹ کی طرح ہمارے ساتھ تھا۔ میرا خیال تھا کہ اس نے ٹیلی فون کر کے مشہدی کے آدمیوں کو یا اپنے کچھ اور ساتھیوں کو بلایا ہے۔ ممکن ہے اس نے بھی خطرے کی بو سونگھ لی ہو۔

"میرا ہاتھ تو چھوڑو۔" بابر خان نے کہا۔

"نہیں سر......" تیمور نے کہا۔ "میں جانتا ہوں کہ آپ ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر نہیں بیٹھیں گے، موقع ملتے ہی اسلحے کے لیے نیچے دوڑیں گے۔ پلیز، آپ آرام سے بیٹھیں۔ میں ان لوگوں سے نمٹ لوں گا۔" پھر اس نے چھت کے ایک سرے پر جا کر اپنے بے آواز ریوالور سے ایک فائر کیا۔ ٹھک کی ہلکی سی آواز کے ساتھ ایک کرب ناک چیخ فضا میں بلند ہوئی۔

"کیا کر رہے ہو تیمور؟" بابر خان چیخ کر بولا۔ "آنے والے ہمارے دوست بھی تو ہو سکتے ہیں؟"

"دوست اس انداز میں نہیں آتے۔" تیمور نے کہا اور ایک فائر اور کر دیا۔

اسی وقت بابر خان کو موقع مل گیا اور وہ تیزی سے یہ کہتا ہوا نیچے کی طرف بھاگا۔ "میں رائفل لے کر آتا ہوں، ریوالورز سے کام نہیں چلے گا۔"

تیمور نے وحشت میں ارد گرد کا جائزہ لیا۔ اسے بنگلے کی پشت پر سیوریج کا ایک پائپ نظر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ "بھیا! آپ سیوریج کے اس پائپ کے ذریعے نیچے اتر سکتے ہیں؟"

میں نے پائپ کا جائزہ لیا پھر بولا۔ "ہاں، میں یہاں سے نیچے اتر سکتا ہوں۔"

"تو پھر آپ نیچے اتریں، ابھی ان لوگوں کی توجہ چھت کے اس حصے کی طرف ہے جہاں سے میں نے فائرنگ کی ہے۔ بنگلے کی باؤنڈری وال زیادہ اونچی نہیں ہے۔ آپ نیچے اتر کر باؤنڈری وال پھلانگ کر باہر نکلنے کی کوشش کریں اور ارسلان سے کہیں کہ وہ گاڑی اسٹارٹ کر کے بنگلے کی پشت پر پہنچ جائے۔"

میں نے اللہ کا نام لے کر سیوریج کے اس پائپ کو پکڑا اور بہت احتیاط سے پھسلتا ہوا نیچے اتر گیا۔

اس طرف کوئی نہیں تھا۔ باؤنڈری وال وہاں سے چند قدم دور تھی۔ میں نے ایک ہی جست میں وہ فاصلہ عبور کیا اور دوسرے ہی لمحے میں لپک کر باؤنڈری وال پر چڑھ گیا۔ وہ دیوار اتنی چھوٹی بھی نہیں تھی لیکن وہاں میری ایکسرسائز کی مہارت کام آئی۔ میں نے اچھل کر باؤنڈری وال کا سرا پکڑا اور ہاتھوں کی قوت سے اپنے جسم کو اوپر کی طرف اٹھایا۔

میں دیوار پر پہنچا تو میں نے ایک آدمی کو اس طرف آتے ہوئے دیکھا۔ وہ مجھ پہ فائر کرنے ہی والا تھا لیکن پھر وہ چیخ کر فرش پہ گر گیا۔ تیمور بھی اس وقت تک باؤنڈری وال تک پہنچ چکا تھا۔ شاید اس کے بے آواز فائر سے وہ آدمی زخمی ہوا تھا یا پھر مر گیا تھا۔ میں نے دیوار پہ بیٹھے بیٹھے اسے سہارا دے کر اوپر چڑھایا۔ دوسرے ہی لمحے ہم دونوں باہر کود گئے۔

ہم سے کچھ فاصلے پر ارسلان گاڑی سمیت موجود تھا۔ ہم بہت عجلت میں گاڑی میں بیٹھے اور بس ارسلان نے فوراً ہی گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔

اسی وقت مجھے کئی فائروں کی آوازیں سنائی دیں اور کوئی چیخا۔ "وہ بھاگے جا رہے ہیں، پکڑو انہیں۔"

ارسلان نے گولی کی سی رفتار سے گاڑی وہاں سے نکالی اور مین روڈ پر آ گیا۔

"ارسلان! مجھے ڈرائیونگ سیٹ پر آنے دو۔" میں نے کہا۔

"بھیا! رکنے میں وقت ضائع ہوگا۔ وہ لوگ ہمارا پیچھا ضرور کریں گے۔"

"صرف چند سیکنڈ سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔" میں نے کہا۔

اس نے گاڑی روکی اور پھرتی سے دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میں اس دوران میں کھسک کر ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھ گیا۔ ارسلان بھی فوری طور پر پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا اور میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

وہ سڑک جگہ جگہ سے ناہموار تھی۔ سڑک کا وہ ٹکڑا ختم ہوتے ہی میں جب صاف ستھری سڑک پر پہنچا تو میں نے تیز رفتاری کے تمام ریکارڈ توڑ دیئے۔

میں ڈیفنس کی ایک ایک گلی سے واقف تھا۔ میرا بچپن اور لڑکپن ان ہی گلیوں میں گھومتے اور ڈرائیونگ کرتے گزرا تھا۔ میں نے گھر جانے کا مختصر ترین راستہ اختیار کیا تو تیمور بولا۔ "بھیا! اس وقت گھر نہ جائیں، بابر خان غصے میں پاگل ہو کر اس وقت گھر پر بھی حملہ کر سکتا ہے۔ میں اس کی نیت جانتا ہوں۔ آپ گاڑی کو محمد علی سوسائٹی کی طرف لے لیں۔"

میں نے گاڑی کا رخ محمد علی سوسائٹی کی طرف موڑ دیا۔

ہمارے پیچھے دور دور تک کسی گاڑی کا نام و نشان نہیں تھا۔ ان لوگوں نے یقیناً ہمارے پیچھے آنے کی کوشش کی ہو گی لیکن میری تیز رفتاری کا مقابلہ نہیں کر سکے ہوں گے۔

دس منٹ سے بھی کم وقت میں ہم لوگ محمد علی سوسائٹی تک پہنچ گئے۔ عام حالات میں یہ فاصلہ تیس، پینتیس منٹ سے کسی طور کم نہیں ہوتا۔ اس وقت سڑک پہ ٹریفک برائے نام تھا۔ میں نے کسی سگنل کی پروا بھی نہیں کی اور تیمور کے بتائے ہوئے بنگلے پر پہنچ کر ہی دم لیا۔

ہارن دینے پر اندر سے کسی نے جھانکا پھر تیمور کو دیکھ کر اس نے گیٹ کھول دیا۔ تیمور شاید اس لیے گاڑی سے اتر گیا تھا تاکہ اندر والے اسے دیکھ لیں۔

پورچ میں تیمور کے آدمیوں کی ڈبل کیبن پک اپ موجود تھی۔

ہم گاڑی سے اترے تو نعیم برآمدے میں آ گیا اور بولا۔ "تیمور صاحب! خیریت تو ہے؟"

"خیریت نہیں ہے یار......!" تیمور نے کہا۔ "ہم لوگوں کی زندگی ہی تھی کہ ہم وہاں سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے ورنہ ہماری لاشیں بھی نہ ملتیں۔"

"اچھا، آپ اندر چل کر اطمینان سے بیٹھیں۔ اگر وہ یہاں آئے تو منہ کی کھائیں گے۔"

"وہ یہاں نہیں آ سکتے۔" میں نے کہا۔ "میں نے اتنی تیز رفتار ڈرائیونگ کی ہے کہ وہ ہمارا سراغ لگا ہی نہیں سکتے۔"

پھر تیمور نے نعیم کو شروع سے لے کر آخر تک سب کچھ بتا دیا۔

اس وقت ایک آدمی کافی لے کر آ گیا۔ شاید ارسلان نے اس سے کافی بنانے کو کہا ہو۔ تیمور تو میرے ساتھ ہی بیٹھا تھا، مجھے بھی اس وقت کافی کی شدید طلب ہو رہی تھی۔ کافی کے ساتھ کچھ بسکٹ اور نمکو وغیرہ بھی تھی۔

کافی پینے اور کچھ کھانے کے بعد میرے جسم میں خاصی توانائی آ گئی۔ ذہن بھی سوچنے کے قابل ہو گیا۔

"میری ایک تجویز ہے۔" نعیم نے کہا تو ہم لوگ چونک کر اسے دیکھنے لگے۔

"کیسی تجویز؟" تیمور نے پوچھا۔

''وہ لوگ اب تک ہماری طرف سے بے فکر ہو گئے ہوں گے۔ ممکن ہے جو آدمی آئے تھے' وہ واپس بھی چلے گئے ہوں لیکن بابر خان وہیں ہوگا۔''

''تو پھر؟'' تیمور نے پوچھا۔

''پھر یہ کہ ہم ابھی اور اسی وقت اچانک ان پر حملہ کر کے بابر خان کو پکڑ سکتے ہیں۔''

تیمور اچھل کر کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ''تجویز تو لاجواب ہے۔ ان کے تو وہم و گمان میں نہیں ہوگا کہ ہم دوبارہ پلٹ کر حملہ کر سکتے ہیں۔ بنگلے میں ہم اسی راستے سے داخل ہوں گے جہاں سے آئے تھے۔ اب اس طرف بھی کسی کا دھیان نہیں ہوگا۔ بابر خان کے گارڈ اگر ہوئے بھی تو وہ مین گیٹ یا برآمدے میں ہوں گے۔ ہم باؤنڈری وال پھلانگ کر اس سیوریج پائپ کے ذریعے چھت پر پہنچیں گے اور بابر خان کو بے خبری میں دبوچ لیں گے۔''

''تجویز تو زبردست ہے لیکن ہمارے پاس آدمی کتنے ہیں؟''

''نعیم سمیت چار آدمی تو یہاں موجود ہیں۔ ان میں سے ایک ایک آدمی دس پر بھاری ہے پھر میں ہوں' ارسلان ہے' آپ ہیں۔ ایک آدھ آدمی کو تو میں بھی مار لوں گا۔'' تیمور نے کہا۔ ''کیا سات آدمی کافی نہیں ہیں؟''

''سات آدمی بہت ہیں۔'' ارسلان نے کہا۔ ''لیکن ہم صرف ڈبل کیبن پک اپ استعمال کریں گے۔''

''چلو پھر جلدی کرو۔'' ارسلان نے کہا۔ ''تیاری میں بھی کچھ دیر تو لگے گی۔''

''ڈبل کیبن پک اپ ہر قسم کے ساز و سامان سے تیار رہتی ہے۔ ایمرجنسی تو کسی بھی وقت پیش آ سکتی ہے۔ اس میں ریوالورز' رائفلوں کے علاوہ دو تین دستی بم اور ایک دو اسموک بم بھی ہیں۔'' پھر نعیم سے مخاطب ہوا۔ ''نعیم! تم دوسرے لوگوں کو لے کر پک اپ میں پہنچو۔ ڈرائیونگ عمران بھائی ہی کریں گے۔ میں نے آج تک ان جیسا برق رفتار ڈرائیور نہیں دیکھا۔''

''تیمور صاحب' یہ بات آپ کہہ رہے ہیں؟'' نعیم نے حیرت سے کہا پھر اس نے کسی کو آواز دی۔ ''عامر! تم لوگ پانچ منٹ کے اندر اندر تیار ہو کر باہر نکلو۔''

''ہم لوگ تو تیار ہیں نعیم بھائی!'' عامر نے جواب دیا۔

ہم فوراً ہی پک اپ میں بیٹھ گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ تیمور نے میرے حوالے کر دی اور خود پسنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔ گاڑی کے دوسرے کیبن میں نعیم اور عامر تھے' بقیہ دو آدمی گاڑی کے کھلے حصے میں تھے۔

''گاڑی کے پچھلے حصے میں مچھلی کے شکار کا سامان' کھانے کی ایک باسکٹ اور پانی کی بوتلیں ہیں تاکہ اگر پولیس روکے بھی تو ہم کہہ سکیں کہ ہم مچھلی کے شکار پر جا رہے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔

میں نے پھر گاڑی کو جیٹ فائٹر کی طرح دوڑانا شروع کر دیا۔ اس گاڑی کا انجن مضبوط اور بہت طاقتور تھا اس لیے اس کی اسپیڈ بھی زیادہ تھی۔

ہم پھر پندرہ سے سترہ منٹ کے اندر اندر اس علاقے میں پہنچ گئے جہاں سے فرار ہوئے تھے۔ میں نے کچھ فاصلے پر گاڑی کا انجن بند کر دیا اور تیمور سے کہا۔ ''اب اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ دھکا لگا کر گاڑی کو وہاں پہنچا دیں جہاں ارسلان نے گاڑی روکی تھی۔''

تیمور کے کہنے پر اس کے آدمیوں نے دھکا لگا کر گاڑی کو وہیں پہنچا دیا۔

بنگلے میں اس وقت بالکل خاموشی تھی۔

میں نے تیمور سے کہا۔ ''اپنے دو آدمیوں کو ہتھیاروں سمیت سامنے کے گیٹ کی طرف بھیج دو۔ ایک آدمی صرف گاڑی میں رہے گا' باقی دو آدمی بنگلے کے دائیں طرف رہیں گے۔ ان کے پاس ہتھیار ضرور ہوں۔''

پانچ منٹ سے بھی کم عرصے میں ان لوگوں نے گاڑی کی سیٹوں کے نیچے سے ہتھیار نکالے اور بیگز میں ڈال کر انہیں اپنی پشت پر باندھ لیا۔

''اب میں' تیمور اور ارسلان باؤنڈری وال پھلانگ کر اندر جائیں گے اور سیوریج پائپ کے ذریعے اوپر پہنچیں گے۔'' میں نے کہا۔

پھر میں نے اپنے دونوں ریوالورز چیک کیے' ارسلان کے پاس ریوالورز کے علاوہ ایک خوف ناک قسم کا خنجر بھی تھا۔ اس نے وہ خنجر شیر علی کی طرح اپنی پنڈلی سے باندھ رکھا تھا۔ ارسلان کے پاس اس کا پسندیدہ ہتھیار موٹر سائیکل کی چین کے علاوہ ریوالور بھی تھے۔

سب سے پہلے تیمور نے اچھل کر دیوار کے کنارے پکڑے اور اپنے ہاتھوں پر زور دے کر اپنے جسم کو اوپر اٹھا لیا۔ وہ دیوار پر کچھ دیر لیٹا رہا۔ پتلی دیوار پہ لیٹنا ہی جان جوکھوں کا کام ہے لیکن تیمور کو اپنا جسم بیلنس کرنا آتا تھا۔ اس نے چند لمحے وہاں کا جائزہ لیا پھر سرگوشی میں کہا۔ ''ارسلان' آؤ میرا ہاتھ پکڑ کر تم بھی اوپر آ جاؤ۔'' اس نے اپنا ہاتھ نیچے لٹکا دیا۔

ارسلان اس کے ہاتھ کا سہارا لے کر دیوار پر پہنچا اور آہستہ سے اندر اتر گیا پھر اس نے مجھے بھی اوپر کھینچ لیا۔ اندر اترتے وقت بھی ہم نے اپنے جسم کو پہلے نیچے لٹکایا پھر آہستہ سے اندر کود گئے۔

تیمور کسی چیتے کی طرح چوکنا نظر آ رہا تھا۔ اس نے اردگرد کا جائزہ لیا پھر بولا۔ ''بھیا! پہلے میں اوپر جاتا ہوں پھر آپ آئیے گا۔''

''لیکن تیمور......!'' میں نے سرگوشی میں کہا۔ ''پائپ پر چڑھنے کے لیے تو ہمیں جوتے اتارنا ہوں گے۔''

''ہاں' جوتے تو اتارنا پڑیں گے۔'' اس نے کہا اور اپنے دونوں جوتے اتار دیئے۔ اگلے سات منٹ میں ہم دونوں بھی اوپر تھے۔

جہاں ہم چڑھے تھے' اس حصے کے سامنے ایک کمرا سا بنا ہوا تھا۔ وہ غالباً کاٹھ کباڑ وغیرہ رکھنے کے کام آتا تھا کیونکہ نہ تو اس پہ پلاسٹر تھا نہ ڈھنگ کا دروازہ تھا۔

ہم محتاط انداز میں زینے کی طرف بڑھنا ہی چاہتے تھے کہ 'ٹک' کی مخصوص آواز سن کر چونک اٹھے۔ دوسرے ہی لمحے نیلی سی روشنی ہوئی پھر فوراً ہی معدوم ہو گئی۔ اوپر کوئی موجود تھا جس نے سگریٹ سلگائی تھی۔ وہ آواز لائٹر کے جلنے کی تھی' فوراً ہی مجھے ناک میں تمباکو کی بو محسوس ہوئی۔

تیمور نے سرگوشی میں کہا۔ ''اس طرف کوئی ہے۔''

پھر مجھے ایک آواز سنائی دی۔ ''یار نذیر! ایک سگریٹ مجھے بھی دے۔''

''یار' کیا مصیبت ہے' وہ حرام زادے تو بھاگ گئے' ہمارے لیے فضول میں مصیبت کھڑی کر گئے۔'' نذیر کی آواز سنائی دی۔ ''یار شاکر' تو ہی سوچ اب باس کو کیا خطرہ ہے؟''

''خطرہ ہو یا نہ ہو' یہ تو ہماری ڈیوٹی ہے پیارے......!'' شاکر نے کہا۔ ''ہم آخر تنخواہ کس بات کی لیتے

ہیں؟ وہ تو شکر کرو کہ باس کو اس افراتفری میں یہ خیال نہیں آیا کہ ہم دونوں اس وقت کہاں تھے جب وہ [illegible] زادے یہاں سے بھاگے؟''

''یار! ویسے وہ بہت ہی دلیر لوگ تھے۔ جاتے جاتے بھی باس کے دو آدمیوں کو ٹھکانے لگا دیا' تیسرا بری طرح زخمی ہے۔''

''یار! اگر باس کو اتنا ہی خطرہ محسوس ہو رہا ہے تو نیچے بھی گارڈز کی تعداد بڑھا دیتا۔''

''خطرہ وغیرہ کچھ نہیں ہے' کوئی عقل کا اندھا ہی ہوگا جو اب تک یہاں چھپا بیٹھا ہوگا اور پھر اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔''

''باس نے چوکیداروں کو بھی رائفلیں دے دی ہیں۔'' نذیر نے کہا۔

''رائفلوں سے کیا ہوگا؟'' شاکر ہنس کر بولا۔ ''وہ بے چارے سیدھے سادے لوگ ہیں' جب وہ اتنے لوگوں کے قابو میں نہیں آئے تو یہ دو چوکیدار کیا کر لیں گے؟''

تیمور نے کمرے کی اوٹ سے سر خفیف سا باہر نکال کر جھانکا اور بولا۔ ''وہ دونوں اس وقت باتوں میں گم ہیں' ان کی رائفلیں بھی دیوار کے ساتھ ٹکی ہوئی ہیں۔ ہم لوگ اچانک ان کے سر پہ پہنچ سکتے ہیں۔''

تیمور نے ایک مرتبہ پھر جھانکا اور ہمیں اشارہ کر کے ان دونوں کے سامنے پہنچ گیا۔ ''اپنی جگہ سے ہلنا بھی مت......'' تیمور نے سفاک لہجے میں کہا۔ ''ورنہ تم جانتے ہو کہ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے۔''

اس کے ساتھ ہم بھی ان کے سروں پہ جا پہنچے۔

وہ دونوں حیرت سے گم صم ہو کر ہمیں یوں دیکھ رہے تھے جیسے ہماری بجائے انہوں نے بھوت دیکھ لیے ہوں۔

تیمور نے آگے بڑھ کر ان کی رائفلیں اٹھائیں اور انگلش میں ارسلان سے بولا۔ ''ان دونوں کو کم سے کم ایک گھنٹے کے لیے ناک آؤٹ کر دو۔''

ارسلان ان کی طرف بڑھا تو ان میں سے ایک گھگھیا کر بولا۔ ''ہمیں مت مارو' تمہاری دشمنی بابر صاحب سے ہے۔ ہم تو ان کے ملازم ہیں۔''

''خاموش رہو......'' ارسلان نے سرگوشی میں کہا پھر اچانک ان دونوں کے سروں پر ریوالورز کے دستوں سے وار کیا۔ وہ بیٹھے بیٹھے ہی ایک طرف لڑھک گئے۔

ارسلان کا ہاتھ کچھ زیادہ ہی زور سے پڑ گیا تھا۔ ان دونوں کے سر پھٹ گئے اور ان سے خون بہنے لگا۔

انہیں وہیں چھوڑ کر ہم زینے کی طرف بڑھے اور پھونک پھونک کر قدم رکھتے نیچے اتر آئے۔

اب ہم جس کوریڈور میں کھڑے تھے' اس کے بائیں جانب کچن تھا اور دائیں جانب وہ ڈرائنگ روم تھا جہاں ہم بیٹھے تھے۔ وہاں کوریڈور "L" کی شکل میں گھوم رہا تھا۔

ہم بہت آہستگی سے بلی کی طرح دبے پاؤں آگے بڑھے۔ وہاں ایک طرف دو کمرے تھے اور مخالف سمت میں صرف ایک کمرا تھا۔ باقی جگہ میں بڑی سی گیلری تھی۔

اب یہ اندازہ لگانا تھا کہ بابر خان کس کمرے میں ہو سکتا ہے؟ دونوں کمروں کے دروازے بند تھے۔

میں نے ایک کمرے کا دروازہ کھولنے کی کوشش کی تو وہ نہیں کھلا' دوسرے کمرے کا دروازہ ہینڈل گھمانے پر

آسانی سے کھل گیا۔ وہ کمرا بالکل خالی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہی تھا کہ دوسرے کمرے میں بابر خان موجود ہے۔

''تم لوگ اس کمرے میں چھپ جاؤ۔ میں بابر خان کو باہر نکالتا ہوں۔''

ارسلان اور تیمور خالی کمرے میں چھپ گئے۔ میں نے بند کمرے کے دروازے پر دستک دی اور حتی الامکان شاکر کی طرح بولا۔ ''صاحب جی' دروازہ کھولو صاحب جی......''

''کیا بات ہے؟'' اندر سے بابر خان کی آواز سنائی دی۔

''وہ...... صاب جی...... نذیر کو پتا نہیں کیا ہو گیا ہے...... وہ بیٹھے بیٹھے ایک طرف گر گیا...... شاید اسے دل کا دورہ پڑا ہے صاب جی......''

دروازہ اچانک کھل گیا۔ کمرے میں زیرو پاور کا بلب روشن تھا اور میرے سامنے بابر خان کھڑا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ریوالور تھا۔

میں نے اچانک اس کے سینے پر بل کی طرح زوردار ٹکر ماری' وہ اچھل کر پیچھے گرا۔ میں نے فوراً ہی اس کے ہاتھ سے ریوالور چھین لیا۔

''کک...... کیا بات ہے عمران صاحب......؟ آپ......''

''بابر خان صاحب......'' میں نے کہا۔ ''میں آپ کو خطرے میں چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا؟ وہ مشہدی ہی کے آدمی تھے' آپ فوراً یہاں سے نکلیں' وہ لوگ دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔''

''ہاں یار' تیمور نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ مشہدی کے آدمی ہیں۔ میں نے تو انڈر گراؤنڈ واٹر ٹینک میں چھپ کر اپنی جان بچائی ہے۔''

''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آپ فوراً یہ جگہ چھوڑ دیں۔ وہ لوگ دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔ ایسا تو ایک دفعہ میرے ساتھ بھی ہو چکا ہے۔''

''تیمور کہاں ہے؟'' اس نے سوال کیا۔

''تیمور اور ارسلان میرے ساتھ ہی ہیں' ان ہی دونوں کے زور دینے پر تو میں یہاں رک گیا تھا۔ ان دونوں کے لیے آپ کی جان بہت قیمتی ہے۔ میری وجہ سے ابھی آپ کو تکلیف پہنچی' اس کے لیے معذرت۔ مجھے خطرہ تھا کہ کہیں دشمن کا آدمی سمجھ کر آپ مجھ پہ فائر نہ کر دیں۔''

اس وقت تیمور اور ارسلان کمرے میں داخل ہوئے۔ وہ دونوں شاید میری باتیں سن چکے تھے۔

تیمور نے کہا۔ ''یہاں سے نکلیں سر' وہ لوگ دوبارہ بھی آ سکتے ہیں۔ آپ کو ایک خوش خبری اور سنانا ہے۔ وہ گم شدہ فائل مجھے مل گئی ہے جس کی وجہ سے میرا باپ مارا گیا' اماں اور بہن جان سے گئیں۔''

''واقعی' تمہیں وہ فائل مل گئی ہے؟''

''یس باس۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ اب اس 'بوجھ' کو آپ اٹھائیں' میں تو تھک گیا ہوں۔''

''کہاں ہے وہ فائل؟'' بابر خان کے لہجے میں اشتیاق تھا۔

''وہ فائل میرے پاس محفوظ ہے۔'' تیمور نے کہا۔ ''لیکن پہلے آپ یہاں سے تو نکلیں' یہاں اب بھی خطرہ ہے۔''

''لیکن تم لوگ تو گاڑی میں بیٹھ کر چلے گئے تھے؟'' بابر خان نے پوچھا۔

''ہم صرف یہاں سے گئے تھے پھر میں نے گاڑی دوسرے بلاک کے ایک خالی پلاٹ میں روک دی تھی۔ میں وہاں رک کر ان لوگوں کے جانے کا انتظار کر رہا تھا۔ مجھے امید نہیں تھی باس کہ میں آپ کو زندہ دیکھ سکوں گا لیکن آپ نے ثابت کر دیا کہ آپ بھی مشہدی کے آدمیوں سے کم نہیں ہیں۔ اب چلیں، جلدی کریں، میں وہ فائل آپ کے حوالے کر دوں پھر آپ جانیں اور آپ کا کام۔''

بابر خان فائل کا نام سن کر ایسا بے چین ہو گیا کہ وہ فوراً ہی ہمارے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔

''میں ذرا کپڑے بدل لوں۔'' اس نے باتھ روم میں گھستے ہوئے کہا۔

اس کا سیل فون بیڈ پر پڑا تھا۔ میں نے اسے اٹھا کر آف کیا اور اپنی جیب میں رکھ لیا۔

بابر خان مشکل سے دو منٹ میں تیار ہو کر باہر آ گیا۔ وہ اس وقت جینز اور جیکٹ میں تھا۔

ہم گیٹ پر پہنچے تو اس کے دونوں چوکیداروں نے اسے اور ہمیں حیرانی سے دیکھا لیکن کچھ پوچھنے کی جرات نہیں ہوئی۔

تیمور نے اس سے کہہ دیا تھا کہ گاڑی لینے کی ضرورت نہیں ہے، گاڑی ہمارے پاس ہے۔

ہم لوگ باہر پہنچے تو تیمور ہم سے دانستہ کچھ پیچھے رہ گیا۔ وہ سیل فون پر اپنے آدمیوں کو ہدایت کر رہا تھا کہ تم سب لوگ گاڑی میں پہنچو۔ ہاں، ہمارے سوار ہونے کے بعد تم لوگ گاڑی کے کھلے حصے میں بیٹھنا۔

اس نے شاید اپنے کسی آدمی کو گاڑی سامنے کی طرف لانے کی ہدایت بھی دے دی تھی کیونکہ فوراً ہی گاڑی سامنے آ گئی۔

گاڑی وہاں لانے والے نے ڈرائیونگ سیٹ چھوڑ دی۔ میں نے ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی اور بابر خان کو پسنجر سیٹ پر بٹھا لیا پھر گاڑی کے عقبی کیبن میں تیمور اور ارسلان بیٹھ گئے۔ باقی لوگ خاموشی سے گاڑی کے کھلے حصے میں سوار ہو گئے۔

''ہم آخر جا کہاں رہے ہیں؟'' بابر خان نے پوچھا۔

''گلشن اقبال میں میرا ایک فلیٹ ہے، اس کا علم کسی کو بھی نہیں ہے، ہم اسی فلیٹ پر جا رہے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔ وہ اس وقت بابر خان سے سیل فون پر بات کر رہا تھا پھر اس نے میرے سیل فون پر کال کی اور کہا۔ ''عمران بھائی! گاڑی کو گلشن اقبال کے بلاک تیرہ ڈی کی طرف لے چلیں۔''

میں نے گاڑی کا رخ گلشن اقبال کی طرف موڑ دیا۔

وہاں پہنچنے کے بعد تیمور سیل فون پر ہدایت دیتا رہا اور میں اس کی بتائی ہوئی سمتوں میں مڑتا رہا۔

آخر اس نے ایک کمپلیکس کے سامنے گاڑی رکوا دی۔

پھر وہ ہم سے پہلے نیچے اترا اور بہت ادب سے بابر خان کی سائیڈ کا دروازہ کھول کر بولا۔ ''آیئے باس۔''

''یہ تم مجھے کہاں لائے ہو تیمور؟'' بابر خان نے کہا۔

''باس، یہ جگہ آپ کے شایان شان تو نہیں ہے لیکن مجبوری میں سب کچھ کرنا پڑتا ہے۔ میرے ساتھ مصیبت یہ ہے کہ میرے کئی ٹھکانے ہیں لیکن وہ سب مشہدی کے آدمیوں کی نظروں میں ہیں۔ صرف یہ فلیٹ ہی ایسا ہے جس کے بارے میں کوئی نہیں جانتا۔''

اس بلڈنگ میں لفٹ نہیں تھی لیکن تیمور کا فلیٹ سیکنڈ فلور پر تھا اس لیے ہمیں اوپر چڑھنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔

حیرت تو مجھے اس بات پر تھی کہ تیمور کے کسی بھی آدمی نے ہمارے پیچھے آنے کی زحمت نہیں کی تھی۔ شاید تیمور نے انہیں ہدایت کر دی ہو گی کہ ہمیں وہاں چھوڑنے کے بعد تم لوگ چلے جانا۔

اس کمپلیکس پر شاید کوئی کیس تھا اس لیے وہاں بلڈر نے اب تک بہت سے لوگوں کو فلیٹ کا قبضہ نہیں دیا تھا اور اس وقت بہت سے فلیٹ خالی تھے۔

ایک فلیٹ کے سامنے رک کر تیمور نے چابی نکال کر دروازہ کھولا اور ہمارے ساتھ اندر داخل ہو گیا۔

فلیٹ کا مختصر سا ڈرائنگ روم ہر قسم کے فرنیچر سے عاری تھا۔ ایک بیڈ روم میں صرف دو میٹریس پڑے تھے، ان پر تکیے بھی موجود تھے۔ تپائی پر پانی کا جگ، گلاس اور ایک وہسکی کی بوتل بھی تھی۔

''تشریف رکھیں سر۔'' تیمور نے ادب سے کہا۔

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' بابر خان درشت لہجے میں بولا۔ ''میں یہاں اس گندے میٹرس پر لیٹوں گا؟''

''سوری باس......'' تیمور نے خوشامدی لہجے میں کہا۔ ''لیکن مجبوری ہے، مجھے خاص ذرائع سے اطلاع ملی ہے کہ مشہدی ہم لوگوں پر فیصلہ کن وار کرنے والا ہے۔''

''شٹ......'' بابر خان نے کہا۔ ''مشہدی پہلے بھی کئی بار کوشش کر چکا ہے لیکن ہر بار اسے ناکامی ہوئی ہے۔''

''باس، میرے کہنے سے تھوڑی سی احتیاط کر لیں۔ میری تو جان خود خطرے میں ہے، وہ فائل آپ کے حوالے کرنا چاہتا ہوں۔''

''وہ فائل کہاں ہے؟''

''وہ میں نے بہت حفاظت سے ایک جگہ رکھی ہوئی ہے۔ میں آج ہی آپ کو وہ فائل لا دوں گا۔ آج سے میری مراد ہے کہ شام تک وہ فائل یہاں ہو گی۔''

بابر خان نے جیب میں ہاتھ ڈالا پھر جھنجلا کر بولا۔ ''شٹ...... میں اپنا سیل فون بھی گھر بھول کر آ گیا۔''

''سیل فون تو میں آپ کو کوئی بھی لا دوں گا۔'' تیمور نے کہا۔

''میرے سیل فون میں بہت سے اہم نمبر محفوظ تھے۔'' بابر خان نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا۔ ''تم ابھی کسی کو بھیج کر گھر سے میرا سیل فون منگا لو۔''

''وہاں جانا تو گویا موت کو دعوت دینا ہے باس......'' تیمور نے کہا۔ ''آپ ایسا کریں، اپنے گارڈز میں سے کسی کو کال کر کے سیل فون یہاں منگا لیں۔''

''احمقانہ باتیں مت کرو۔'' بابر خان نے کہا۔ ''کیا مجھے گارڈز کا نمبر زبانی یاد ہو گا؟''

''اچھا، میں کوشش کرتا ہوں۔'' تیمور نے کہا۔ ''میں اپنے کسی آدمی کو بھیجتا ہوں۔'' تیمور اسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔ ''آپ یہاں بیٹھیں، میں آپ کے لیے کافی یا چائے لے کر آتا ہوں۔'' تیمور نے کہا اور کمرے سے باہر آ گیا۔

اس کے پیچھے پیچھے میں بھی باہر آ گیا۔

میں نے تیمور سے پوچھا۔ ''بابر خان کو یہاں لانے کا مقصد کیا ہے؟''

''میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ میر احمد علی سوسائٹی والا ٹھکانہ دیکھے لیکن یہ مسلسل مجھ سے جھوٹ بول رہا ہے۔ اب میں اسے وہیں لے جاؤں گا اور اس سے پوچھ گچھ کروں گا۔ یہاں تو یہ کام نہیں ہو سکتا۔''

''اب بھی وہی بات ہوگی۔'' میں نے کہا۔'' کیا اب تم اسے آنکھوں پر پٹی باندھ کر لے جاؤ گے؟'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''بھیا! اس وقت میں نے سوچا تھا کہ اسے ڈبل کراس کروں گا لیکن اب میں نے کچھ اور سوچا ہے۔''

''کیا مطلب؟'' ارسلان نے پوچھا۔

''میں نے سوچا تھا کہ میں انجان بن کر اسے دھوکہ دیتا رہوں گا لیکن بابر خان بہت گھاگ آدمی ہے۔ وہ میری جان لینا چاہتا ہے۔ مشہدی نے اس سے یہ ہی کہا ہوگا کہ یا تو تیمور سے وہ فائل حاصل کر و یا پھر اسے ٹھکانے لگا دو۔ میرا خیال تھا کہ وہ مجھے اغوا کر کے مجھ پہ بدترین تشدد کریں گے لیکن وہ تو میری جان لینے کے درپے ہیں اس لیے اب میں نے سوچا ہے کہ اب بابر خان کو مزید اس دنیا میں نہیں رہنا چاہیے بلکہ میں ابھی اسے محمد علی سوسائٹی والے بنگلے میں شفٹ کرتا ہوں۔ میں اس کو اتنی اذیت دے کر ماروں گا کہ مشہدی بھی عبرت پکڑے گا۔''

تیمور کا لہجہ اتنا سفاک تھا کہ میں بھی لمحے بھر کو سکتے میں رہ گیا۔ اس وقت وہ مجھے بالکل مختلف آدمی لگ رہا تھا۔

اس نے سیل فون اٹھا کر کسی کا نمبر ملایا اور بولا۔ ''نعیم فلیٹ پر گاڑی لے آؤ' ہم بابر خان کو محمد علی سوسائٹی والے بنگلے میں شفٹ کررہے ہیں۔'' پھر وہ ارسلان سے بولا۔ ''تم جا کر کسی قریبی ہوٹل سے چائے وغیرہ لے آؤ۔ میں اس وقت تک بابر خان کو کریدنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

•......•......•

بابر خان کو محمد علی سوسائٹی والے بنگلے میں شفٹ کرنے کے لیے باہر لایا گیا تو وہ حیران سے زیادہ کچھ پریشان تھا۔ تیمور نے اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اپنی سیٹ نیچی کرلے تاکہ کوئی باہر سے اسے دیکھ نہ سکے۔

میں نے آہستہ سے کہا۔ ''اسے محمد علی سوسائٹی والے بنگلے میں لے جانے کی بجائے ہمارے بنگلے پر لے چلو۔ وہ بنگلہ تو اس نے یوں بھی دیکھا ہوا ہے' خدانخواستہ کوئی گڑ بڑ ہوئی تو ہمارا کچھ نہیں بگڑے گا' دوسری صورت میں تمہارا ایک اچھا ٹھکانہ اس کی نظروں میں آجائے گا۔'' میں بہت دھیمی آواز میں سرگوشی کررہا تھا۔

''ٹھیک ہے پھر وہیں چلتے ہیں۔'' تیمور نے کہا۔

بابر خان بیک سیٹ پر تھا اور اس کے ساتھ ہی ارسلان بیٹھا تھا۔ اس کا سر ارسلان کے زانو پر تھا۔ اس نے بے چین ہوکر پوچھا۔ ''یہ...... تم کیا کھسر پھسر کر رہے ہو؟''

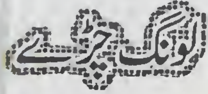
میں نے کوئی جواب دیئے بغیر ڈرائیونگ جاری رکھی اور اسے اپنے بنگلے پر لے آیا۔

وہاں پہنچ کر وہ حیران رہ گیا اور بولا۔ ''ارسلان کا گھر بھی تو مشہدی نے دیکھ رکھا ہے۔''

''اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔'' تیمور نے سرد لہجے میں کہا اور اسے ایک اندرونی کمرے کی طرف لے گیا پھر اس نے اچانک ریوالور نکال کر بابر خان کی کنپٹی پر رکھ دیا۔ ''بابر خان...... تم نے مجھ سے بہت بلف کیا ہے...... اب میری باری ہے......'' بابر خان سکتے کی سی حالت میں اسے دیکھ رہا تھا۔ اس نے تھوک نگل کر کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن اس کی آواز نہ نکلی۔

یہ پرتجسس اور سنسنی خیز داستان ابھی جاری ہے
بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں

ظہیر مرزا



لوٹنگ چڑے

شاداب صدیقی کا خیال

رہ وفا میں جنہیں میں نے معتبر جانا
فریب دیتی رہی مجھ کو دوستی ان کی

سراب کو زندگی اور محبت سمجھنے والے ایک عاشق نامراد کا احوال



زندگی ہر انسان کو الگ الگ انداز سے سبق سکھاتی ہے اور اس کے مطلب ہر انسان اپنے طور پر سمجھتا ہے۔ فرق اتنا ہے کہ کس شخص کو کس عمر میں یہ باتیں کسی خاص واقعہ سے سمجھ میں آتی ہیں پھر اسے اپنی گزاری ہوئی تمام عمر اکارت لگنے لگتی ہے۔ کس بھاگ دوڑ میں، کس رسہ کشی میں اس نے عمر گنوائی؟ اسے کس رخ پر جانا تھا، کیا حقیقت تھی، دل نے کس بات کی گواہی دی اور اس نے اس کے برعکس کیا کیا، یہ سب اسے کسی ایک لمحہ میں بالکل اچانک محسوس ہوتا ہے مگر اس وقت وہ بیتے وقت کو سوچنے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا۔

میں ایک کاروباری آدمی ہوں، ہر چیز میں نفع نقصان اچھی طرح دیکھتا ہوں۔ کبھی جذباتی ہوکر کوئی فیصلہ نہیں کرتا، کبھی موقع کو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ وقت سے پہلے مسائل حل کرنے کی سوچ رکھتا ہوں۔ ہمیشہ عقل کے فیصلہ کو دل کے فیصلوں پر ترجیح دی اسی لیے مجھے خوشی ہے کہ میں نے کبھی کوئی بڑا نقصان نہیں اٹھایا۔

میری اشتہاری کمپنی تھی اور کاروبار بہت اچھا چل رہا تھا مگر کچھ عرصہ سے کاروبار مستقل خسارے میں جا رہا تھا اور میں اس مشکل سے نکلنے کے لیے ہاتھ پیر مار رہا تھا۔ تمام بڑے لوگوں سے رابطے کر رہا تھا۔ ایسے میں شبانہ کے پاکستان آنے کی خبر میرے لیے ایسی ہی تھی، بڑی خوش آیند تھی جیسے سوکھے دھانوں میں پانی پڑ جائے۔ اس کی وجہ صرف یہ نہیں تھی کہ شبانہ میری کزن تھی اور میرا اور اس کا بچپن، لڑکپن ساتھ گزرا تھا۔ عمر کی سیڑھیاں ہم نے ساتھ طے کی تھیں بلکہ شبانہ ایک بڑے گھرانے کی بہو بھی تھی۔ اس کے سسر نے حال ہی میں ایک سیاسی پارٹی میں شمولیت اختیار کی تھی۔ وہ خود بھی بیرونِ وطن کی ایک بڑی فلاحی تنظیم سے وابستہ تھی جس کی شہرت سبھی جگہ تھی۔

شبانہ کے لیے ایک شاندار دعوت کا اہتمام کیا۔ اس کے بیٹے محب سے بھی ملاقات ہوئی۔ شبانہ اب بالکل ہی بدل گئی تھی۔ اس نے پرانی یادوں سے متعلق کوئی بات نہیں کی۔ وہ صرف اور صرف اپنی تنظیم کے حوالے سے اور شہر میں ہونے والی دیگر تقریبات کے متعلق باتیں کرتی رہی۔ محب میرے لیے میرے اپنے بچوں کی طرح تھا، اس سے مل کر لگا کہ عادت اور سوچ میں وہ بالکل شبانہ کا عکس ہے۔ محب نے بتایا کہ وہ گھر والوں کی مرضی کے برخلاف کلاسیکل میوزک سیکھ رہا ہے اور میوزک میں نام پیدا کرنا چاہتا ہے۔ شبانہ کی طرح اسے بھی شاعری، میوزک، پینٹنگ کا شوق ہے۔ لوگوں سے بے پروا اپنے خیالوں میں مگن، اس سے مل کر مجھے خوشگوار حیرت ہوئی۔

کاروبار سے متعلق میرے بہت سے کام اٹکے ہوئے تھے مگر میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اتنے عرصے بعد اس سے ملنے پر کیسے کام کہوں؟ وہ برا نہ بھی مانے، تب بھی میرے لیے وہ ایک عزت اور خلوص ہے۔ کہیں میں اسے ختم نہ کردوں۔ شبانہ سے کئی ملاقاتوں کا سلسلہ رہا مگر صرف پرانی باتوں کی حد تک گفتگو رہی۔ شبانہ نے بتایا کہ وہ کوئی کتاب لکھ رہی ہے اور اسے شائع کروانے سے متعلق کچھ کام مجھ سے کروانا چاہتی ہے۔ میں بخوشی تیار ہوگیا۔ میں نے دل ہی دل میں تہیہ کرلیا کہ میں ہر طرح سے وقت نکال کر اس کے کام ضرور کروا دوں گا۔ اسی دوران میری محب سے بھی کئی ملاقاتیں ہوتی رہیں۔

شبانہ کی زندگی کا بیتا ہوا ہر ہر پل میرے آنکھوں کے سامنے آنے لگا۔

شبانہ عمر میں مجھ سے تقریباً چار سال بڑی تھی۔ اس کی والدہ جہاں آراء میری نانی اماں کی رشتہ دار تھیں اور انہیں خالہ بی کہا کرتی تھیں۔ میری نانی کو سبھی لوگ اماں بی کہتے تھے اس لیے گھر کے بچے انہیں اماں بی کہنے لگے۔ اماں بی، شبانہ اور اس کی والدہ سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ میں نے بچپن سے ہی دیکھا کہ وہ جب بھی ہمارے گھر آیا کرتیں تھیں، سب بچوں کی اسکول کی پرانی کتابیں بستے اور کپڑے وغیرہ اماں بی انہیں دیا کرتی تھیں۔ اس کے علاوہ بھی ان کی بیماری ہاری میں بہت مدد کیا کرتی تھیں۔

بچپن میں بھی شبانہ کے روپ رنگ کا جواب نہ تھا۔ اس کی کنجی نیلی آنکھوں میں ہر وقت کوئی شرارت سی رہتی تھی۔ رنگ ایسا گورا کہ جو دیکھتا، اسے لگتا کہ اگر وہ پان بھی کھائے تو اس کی پیک گلے میں نظر آجائے۔ جہاں آراء خالہ جب بھی ہمارے گھر آیا کرتیں، میرے لیے اپنے ہاتھ کی بنی کوئی نہ کوئی چیز ضرور لاتیں۔ میرے لیے گرمبہ، کبھی اچار، کبھی لونجی، کھنڈویاں، چیلے، منگوچیاں، لونگ چڑے، پنجیری یا ملیدہ وغیرہ لاتیں۔ مجھے اُن کے ہاتھوں کے بنے لونگ چڑے بڑے مزے کے لگتے تھے۔

اماں بی ہم دونوں کو ہی بہت چاہتی تھیں اور بچپن میں اماں بی کی ہم دونوں سے محبت کر مجھے ایسا بھی لگتا کہ کہیں بڑے ہونے کے بعد اماں بی میری شادی شبانہ سے تو نہیں کردیں گی؟ مگر شعور کی منزل میں قدم رکھتے ہی بہت سے واہمات خود ہی دور ہوگئے۔ وہ بس مجھے اچھی لگتی تھی مگر شبانہ سے میرا تعلق بس اتنا تھا کہ میں اس کا بہت خیال رکھا کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ اسے کوئی تکلیف نہ پہنچے۔ میں اسے رسالے اور غزلوں کی کتابیں لاکر دیا کرتا تھا۔ اس کی آواز بھی بہت اچھی تھی۔ وہ اکثر ریڈیو پر آنے والے گانوں کو گنگنایا کرتی تھی۔ مجھے چھوٹے ہونے کے باوجود ایک بات کا بخوبی احساس تھا کہ شبانہ کا دل جس قدر نرم ہے وہ جتنا زیادہ حساس ہے اور دوسرے لوگوں کا خیال رکھتی ہے، اس سفاک دنیا میں ان کا کوئی مول نہیں ہے۔ باقی لوگ ایسے نہیں ہیں اور وہ ان سب جیسی نہیں ہوسکتی اس لیے کبھی نہ کبھی، کہیں نہ کہیں چوٹ ضرور پہنچے گی۔

شبانہ کا گھر کچی پکی اینٹوں کا ہوا تھا جس کی ٹین کی چھت موسم کے شدت کو مشکل ہی روک پاتی تھی۔ چھٹیوں میں وہ ہمارے گھر رہنے آیا کرتی تھی۔ میں شاید ساتویں کلاس میں تھا جب شبانہ کے والد کو ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ اماں بی تب سے ہی اس کی شادی کے لیے فکرمند ہوگئیں تھیں۔ انہی دنوں رضیہ خالہ بمع فیملی کے حیدرآباد سے کراچی شفٹ ہوگئیں تھیں۔ ان کے حالات بہت اچھے تھے۔ خالو کی اوپر کی آمدنی بھی تھی لیکن ان پر رشوت کا الزام ثابت ہوا تو انہیں نوکری سے نکال دیا گیا۔ ان کا بیٹا انور مجھے ٹیوشن پڑھانے آنے لگا۔

انور مجھ سے آٹھ دس برس بڑا تھا۔ اچھے ڈیل ڈول کا سانولا سا لڑکا تھا۔ اس کی پیشانی اور شانے چوڑے تھے۔ شروع میں انور سے مجھے سخت نفرت سی تھی۔ اس کی خشک باتیں میرے دماغ کھولا دیتی تھیں۔ ٹائپنگ سیکھ لو، شارٹ ہینڈ سیکھ لو، فلاں کورس کرنے سے نوکری ملنے میں آسانی ہوتی ہے، کون سے سبجیکٹس پڑھنا زیادہ فائدہ مند ہے، پڑھائی کے بعد ایل ایل بی بھی کرلینا۔ میں اس سے دور بھاگتا تھا مگر نہ جانے شبانہ اس سے کیوں اتنا متاثر تھی؟ قطرہ قطرہ پانی پتھر میں سوراخ کردیتا ہے تو پھر شبانہ کی محبت انور کو کیوں نہیں پگھلا سکتی تھی؟ اس کی محبت انور میں بھی تبدیلیاں لے آئی۔ انور مجھ سے صرف پڑھائی کی باتیں نہیں کرنے لگا، وہ کبھی کبھی مجھے آئس کریم کھلانے یا سنیما دکھانے لے جاتا، کبھی گلی میں میرے دوستوں کے ساتھ کرکٹ بھی کھیلتا، کبھی مجھے

فٹ بال وغیرہ خرید کر دے دیتا یا اپنی موٹر سائیکل چلانے کے لیے دے دیتا۔ انور میرے ذریعے شبانہ کو خط بھجوایا کرتا تھا اور کبھی کبھی بالیاں یا پازیب بھی بھجواتا تھا۔ میں اور انور 'ضرورت' کے دوست بن چکے تھے۔

شبانہ نے پہلے شعر کہنے شروع کیے' غزلیں بھی کہنی شروع کر دیں۔ انور کی وجہ سے شبانہ کی بے رنگ زندگی میں خوشی کے جگنو جگمگانے لگے۔ اس کی سج دھج انور کی پسند اور ناپسند پر منحصر ہو گئی۔ انور بھی آئندہ زندگی کے سارے خواب شبانہ کو بتانے لگا۔

رضیہ خالہ' شبانہ اور جہاں آراء خالہ سے خاصی خائف رہتی تھیں اور بات بے بات ان پر تنقید کیا کرتی تھیں۔ اپنی امارت کا رعب جھاڑا کرتی تھیں۔ دولت کے فرق کو دیکھتے ہوئے مجھے اندازہ ہونے لگا کہ وہ شبانہ کے خواب یہ کبھی پورے نہیں ہونے دیں گی اور کچھ بھی ہو جائے' انور ان کے سامنے کبھی اپنی بات کہنے کی جرات نہیں کر سکتا تھا۔ شبانہ کو بھی شاید اندازہ تو تھا مگر وہ ایسی کوئی بات ماننے کو تیار نہ تھی۔

میں اکثر چوری چھپے اس کی ڈائریاں پڑھ لیا کرتا تھا۔ اس میں کہیں کہیں کوئی شعر لکھے ہوتے۔ کبھی انور کے فرمائشی کھانوں کی ترکیب لکھی ہوتی۔ مجھے لونگ چڑے بے حد پسند تھے اس لیے میں یہ جھوٹ بول دیا کرتا تھا کہ آج انور کا دل چاہ رہا تھا کہ تمہارے ہاتھ کے بنے ہوئے لونگ چڑے کھائے اور شبانہ جھٹ لونگ چڑے بنانے کھڑی ہو جاتی۔ ایک بار شبانہ نے محبت کے بارے میں کہا تھا کہ محبت ایک محدب عدسہ کی طرح ہے جس میں ہر ہر شئے بہت زیادہ واضح نظر آتی ہے بڑی باریکیوں کے ساتھ۔ ذرا سی بھی بے اعتنائی برداشت نہیں ہو پاتی اسی لیے جسے پانے کی آرزو ہو اس سے متعلق ہر ہر شئے سے بھی اٹوٹ رشتہ سا بن جاتا ہے اور پھر ایک روز وہ شیشہ اس کے ہاتھوں سے گر کر ٹوٹ گیا۔

رضیہ خالہ' انور کے لیے کسی ایسے گھر کی لڑکی تلاش کر رہی تھیں جو اسے کاروبار کروا دیں یا پھر اسے ملک سے باہر بھجوا دیں۔ ایسے میں ان کی نگاہ شبانہ پر کہاں ٹھہرتی۔ بی اماں نے جب شبانہ اور انور کے رشتے کی بات چلانا چاہی تو رضیہ خالہ نے نہ صرف ہم سب سے ملنا جلنا کم کر دیا بلکہ انور کو بھی لگام دی۔ شبانہ کے شب و روز آنسوؤں میں بھیگنے لگے۔ ان سب لوگوں کے سامنے شبانہ کی محبت کھوٹے سکے جیسی کیوں ہے' مجھے اس کا جواب نہ مل سکا۔ انور کی شادی ایک ایسی ہی لڑکی سے ہوئی جس کے جہیز نے رضیہ خالہ کا گھر بھر دیا۔ کچھ عرصہ بعد شبانہ ہمارے گھر سے واپس چلی گئی اور اس کے بعد کبھی ہمارے گھر نہیں آئی۔ میں نے گھر میں سب سے سنا کہ بیمار سی رہنے لگی ہے۔ کسی نے کہا' سایہ ہے' کسی نے کہا' پیٹ کی بیماری ہے اور کئی ڈاکٹروں سے علاج کروایا گیا لیکن کوئی فائدہ نہ ہوا۔ مجھے سب کچھ عجیب سا لگ رہا تھا۔ میں سب کچھ جانتے بوجھتے بھی ان جانا بنا پھر رہا تھا' کچھ کر نہیں سکتا تھا لیکن سوچتا ضرور تھا کہ زمانے سے ٹکرانے پر محبت کی رہ گزر میں شکست کیا انہی کی ہوتی ہے جن کے پاؤں ننگے ہوں؟ آخر زردار ہی ہر جگہ کیسے کامیاب ہو جاتا ہے؟ کبھی انور پر شدید غصہ آتا تھا پھر سنا کہ اماں بی کے ایک ملنے والے جج صاحب اماں بی سے ملنے آئے۔ اماں بی بڑی بیمار تھیں۔ ان جج صاحب کے گھر سے ان کے وکیل بیٹے اسد سے شبانہ کا رشتہ طے ہوا۔ شادی کی گہما گہمی سے فرصت ملی کہ اماں بی کی طبیعت خراب ہوئی اور آناً فاناً ان کا انتقال ہو گیا۔

شبانہ کے بارے میں کبھی کبھار کوئی خیر خبر رشتہ داروں سے مل جایا کرتی تھی۔ اس نے شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی دوبارہ پڑھائی شروع کر دی تھی اور

بعد میں اس نے ایل ایل بی بھی کر لیا تھا۔ شاید پریکٹس نہیں کی تھی لیکن وہ بیرون وطن مقیم ہو گئی تھی۔ وقت اپنی برق رفتاری سے گزرتا گیا۔ شبانہ نے سمندر پار پاکستانیوں سے وابستہ کسی فلاحی تنظیم کے لیے کام کرنا شروع کر دیا خصوصاً خواتین کو درپیش آنے والے مسائل کے حل کے لیے اس تنظیم کا نام بہت مشہور تھا۔

پھر بھی اتنی فرصت بھی نہیں ملی کہ اس سے کوئی رابطہ کر سکوں۔ اپنے سو طرح کے جھمیلے تھے زندگی کے۔ کئی جگہ ملازمتیں کیں۔ ایک ایڈورٹائزنگ ایجنسی کو جوائن کیا۔ ایک ادارے میں پی آر او کی حیثیت سے کام کیا۔ اس کے بعد اپنی ایک چھوٹی سی ایڈورٹائزنگ ایجنسی کھولی۔

شبانہ سے ملنا میری کاروباری ضروریات کے لیے بے حد سود مند تھا اور اسی لیے میں اس سے ملنے کے لیے بے تاب بھی تھا مگر اس سے مل کر مجھے ایسا لگا کہ کسی اور سے مل رہا ہوں۔ اس کے انداز و اطوار سب بدل گئے تھے۔ اس کا خوش ہونا' ہنسنا' گھلنا ملنا کچھ بھی اس جیسا نہ تھا۔ جس نخوت اور ٹھسے سے کاروباری ذہن والی پروفیشنل خواتین اپنی بڑی بڑی گاڑیوں سے نکلتی ہیں اور جتنی مصروف نظر آیا کرتی ہیں' شبانہ بھی بالکل ویسی ہی لگ رہی تھی۔ یوں لگا جیسے وہ کوئی دوسری ہی شخصیت ہو۔ اس کے سامنے میں اس میں اور اپنے آپ میں ایک بڑا طبقاتی فرق دیکھ رہا تھا اس لیے میں نے ان عمومی باتوں پر کوئی توجہ نہیں دی بلکہ میرا ذہن پوری مستعدی سے صرف انہی سوچوں میں تھا کہ کسی طرح یہ معلوم ہو سکے کہ اس کی دلچسپیاں اب کس چیز میں ہیں؟ کب اور کہاں ایک شاندار سا ڈنر رکھا جائے وغیرہ۔

بعد میں مجھے ایک آدھ بار خیال بھی آیا کہ زمانہ انسان کو بدل دیتا ہے۔ شبانہ جو زندگی کو ایک حسین وادی اور خود کو ایک شہزادی سمجھتی تھی۔ ہر چیز میں وہ حسن تلاش کرتی تھی۔ ہر چیز سے خوشی کشید کرتی تھی۔ اس کی دنیا کے سارے رنگ اس کے اپنے تھے لیکن اب اس نے دنیا کے سارے رنگ اپنے اوپر اوڑھ لیے تھے لیکن محب سے مل کر میرا دل واقعی بہت خوش ہوا۔ وہ قلندر صفت سا لگا۔ دنیا کو حقیقتاً سمجھنے والا۔ اپنے دل کی آواز پر سب کچھ لٹا دینے والا اور خوشی کے اصل معنی کو سمجھنے والا لیکن لوگ اس سے بھی ناخوش تھے۔ محب نے بتایا کہ وہ فوٹوگرافی بھی سیکھ رہا ہے اور صوفی ازم پر کچھ کام بھی کر رہا ہے اسی لیے آج کل مزارات پر اور عرس وغیرہ میں جا کر وہاں تصاویر بنا رہا ہے۔ اس کے ساتھ اس کی دوست صوفیہ بھی گئی ہوئی ہے جو خود بھی آرٹسٹ ہے اور ایک آرٹ اسکول میں پڑھا رہی ہے۔

فن کے حوالے سے بھی محب سے گفتگو ہوتی تو میں سوچتا کہ اسے سن کر لوگ کہیں کفر کے فتوے نہ لگا دیں۔ محبت کے بارے میں بھی محب کی سوچ عام لوگوں کی طرح سطحی سی نہیں تھی۔ شاید اس کی محبت نے اس کی ذات کو مکمل کر دیا تھا۔ اس نے جو غزلیں لکھیں' انہیں کمپوز بھی خود ہی کرنا شروع کیا تھا۔ وہ اکثر فقیروں' ملنگوں کے درمیان بیٹھا باتیں کرتا رہتا۔ کبھی کہیں رستے میں غریب بچے مل جاتے تو انہیں جھولوں کی سیر کرواتا' آئس کریم کھلاتا حتیٰ کہ اگر کہیں زخمی کتے' بلیاں مل جاتے تو ان کا علاج کرواتا اور چھوڑ دیتا۔ اس نے ایک روز بلند قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا کہ اکثر ملنے والے اسے مشورہ دیتے ہیں کہ اگر اسے ایسے ہی فلاحی کام کرنے کا شوق ہے تو اکثر شوبز کی شخصیات فنڈز جمع کر رہی ہیں' ان کو یکمشت بڑی رقم دے دے تاکہ فلاحی کام بھی ہو جائے اور لوگوں میں اس کا نام بھی ہو جائے تاکہ کوئی فائدہ ہو۔ اس طرح پیسہ برباد کرنے سے

کیا حاصل ہوگا؟ میں ان کو کوئی جواب نہیں دے سکتا۔

مجھے اس کی باتوں میں بہت مزا آیا۔ نوجوانی کے دنوں میں مجھے بھی ان سب چیزوں میں بڑی دلچسپی تھی اور مجھے معلوم تھا کہ آرٹ' شاعری' ادب وغیرہ انسان کے اندر کی دنیا کو بہت پر بہار کردیتے ہیں مگر سچ بات شاید یہ ہے کہ میرا دل سچی خوشیوں کے حصول سے زیادہ آسائشوں کے حصول کی طرف مائل تھا۔ میں زندگی میں ایک کامیاب انسان بننا چاہتا تھا۔ زندگی کی دوڑ میں کسی سے پیچھے نہیں رہ جانا چاہتا تھا لیکن ایک عمر گزارنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ 'کامیابی' جیسے لفظ کے معنی بھی سمجھنے میں ہی ناکام رہا تھا۔

چند ہی روز میں' میں نے محسوس کرلیا کہ شبانہ اور محبّ کے تعلقات بہتر نہیں ہیں خصوصاً صوفیہ کے ذکر پر شبانہ کے اپنے تاثرات کچھ ناگوار سے ہوتے تھے۔ ایک روز محبّ نے صوفیہ کے بارے میں بات کرتے ہوئے بتایا کہ اس کی دوستی بھی بہت سی لڑکیوں سے ہے۔ کافی کافی دیر باتیں کیا کرتا ہے مگر اسے ان میں کبھی بھی وہ کشش محسوس نہ ہوئی کہ جو صوفیہ میں تھی۔

صوفیہ ہر لحاظ سے بہت اچھی تھی اور بڑی آرٹسٹک اپروچ رکھتی تھی مگر ایک بات میرے لیے بڑی حیران کن تھی کہ صوفیہ اپنی بڑی بہن اور بہنوئی کے ساتھ ایک متوسط سے علاقے میں رہتی تھی۔ بچپن میں ہی صوفیہ کے ماں باپ کا انتقال ہوچکا ہے۔

میں نے اسی لمحے دل میں صوفیہ سے ملنے کی ٹھان لی اور کچھ دنوں میں ہی ایسا اتفاق ہوا کہ اس سے ملاقات کی صورت بھی نکل آئی۔ صوفیہ سے ملنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ اس کی شخصیت میں کوئی تو بات ہے جو اس سے ملنے کے بعد بھی آدمی اس کے سحر سے نکل نہیں پاتا۔ اسے دیکھنے کے بعد ایسا نہیں لگتا تھا کہ اس کی زندگی میں اتنے بڑے دکھ بھی موجود ہیں۔ محبّ نے لڑکی میں ایسا کیا دیکھا' معلوم نہیں مگر مجھے تو لگا کہ اس کی ذات کا غم کہیں نہ کہیں اس کے نقوش میں بھی گھل مل سا گیا تھا۔ وہ واقعی سب سے جدا تھی۔ صوفیہ سانولی سلونی سی رنگ والی لڑکی بہت ہنس مکھ سی تھی۔ اس کی آواز میں ہنسک تھا۔ وہ دھیمے دھیمے خواب ناک انداز میں اپنی پینٹنگز کے بارے میں بات کررہی تھی۔ اس کا پہناوا بھی سب سے جدا تھا۔ کبھی کبھی وہ کسی پارٹی میں جہاں دوسری خواتین بیش قیمت زرق برق لباس میں ہوتی تھیں۔ وہ اپنے ہاتھ سے کھڈی پر بنائے ہوئے کپڑے پر سوسی' ٹاٹ یا اجرک وغیرہ کے paches سے اسے ایسا منفرد بنادیتی کہ ہر دیکھنے والا حیران سا رہ جاتا۔

''ایک حُسن چہرہ' دس حُسن کپڑا' سو حسن زیور' ہزار حسن نخرہ۔' یہ بات میں نے بہت عرصہ پہلے سنی تھی مگر قائل آج ہوگیا ہوں۔'' میری تعریف پر وہ شرما کے ہنس دی۔ مجھے اس سے مل کر اچھا لگا۔

صوفیہ سے گفتگو کرکے اندازہ ہوا کہ اس کی سوچ بھی محبّ سے کچھ زیادہ مختلف نہ تھی البتہ اس کی بڑی بہن ان سب باتوں کو فضول سمجھتی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ صوفیہ بھی کسی ڈھنگ کے سبجیکٹ میں تعلیم حاصل کرے اور اپنی زندگی بہتر بنائے مگر بہتر زندگی کا ہر شخص کے پاس اپنا ایک الگ فلسفہ ہوتا ہے۔ صوفیہ کا کہنا تھا کہ وہ جیسے جینا چاہتی ہے' اس سے مختلف زندگی گزار کر وہ خوش نہیں رہ سکے گی۔ مادی آسائشیں صرف جسم کے آرام و سکون کے لیے ہوسکتی ہیں' آرٹ سے اس کی روح کا رشتہ ہے۔

مجھے ان دنوں اپنی گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے

زندگی شدید تلخ لگنے لگی تھی۔ آئے دن میری بیوی عذرا مجھے طعنے دیا کرتی تھی کہ میں نے اس کے بھائیوں کی کمائی کو برباد کردیا ہے۔ قرضے میں بال بال جکڑا ہوا تھا' مزید قرض لینے کی گنجائش نہ تھی اور شدید مقابلے کے رجحان میں کم سے کم انٹرسٹ پر کام کرنا بھی محال تھا۔ تنگ آ کر میں نے عذرا کو علیحدگی کی بھی دھمکی دی۔ ان حالات میں یہ حربہ بھی بے اثر ثابت ہوا۔ میں مزید کسی نقصان کو برداشت نہیں کرسکتا تھا اور میرے سسرال والے ایک ہی رٹ لگائے ہوئے تھے کہ کاروبار چھوڑ دوں اور کسی ادارے میں ملازمت کرلوں۔ میں سوچتا تھا کہ اگر مجھے کچھ مہلت مل جائے' کچھ سرمایہ مل جائے تو کم سے کم وقت میں بھی اپنے کاروبار کو دوبارہ سے سہارا دے سکوں مگر کوئی ایسی صورت نظر نہیں آرہی تھی۔

پھر ایک روز شبانہ نے بہت اچھے موڈ میں مجھے فون کیا اور بتایا کہ اس نے محبّ کے لیے اپنے ایک عزیز دوست کی بیٹی روحا کو پسند کیا ہے۔ روحا ہر لحاظ سے بہت اچھی تھی۔ روحا کیمسٹری میں ایم فل کررہی تھی۔ ان کا لیدر کا امپورٹ ایکسپورٹ کا بزنس تھا۔ شبانہ کا خیال تھا کہ دونوں بچوں کو شادی کے بعد باہر سیٹل کردے لیکن محبّ اس پر بالکل رضامند نہیں ہوا۔

ایسے میں میری نگاہ بار بار شبانہ کی جانب اٹھتی۔ ایک امید سی بندھتی مگر ایک حجاب سا آجاتا تھا جو مجھے روک لیتا تھا۔

شبانہ نے ایک روز مجھ سے محبّ کے حوالے سے بات کی۔ وہ اس مسئلہ پر بے انتہا پریشان تھی۔ جس علاقے میں شبانہ کے نوکر چاکر بھی نہ رہتے ہوں گے' وہ کس طرح اس علاقے سے بہو لے آئے؟ اس کا معاشرے میں ایک مقام ہے' عزت ہے' لوگوں میں جانی پہچانی جاتی ہے اور بچوں کی ضد کے آگے وہ اپنی عمر بھر کی ساری عزت' وقار' اسٹیٹس کو ختم نہیں کرسکتی لیکن محبّ ماننے کو تیار نہیں تھا۔

میں نے شبانہ سے وعدہ کرلیا تھا کہ محبّ کو رضامند کروں کہ وہ صوفیہ کا خیال دل سے نکال کر روحا سے ہی شادی کرلے اس لیے میں اس مہم کے لیے سرگرم ہوگیا۔ ساری زندگی میرا جاب اور بزنس کا دارومدار اسی پر رہا تھا کہ میں کیسے لوگوں کی رائے اپنی مرضی کے مطابق بدلتا ہوں۔ مجھے اس کا بہت تجربہ تھا اور مجھے اپنے آپ پر اعتماد تھا لہٰذا میں نے سوچنا شروع کردیا کہ دونوں سے مل کر کیسے انہیں روکا جائے؟

ایک بار میں نے محبّ سے اس کے مستقبل کے بارے میں پوچھا اور ساتھ ہی شبانہ کی مرضی اس کی توقعات و خواہشات کا بھی ذکر کیا۔ محبّ ایک دم چپ سا ہوگیا۔ میں سمجھ گیا کہ معاملہ کسی اور زاویئے سے حل کیا جانا چاہیے۔

''دیکھو میاں......! تمہاری عمر میں ہر چیز انسان کو اچھی لگنے لگتی ہے اور اسے ایسا لگتا ہے کہ اگر ایسا نہ ہوا تو میں مرجاؤں گا۔ پریکٹیکل لائف میں آنے کے بعد ان سب باتوں پر ہنسی آیا کرے گی۔'' میں نے اس پر طنز کرتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔

محبّ نے اداسی سے جواب دیا۔ ''آپ اور مما جسے چند مہینوں کی دوستی سمجھتے ہیں' میرے لیے وہ زندگی کا حاصل ہے۔ یہ سب دھن دولت انسان کو انسان سے دور کرتا ہے' اسے مکمل نہیں کرتا' کئی حصوں میں بانٹ دیتا ہے۔ وہ کن ویلیوز کو وہ اپنی زندگی میں اہمیت دیتی ہے جن باتوں کو پسند کرتی ہے جنہیں ناپسند کرتی ہے' سب کچھ بالکل میرے ایسا ہی ہے جیسا میں محسوس کرتا ہوں۔ اس سے مل کر مجھے یوں محسوس ہوا ہے کہ میں بہت عرصہ بعد خود سے ملا ہوں۔ اس کے بعد مجھے زندگی میں کوئی اور اس طرح

سے مل نہ سکے اور میں یہ سب کچھ صرف کسی ایک شخص کی جھوٹی انا اور دنیاداری کی وجہ سے چھوڑ نہیں سکتا۔"

میں نے نفسیاتی طور پر دباؤ ڈالنے کے لیے اس کی شخصیت کے کمزور پہلوؤں پر ضرب لگائی۔ "لگتا ہے، تم حقیقی زندگی سے کوئی واسطہ رکھنا ہی نہیں چاہتے جو کچھ تم نے کل شدت سے محسوس کیا ہوگا' آج تمہارے لیے اس قدر اہم نہ رہا ہوگا اور جس بات پر تم آج جی جان کی بازی لگانے کی بات کرتے ہو' کل تم اس سے بھی بے رخی برتو گے' یہ محبت وغیرہ صرف......"

اس نے میری بات مکمل ہونے سے پہلے ہی کہا۔ "محبت آپ کے نزدیک کیا ہے' میں نہیں جانتا مگر مجھے یہ معلوم ہے کہ محبت سے آشنا ہونے سے پہلے انسان دھن دولت کی دوڑ میں اور دوسروں پر حاوی رہنے کے جنون میں انسان خود سے دور ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہی محبت اسے اپنے آپ سے ملا دیتی ہے۔"

اس کے بعد میں نے اس سے مزید کچھ نہ کہا۔ مجھے اس سارے معاملے میں محض اتنا ہی تعلق تھا کہ شبانہ کے مسائل کو کسی حد تک حل کر کے اس کی نظروں میں ایک اچھا تاثر قائم کرلوں اور پھر اگر کوئی اپنا مدعا بیان کروں لیکن ساتھ ہی ساتھ میں ان دونوں کی باتوں میں بھی تھوڑی بہت دلچسپی لینے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ آخر محبت کی حقیقت ہے کیا جس کے لیے شہنشاہ حکومتوں کو ٹھکرا دیتے ہیں اور یہ ہر ایک کو نصیب نہیں ہوتی؟ آخر زمانے نے اس کی ہمیشہ مخالفت کیوں کی ہے؟ اس جھگڑے میں محبت کیوں مٹتی رہی ہے؟

میں نے ایک آخری سی کوشش صوفیہ کو سمجھانے کی بھی کی اور اسے باور کرانا چاہا کہ شادیاں مضبوط بنیادوں پر ہی ہوا کرتی ہیں۔ ہم پلہ لوگوں میں ہی کامیاب رہتی ہیں۔ عمر بھر محبت کبھی ایک جیسی نہیں رہ

پاتی مگر سب بے سود رہا۔

میں واقعی بہت تذبذب میں تھا۔ آخر یہ کیا مصیبت ہے؟ دونوں فریقین مجھ سے صلاح مانگ رہے ہیں' وہ بھی اپنی اپنی مرضی کی اور میں خود کسی ایک کے حق میں فیصلہ نہیں کر پا رہا۔ محبت جیسے بڑے اور وسیع موضوع پر میں بہت کچھ لکھ بھی چکا ہوں اور اس سے زیادہ پڑھ بھی چکا ہوں مگر آج مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ جیسے میں پہلی بار کسی ایسے مسئلے میں الجھا ہوں' محبت کی معنویت کو آج پہلی بار سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں' اس دنیا میں محبت کا مول نہ ہونے کے برابر ہے۔

میرا دل شاید اس سب پر آمادہ نہیں ہو رہا تھا۔ شبانہ سے بھی یہی کہا کہ میں یہ سب کچھ ان سے اس کی خوشی کی خاطر کہہ رہا ہوں لیکن حقیقتاً میں شبانہ سے بھی سچ نہیں کہہ رہا تھا البتہ کبھی کبھی ان دونوں معصوم بچوں کی طرف دیکھ کر ڈوبنے سا لگتا تھا کہ میں کچھ درست بھی کر رہا ہوں یا صرف رواداری نبھانے کے لیے ہی ایسا کر رہا ہوں؟ مگر اس بارے میں جتنا زیادہ سوچا جائے' اتنا ہی انسان خود کو کمزور محسوس کرنے لگتا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا تھا کہ میرے اندر سے کوئی قوت مجھے اس سب سے روک رہی تھی۔ کیا یہ محبت میں واقعی اتنی طاقت ہوتی ہے؟ جن بچوں کے پاس کوئی مادی وسائل نہیں ہیں' جن کا کوئی طرف دار نہیں ہے' کیا یہ ان کا یقین' اعتماد' بھروسہ' اعتبار ہے جو میرے شعوری ارادوں کو شکست دے رہا ہے؟

مجھے اپنی اوائلِ جوانی کے دن بھی یاد آنے لگے جب میں کوئی ایسی رومانی داستان سنتا تھا تو سوچتا تھا کہ شاید ایسی ہی محبت مجھے بھی ضرور ہوگی مگر جن خوبصورت چہروں کو میں نے اپنے قریب دیکھا اور ان سے کچھ انسیت بھی ہوئی لیکن وہ ایسی محبت

میسر نہ آئی۔ شادی جیسے اہم معاملے میں بھی میرا حسن انتخاب عذرا تھی۔ عذرا کے والد سنار تھے اور دونوں بھائی مسقط میں تھے' بس عذرا کا بچپن میں پولیو کی وجہ سے ایک پیر مفلوج ہوگیا تھا مگر اس کے بھائیوں نے میرے کاروبار کو مستحکم کرنے کے لیے ٹھیک ٹھاک سرمایہ لگایا تھا۔

میں ان لوگوں سے حسد کرنے لگا تھا۔ میں خود کو تہی داماں سا محسوس کرنے لگا لیکن فوراً ہی میں پوری قوت سے ان احساسات کو دبانے اور جھٹلانے کی کوشش کرنے لگا۔ ان کی جیت میں مجھے اپنی شکست کیوں نظر آ رہی ہے' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

مجھے اپنے آپ پر حیرت سی ہو رہی تھی۔ میں خود پر ناز کیا کرتا تھا کہ کلائنٹس کی نفسیات کو سمجھ کر ان کے سامنے اس طرح سے اپنی پیشکش رکھتا ہوں کہ وہ دوسروں کو چھوڑ کر سو فیصدی مجھ سے اتفاق کرتے ہیں اور میری کمپنی کو بزنس دینے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے اپنے الفاظ کی ساری جادوگری بے کار سی لگنے لگی۔ آج اگر میں یہ سب نہ کر پایا تو نہ صرف میرے تعلقات شبانہ سے کشیدہ ہو جائیں گے بلکہ جن پلاٹ پرمٹ وغیرہ کے لیے میں اس سے امیدیں لگائے بیٹھا ہوں' ان پر بھی پانی پھر جائے گا۔ میں اپنی پوری صلاحیتوں کو استعمال کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا اور میرا ذہن مسلسل انہی سوچوں کھویا ہوا تھا۔

میں ہار ماننے کو کسی صورت تیار نہ تھا اسی لیے کبھی میرے دل میں خیال آتا کہ صوفیہ کے کمزور پہلوؤں کو محبؔ کے سامنے دوبارہ پیش کروں مثلاً کبھی سوچتا ہوں کہ صوفیہ کے مالی مشکلات و مسائل کا کچھ تذکرہ کروں' اس کے سامنے کروں یا پھر روحا کے بااثر خاندان سے وابستہ ہونے سے اس کے متوقع شاندار مستقبل کے خواب دکھاؤں لیکن ایسا لگتا تھا کہ میرے اندر سے کوئی قوت مجھے یہ سب کچھ کرنے سے روک رہی ہے مگر میں اس واہمے پر دھیان نہیں دینا چاہتا تھا۔

صوفیہ سے ملاقاتیں ہوتی رہیں۔ اکثر ہماری گفتگو کا موضوع محبت ہوتا تھا۔ ایک روز محبت کے کامیاب ہونے پر بحث ہوگئی۔ میرے استفسار پر وہ پینٹنگ کرتے کرتے رکی اور اس نے پاس پڑے ہوئے مٹی کے تیل کی شیشی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ اگر میں اس کو پی لوں تو شاید مر ہی جاؤں گی لیکن اگر میں اسے صرف دیکھتی رہوں تو یہ میری صحت کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ محبت جب تک انسان کے شعور سے لاشعور میں سفر نہیں کرتی' وہ کامل محبت نہیں ہے' یہی محبت کی کامیابی ہے۔"

"اور شعور سے لاشعور میں یہ محبت کس طرح آئے گی؟" میں نے یونہی اسے مزید چھیڑا۔

"بھئی' اگر کوئی شخص محبت تو کرے مگر دنیا کی دوسری چیزیں اسے لبھائیں اور کوئی بھی بات اس کی محبت کو ختم کر دے تو وہ کامل محبت نہیں ہے۔ درمیان میں سلسلے کا ٹوٹ جانا' محبتیں ایسے ہی کہیں گم ہو جاتی ہیں مگر جن میں استقامت ہوتی ہے' دنیا ان کی راہ میں کانٹے بھر دے' انہیں پاگل کہے' ان پر ہر طرح سے ظلم کرے مگر وہ اپنے راستے کو نہیں چھوڑتے۔" اس نے جذباتی ہو کر کہنا شروع کیا۔ "انہیں کیا معلوم کہ منزل کیا ہے' کہاں ہے مگر ان کے نقشِ پا ان کی محبت کے لوگوں کو ثبوت فراہم کرتے ہیں۔"

"ہوں......زیادہ فلمیں دیکھنے کا یہی نتیجہ ہوتا ہے۔" میں نے بات ختم کرنے کے لیے مذاق میں کہا۔

"ہرگز نہیں' سچی محبت وہی ہے جو انسان کو اصولوں اچھی قدروں سے جوڑ دے' یہ انسان کو

عبادت گاہوں تک لے آتی ہے بالکل ایسے جیسے...... جیسے ماں کی محبت جو ہر وقت رچی بسی ہوتی ہے' اس کی روح میں اولاد کے لیے' کوئی شخص آپ کی سوچ کا حصہ بن جائے' یہی میری نگاہ میں کامل محبت ہے۔'' اس نے پورے اعتماد سے کہا۔

مجھے اس میں شبانہ کی سی جھلک محسوس ہوئی۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت تھی کہ جس کرب کو خود شبانہ نے سہا تھا' آج شبانہ اسی طرح کسی اور کی دنیا کو ختم کررہی ہے۔ آخر وہ یہ سب کچھ کیسے بھول سکتی ہے؟ ایسا کیسے کرسکتی ہے؟ دل نے ایک بار چاہا کہ کسی طرح شبانہ کو سمجھانے کی کوشش کروں لیکن اگلے ہی لمحے میرے دل میں خیال آیا کہ کہیں شبانہ کی ناراضگی مجھے میرے خوابوں سے دور نہ کردے اور میں کوئی قدم اٹھانے سے باز آگیا۔

دن کس طرح گزرتے گئے' اندازہ نہ ہوا۔ شبانہ نے واپس جانے کا ارادہ کرلیا۔ میں اسی ادھیڑ بن میں رہا کہ افسوس' اب تک شبانہ سے اپنے متعلق کوئی بات نہ کرسکا۔

میرا آخری حربہ واقعی کارگر ثابت ہوا۔ میں ان دونوں کا ہم خیال بن گیا اور ان سے دوستی کرلی۔ ہر چھوٹی چھوٹی بات وہ مجھ سے کرلیتے۔ ان کا اعتماد مجھ پر اس قدر بڑھ گیا کہ مجھے اپنا خود پر اعتماد رکھنا مشکل محسوس ہونے لگا۔ صوفیہ اپنے بچپن کے قصے کہانیاں مجھے سنایا کرتی اور میں ان سے محظوظ ہوتا رہتا۔ میرا ذہن اس کے بہت سے پرانے قصوں میں بھی کسی نہ کسی کرید بُن میں لگا رہتا۔ ایک روز وہ میرے لیے لونگ چڑے بنا کر لائی۔ مجھے بچپن ہی سے لونگ چڑے پسند ہیں۔ میں نے اپنے بچپن کے انہی قصوں کو دہرانا شروع کردیا کہ کیسے جہاں آراء خالہ میرے لیے لونگ چڑے بنا کر لایا کرتی تھیں اور میں شبانہ سے بھی ضد کر کر کے لوگ چڑے بنوایا کرتا تھا اور کس کس طرح میری بے جا ضدیں بھی پوری کی جاتی تھیں۔ وہ غور سے سنتی رہی۔ میں اپنے بچپن کی اور بھی بہت سی شرارتوں اور بے وقوفیوں کا ذکر کرتا رہا۔ اچانک میں نے محسوس کیا کہ صوفیہ کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ اس نے دکھے ہوئے دل کے ساتھ اپنے بچپن کے واقعات مجھے بتانے شروع کیے اور جو کچھ وہ محبت سے بھی کبھی نہ کہہ سکی تھی' میرے سامنے اپنا دل کھول کر رکھ دیا۔ اس نے بتایا کہ اس کے بچپن میں ہی اس کی ماں اپنے کسی کزن کے ساتھ گھر' شوہر اور بچوں کو چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ ابا پر یہ صدمہ ایسا شاق گزرا کہ کچھ ہی عرصہ بعد ان کا انتقال ہوگیا۔ محلّہ' خاندان' رشتہ دار سب لوگوں میں اس کی ماں کے کردار پر اس قدر بات ہونے لگی کہ ان میں رہنا مشکل ہوگیا تھا۔ بالآخر اپنے بہنوئی کے پاس رہنے آگئی۔

مجھے نہیں معلوم میرا ذہن کس رفتار سے چل رہا تھا جو کچھ میں کر گزرا' وہ کبھی میرے وہم وگمان میں نہ تھا مگر وقت گزر گیا۔ آج میرے کمپنی دوبارہ سے اسی آب وتاب سے رواں ہے۔ میری بیوی عذرا بھی خوش ہے۔ میں نے اپنے بڑے بیٹے کو ایک پیٹرول پمپ خرید کردیا ہے۔ آج سب لوگوں کے سامنے میں بہت خوشحال انسان ہوں مگر خود کو تنہائی میں کامیاب نہیں کہہ پاتا۔ میرے دل میں ایک چبھن سی اب بھی موجود ہے۔ محبت کی شادی روحاسے ہی ہوئی اور شبانہ میری ذہانت سے پہلے سے زیادہ متاثر ہوکر واپس گئی۔ میرے الفاظ کی جادوگری نے وہ اثر دکھایا کہ محبت نے صوفیہ سے ناطہ توڑ لیا۔ آج میرے پاس سب کچھ ہونے کے باوجود خالی پن ہے' محبت کی کمی کا خالی پن' دولت نے ایک بار پھر ایک محبت کو ہرادیا مگر میں اپنے مقصد میں کامیاب ہونے کے باوجود کامیاب نہ ہوسکا۔

سیدہ تبسم زہرہ رضوی

اور جب چھپر پھٹا

حامد علی سید کا خیال

اب میرے خواب کی تعبیر کا پہلو نکلے
اس خرابے میں ہی تعمیر کا پہلو نکلے

زندگی جھیلتی ایک مصیبت زدہ عورت کی کہانی، جس کے دن پھر گئے تھے

میرے شوہر نے جب اپنے پاسپورٹ پر عمان کا ویزہ لگوایا تو ایک بیٹا میری گود میں اور دوسرا دنیا میں آنے کے لیے تیار تھا۔ میں ایک بڑی جوائنٹ فیملی کا حصہ تھی۔ میرے شوہر راشد کے سات بھائی تھے اور چار بہنیں۔ دو شادی شدہ' دو کنواری لہٰذا گھر بکراپیڑی کا منظر پیش کرتا تھا۔ میرے سسر ایک نچلے درجے کے گورنمنٹ ملازم تھے اور ساس خم ٹھونک کر کہتی تھیں۔ ''میری ٹکر کی جنگجو اگر کوئی ڈھونڈے تو انعام میں ساری عمر اس کی غلامی کروں گی۔'' یعنی وہ پوری طرح مرد مار عورت تھیں۔ اِدھر میرا یہ حال تھا کہ ایک نمبر کی دیو...... تعلیم تو میری انٹر تک تھی لیکن والدین کی بے وقت وفات کے سبب میری خالہ نے



مجھے پالا تھا اسی لیے میری شخصیت میں ڈر اور خوف نمایاں تھا پھر جب راشد کی اماں نے میرا رشتہ مانگا تو میری شادی کر دی گئی۔

ساس کا گھر نہیں بلکہ اصطبل تھا جس میں افراد جانوروں کی طرح رہتے تھے۔ تین کمرے تھے' ایک میں ساس سسر' دوسرے میں دونوں جیٹھ۔ راشد کی شادی کی تو صحن کے کونے میں ایک شیڈ ڈال کر دروازے کے نام پر ایک پردہ لگا دیا گیا۔ دو وقت کھانا پکتا تو لنگر کی طرح سب اس پر ٹوٹ پڑتے۔ کبھی مجھے ملتا' کبھی نہیں۔ اوپر سے طعنے سننا پڑتے۔

''تیرا میاں کون سا کماتا ہے؟'' اور جواب میں مجھ سے یہ کہا ہی نہیں جاتا کہ اس میں میرا کیا قصور پھر جب عمان کا ویزہ آ گیا تو راشد رخصت ہوتے وقت مجھے تسلیاں دینے لگے۔

''وہاں جا کر اتنی محنت کروں گا کہ سب دلدر دور ہو جائیں گے' یہ بڑا گھر بناؤں گا تیرے اور بچوں کے لیے' اس میں تو راج کرنا' اچھے اچھے کپڑے لاؤں گا تیرے لیے۔''

''تو' تو بس مجھے اچھی والی آئس کریم کھلا دیا کرنا۔'' میں نے سادگی سے کہا۔

''رہی نا' غریب کی غریب' کسی بڑی چیز کی فرمائش کرتی۔''

''یہ کیا پلان بن رہے ہیں؟'' ساس اور نند چھپ کر باتیں سننے پر ذرا شرمندہ نہ تھیں۔ ''پال کر ہاتھی کر دیا اس دن کے لیے؟'' ساس نے دھاڑتے ہوئے کہا۔ میں تو سہم کر ایک طرف ہو گئی' ساس نے راشد کی خبر لی تھی۔

پھر راشد چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد تو سناٹا چھا گیا لیکن صرف میرے دل پر۔ باقی تو سارے گھر کا وہی حال تھا' سب اپنی مستیوں میں مست تھے۔ گھر میں وہی بے ترتیبی تھی' کوئی اِدھر پڑا ہے' کوئی اُدھر' کہیں جھوٹے برتن پڑے ہیں' کہیں کپڑے' کہیں بستر اور کہیں انسان...... اور ان انسانوں میں ایک اور انسان بھی آ گیا' میرا دوسرا بیٹا۔ بلدیہ کے اسپتال میں جانے کا خرچ بھی پڑوسن سے ادھار لے کر دیا گیا تھا۔

دن گزرتے جا رہے تھے اور میری پریشانیوں میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ اس عالم میں بڑی پریشانی یہ تھی کہ راشد کی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔ اِدھر میرے دیور اور راشد کے چھوٹے بھائی کے سسرال والوں نے شور مچانا شروع کر دیا کہ رخصتی کرو اور ساس نے مجھ سے وہ شیڈ بھی چھین لیا۔

''اماں! میں کہاں سوؤں گی اور بچے کہاں رہیں گے؟'' میں نے بے چارگی سے کہا تھا۔

''برآمدہ کس لیے ہے؟ سب یہاں پڑے ہیں تو بھی پڑ جا۔'' ساس نے بے پروائی سے جواب دیا تھا۔

میں سلائی کر لیتی تھی اور اسی لیے اپنا بوجھ خود اٹھا رہی تھی لیکن اس کے باوجود ساس طعنے دیتی تھی۔ وہ خالہ جنہوں نے میری شادی کی' مجھے پالا پوسا' اُن کا بھی انتقال ہو چکا تھا۔ پلٹ کر جانے کا راستہ نہیں تھا۔ گھر میں بیس' بائیس افراد تھے' سب کا کھانا میں پکاتی۔ ساس' نندیں' دیورانی' جیٹھانی آرام کرتیں یا گھومنے نکل جاتیں۔

ایک دن میرے چھوٹے بیٹے کو بخار تھا جس کی وجہ سے میں روٹی نہیں پکا سکی' بس پھر تو قیامت ہی آ گئی' ساس نے چیخ چیخ کر آسمان سر پہ اٹھا لیا۔

''مفت خور' نمک حرام' تجھے ہم روٹی دیتے ہیں۔'' ساس مجھے طعنے دے رہی تھی حالانکہ میں سلائی کر کے اپنا اوپر کا خرچ پورا کرتی تھی۔ بچوں کے اخراجات کے لیے پریشان رہتی تھی۔ اب جو ساس نے ہنگامہ کھڑا کیا تو مجھ سے برداشت نہ ہو سکا۔

''اماں......! بچے میں گھر سے تو نہیں لائی تھی' بیس' بائیس آدمیوں کا کھانا پکاتی ہوں' سلائی کرتی ہوں۔''

''جواب دیتی ہے؟'' ساس کا زناٹے دار تھپڑ میرے منہ پر پڑا۔ اس وقت سسر بھی گھر میں تھے۔ انہوں نے بھی میرا جملہ سن لیا۔ میرا وجود تو سب کے لیے کانٹا تھا' یہ بہترین بہانہ تھا مجھ سے چھٹکارہ حاصل کرنے کا اور سب نے مل کر مجھے نکال دیا۔ میری جیٹھانی نے میرا بستر اور سامان بھی گھر سے باہر پھینک دیا۔

ایک بچہ گود میں' ایک کی انگلی پکڑے میں سامان کے پاس حیران پریشان سی کھڑی تھی پھر میں رکشے میں بیٹھ کر لیبر روانہ ہوئی جہاں ایک دور پار کی رشتہ دار رہتی تھیں۔ ان کے گھر پہنچی تو انہوں نے سرد مہری سے میرا استقبال کیا تھا۔ رات ہو چکی تھی اور میری میزبان نے صاف لفظوں میں کہا تھا۔

''میرے شوہر اس طرح کی باتوں کو سخت ناپسند کرتے ہیں' رات گزار لو لیکن صبح اپنا بندوبست کر لینا۔''

یہاں بھی قیام کے لیے برآمدہ ہی تھا۔ اُس رات بلا کی سردی تھی اور اپنے چھوٹے چھوٹے بچوں کے ساتھ میں نے ٹھٹھرتی سردی میں رات اس برآمدے میں گزاری۔ کھانے کے لیے بھی رسماً ہی پوچھا گیا تھا اس لیے میں نے انکار کر دیا تھا۔ ہاں' محلے کی دکان سے بسکٹ کا ایک پیکٹ اور کچھ کھانے کی چیزیں لے لی تھیں جنہیں کھا کر' بچوں کو سمیٹ کر بستر میں دبک گئی تھی۔ بستر میرا اپنا تھا۔ رات بھر میں آنے والی صبح کے بارے میں سوچتی رہی تھی کہ اگلی جائے پناہ کیا ہو گی؟ ہر عزیز کے بارے میں سوچ ڈالا' کہیں پناہ ملتی نظر نہ آتی تھی۔ میں سوچتی رہی اور روتی رہی۔ اسی طرح روتے روتے آنکھ لگ گئی۔ صبح دم آنکھ کھلی تو پہلا خیال بلقیس باجی کا آیا۔ اُن سے میری سلام دُعا تھی اور وہ لیبر میں ہی رہتی تھیں۔ نماز سے فارغ ہو کر میں نے اپنا بوریہ بستر لپیٹا۔ میری میزبان کے بچے اٹھ گئے تھے اور کمروں کا دروازہ کھل گیا تھا۔ میں نے سامان لپیٹ کر ایک طرف رکھا۔ شانی کو کلیجے سے لگا کر فرح کا ہاتھ پکڑا اور بلقیس باجی کے گھر کا راستہ لیا۔ وہ بہت اچھی طرح ملیں۔ میں نے اپنے حالات کا بتایا تو ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

''پریشان نہ ہو' یہاں ایک مکان خالی ہے' اسے کرائے پر لے لیتے ہیں۔ کچھ پیسے ہیں تمہارے پاس؟''

''ہاں۔'' کچھ روپے میں نے اپنے لباس میں چھپا کر رکھے تھے۔

''بس' ایک بڑی مشکل تو حل ہو گئی' دوسری اچھی بات یہ ہے کہ محلے میں گارمنٹ کا کارخانہ ہے' کوشش کرتی ہوں کہ تمہیں گھر پر کام مل جائے۔''

بلقیس باجی مجھے لے کر مکان دکھانے چلیں مگر وہ کرائے پر اٹھ گیا تھا لیکن ایک اور مکان خالی تھا جس کے مالک ذرا بدمزاج قسم کے تھے۔ ایک کمرہ' ننھا کچن اور واش روم پر مشتمل پرانی طرز پر بنا اجاڑ سا مکان تھا' کچا صحن' کونے میں بنا واش روم' صحن میں بیری کا درخت لیکن اس پریشانی میں مجھے یہ مکان کسی

یاد

میری مٹھی میں جگنو نہیں
موتیے اور گلاب کے تازہ پھول ہیں
جن کی معطر مہک
مجھے ہر لمحہ
ربِ ذوالجلال کی
یاد دلاتی ہے

عبدالعزیز جی آ۔ چکوال

محل سے کم نہیں لگ رہا تھا۔ میں نے ایک ماہ کا کرایہ ایڈوانس دے دیا اور گھر کی چابی لے لی پھر بلقیس باجی نے کارخانے میں بات کردائی اور ایک سلائی مشین بھی دلوادی۔

"کام بہت ہے، جتنا کروگی، وقت پر پے منٹ ملے گی۔" بلقیس باجی کی باتوں سے اطمینان کی لہر میرے دل تک سرائیت کرگئی۔ میری زبان باجی کا شکریہ کرتے نہ تھکتی تھی۔

اُس وقت دن کے بارہ بج رہے تھے۔ میں رکشہ کرکے اپنے میزبان کے گھر گئی اور اپنا سامان رکشے میں رکھا۔ کرائے کا مکان وہاں سے بہت دور تھا لیکن رکشے والا محلے کا تھا، اس نے جلدی پہنچا دیا۔ تالا کھول کر سامان رکھا۔ ننھا خرم تین سال کا ہوگا، اس کی گود میں شانی کو دیا اور کمرے کے کونے میں بستر بچھا دیا۔ پرس میں کاغذ قلم تھا، اسے نکال کر ضروری سامان کی لسٹ بنائی۔

"مما......! روٹی۔" میں نے خرم کی طرف دیکھا۔ بھوک سے بچے کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ بچے اور میں کل سے بھوکے تھے۔

"بس بیٹا! ابھی کھانا پکاتی ہوں۔"

بازار قریب تھا۔ دونوں بچوں کو لے کر میں ضروری چیزیں، راشن اور ایک وقت کا سالن روٹی خرید لائی۔ بچوں کا دودھ تو سب سے ضروری تھا۔ کھانا سامنے رکھا۔ چھوٹے کو فیڈر دی۔ خرم کو نوالے بنا کر دیئے تو بچے نے کھا لیے۔ خود بھی کھایا۔ بچے اس بات سے بے خبر کہ کتنی بڑی آندھی تھی کہ جو آ کر گزر گئی، کتنا بڑا طوفان تھا جو ماں نے اپنے کلیجے پر لے لیا۔ خرم نے جب توتلی زبان میں پوچھا کہ اب ہم یہاں رہیں گے؟ دادی گھر نہیں جائیں گے تو دل کٹ کر رہ گیا۔

گیس تمام گھروں میں تو تھی لیکن میرے گھر میں نہیں تھی۔ مالک مکان نے دینے سے انکار کردیا تھا اس لیے اپنا سلنڈر جلانا پڑتا تھا یا لکڑیاں، کوئلے جلا کر کھانا پکانا پڑتا لیکن ایک اچھی بات یہ تھی کہ سلائی کے پیسے اچھے مل جاتے تھے حالانکہ کپڑے سی سی کر تھکن سے میرا برا حال ہوجاتا تھا لیکن جب پیسے ملتے تو ساری کلفت دور ہوجاتی۔

جب کوئی شریف عورت اکیلی ہوتی ہے تو اسے بہت محتاط رہنا پڑتا ہے، میں بھی بہت احتیاط کرتی تھی۔ اکثر محلے کی عورتیں دروازے پر کھڑے ہوکر باتیں کرتیں تو میرا بھی دل چاہتا کہ میں سب کے ساتھ ہنسوں، بولوں لیکن عقل مجھے ایسا کرنے سے منع کرتی تھی کہ ان کے گھروں میں مرد ہیں جبکہ میرے گھر میں کوئی مرد نہیں ہے۔ ایسے گھروں پہ نظریں جلدی اٹھتی ہیں پھر عورتیں میرے بارے میں پوچھتی تھیں۔ گھر کے جھگڑے کی کہانی گلی میں سنانا کوئی اچھی بات نہیں، بس اس لیے جب سب پڑوسنیں ہنس رہی ہوتیں تو میں گھٹ کر رہ جاتی۔

سلائی کی محنت تو تھی لیکن اتنی محنت کے بعد سکون سے کھانا پکاتی تھی تو سکون سے کھا بھی لیتی تھی۔ بچوں کو دودھ اور غذا بھی خدا دے رہا تھا۔ سسرال کی ہائے ہائے، کل کل سے جان چھوٹی تھی لیکن رات کو تنہائی سے ڈر لگتا تھا۔ راشد کا خیال آتا کہ پتا نہیں، کس حال میں ہوں گے؟

خرم روز پوچھتا۔ "میرے بابا کب آئیں گے؟"

"بابا، بیٹے کے لیے چیزیں لینے گئے ہیں، اچھے اچھے کھلونے اور سوٹ۔" میں اسے بہلاتی۔ اب تو قریبی اسکول میں خرم کا داخلہ بھی ہوگیا تھا۔

جس دن خرم کا اسکول میں داخلہ ہوا تھا، میں بہت روئی تھی۔ مجھے راشد بہت یاد آتے تھے۔ راشد کا گھر یہاں سے بہت دور تھا اور وہاں جانا نہ صرف مشکل بلکہ خطرے سے خالی نہیں تھا ورنہ دل بہت چاہتا تھا کہ جا کر پتا کروں، کوئی خیر خبر آئی یا نہیں؟

میرے گھر کے سامنے ایک فیملی رہتی تھی۔ ان سے میری اچھی علیک سلیک ہوگئی۔ کبھی وہ باجی میرے گھر آجاتیں تو گھر میں رونق ہوجاتی یا کبھی میں ان کے گھر چلی جاتی تو دل بہل جاتا۔ اس طرح تھوڑی جان پہچان ہوئی اور عید، بقر عید پر حصہ آنے جانے لگا۔ کام کے لیے پانچ گھر چھوڑ کر چھٹے گھر میں کارخانہ کھلا تھا۔ رات کو میں تمام مال تیار کرکے آنٹی کو دے آتی اور معقول پے منٹ بھی ملتی اور اس کے ساتھ نیا مال بھی لے آتی اور صبح دم گھر کے کام سے فارغ ہوکر جو مشین چلاتی تو شام ہوجاتی تھی۔

ایک دن کسی طرح وقت نکال کر میں ساس کی طرف گئی تو وہاں راشد کی واپسی کی تو کوئی خبر نہیں ملی مگر ایک اندوہناک حادثے کے بارے میں پتہ چلا کہ گھر میں جو آتش بازی کا سامان بنانے کا کام میرا دیور کرتا تھا، اس میں دھماکہ ہوگیا تھا جس میں میری ساس، سسر، دیور، دیورانی، جیٹھ، جیٹھانی، ان کے بچے سمیت دس افراد جاں بحق اور کچھ بچے معذور ہوگئے تھے۔ جس گھر میں اتنے افراد تھے، اب وہاں صرف میری نند رہتی تھی۔ یہ ساری باتیں تو مجھے پڑوس سے پتا چلی تھیں۔ جب میں نے چاہا کہ اپنے سسرال میں جا کر تعزیت کروں تو میری نند نے دروازہ بند کرلیا اور اندر سے تیز تیز آواز میں مجھے گالیاں دینے لگی۔ میں ایک مرتبہ پھر روتی ہوئی اپنے گھر آگئی۔

کئی دن اس حادثے کے متعلق سوچ سوچ کر وحشت ہوتی رہی پھر زندگی معمول پر آگئی۔ اب ایک بار پھر خدا کو میرا امتحان مقصود تھا۔ کارخانہ سے کام ملنا کم ہوگیا۔ میں پھر پریشان رہنے لگی۔ ایک ایسا وقت بھی آیا کہ جب کام بالکل ختم ہوگیا، کارخانہ بند ہورہا تھا، پریشانی سی پریشانی تھی۔ اکثر پڑوسنیں کہتی تھیں کہ اس مکان میں آسیب ہے۔ ان کے مطابق، اس مکان میں کسی کو خوش نہیں دیکھا گیا۔ اب میرے ذہن میں بھی یہ خیال گھر کر رہا تھا کہ کہیں یہ پریشانی آسیب کی وجہ سے تو نہیں؟

ایک روز میں نے سامنے والی کی ساس سے باتوں ہی باتوں میں پوچھا تھا کہ خالہ......! کیا یہاں جنات رہتے ہیں؟ تو وہ مسکرا کر خاموش ہوگئیں۔

پھر انہوں نے بتایا۔ "یہاں ایک ڈاکو مارا گیا تھا۔ جب ہماری لائن کے مکانات بن رہے تھے تو یہاں ایک پولیس مقابلہ ہوا تھا اور ایک ڈاکو مارا گیا تھا۔ کہتے ہیں، وہ یہی زیرِ تعمیر گھر تھا جو تمہارے پاس ہے۔ وہ اس میں چھپا ہوا تھا، اسی میں قتل ہوا اور لوگ کہتے ہیں، اس کی روح پھرتی ہے۔"

ایک تو تنگ دستی اور اب دوسری فکر لگ گئی تھی مگر میں ایسی باتوں پر زیادہ یقین نہیں رکھتی تھی۔

کارخانہ بند ہوچکا تھا اور میرے حالات بھی خراب ہوگئے تھے۔ بلقیس باجی کے پاس گئی، وہ خود پریشان حال تھیں۔ اچھی سلائی کے دنوں میں کچھ پس انداز کرلیا تھا، وہی نکال کر خرچ چلا رہی تھی۔ خرم کی فیس، گھر کا خرچ حالانکہ میں بڑی کفایت شعاری سے کام چلاتی تھی پھر بھی زندہ تو رہنا تھا۔ ان ہی دنوں شانی کی طبیعت خراب ہوگئی۔ اس کی دوا دارو کا خرچہ الگ تھا۔ محلے کی وہ عورتیں جو سلائی کرتی تھیں، دور دور سے جا کر کام لے آتیں۔ میں پوچھتی تو پتہ نہیں بتاتی تھیں کہ اس میں ان کا نقصان تھا۔ اسی پریشانی میں میری جمع پونجی بھی تقریباً ختم ہوگئی۔ گھریلو سلائی بھی کی، کسی نے پیسے دیئے اور کسی نے نہیں۔ لڑنے کا مجھ میں دم نہیں تھا۔ قصہ مختصر، ایک وقت ایسا آیا کہ گھر میں کھانے کے لیے کچھ بھی نہیں رہا، نہ پیسے تھے۔ صبح آٹے کے ڈبے کو جھاڑا تو ایک مٹھی آٹا نکل آیا۔ دالوں کے ڈبے دیکھے تو ایک کھانے کے چمچ جتنی دال نکلی۔ میں نے آٹے کی

ایک چھوٹی سی روٹی پکائی اور پتلی دال ابال دی۔ بچوں کو نوالے بنا کر کھلائے اور خود بھوکی رہی۔ دونوں بچے بھی بھوکے رہ گئے تھے۔ کچھ دیر بعد میں نے انہیں سلا دیا۔ یہ دوپہر کا وقت تھا۔ اب کیا کروں؟ ظہر کی نماز کے بعد بڑی دیر رو رو کر اپنے اللہ سے دُعا مانگی۔

''اے اللہ! تجھے چھوٹے چھوٹے بچوں کی بھوک کا واسطہ تو میری پریشانی دور کر دے۔ جب مجھے گھر سے نکالا گیا تھا تو' تو نے رات گزارنے کے لیے جگہ دی تھی اور تو نے ہی نہ صرف ٹھکانہ دیا بلکہ کھانے کو' پہننے کو سکون سے جینے کا سامان کر دیا۔ اب پھر مجھ پر کڑا وقت ہے۔ میرے رَب! تو میری مدد کر۔'' رو رو کر میری آنکھیں سوج گئیں۔ جب میں نے سجدے سے سر اٹھایا' دونوں بچے بے خبر سو رہے تھے۔

نماز ختم کر کے میں صحن میں آ گئی۔ میں نے گزشتہ روز سے کچھ نہیں کھایا تھا۔ بھوک سے نیند بھی نہیں آتی تھی۔ کس سے قرض لوں؟ سامنے والی سے سو روپے لیے تھے۔ کارخانے کے برابر والی سے بھی قرض لے چکی تھی۔ دودھ والے نے بھی ادھار دینے سے انکار کر دیا تھا۔ صورتِ حال بہت خوف ناک ہو گئی تھی۔ میں نے صحن میں پودینہ' لہسن اور پیاز لگایا ہوا تھا۔ ایک چھوٹی سی لکڑی پاس پڑی تھی' میں یونہی لکڑی سے پودینے کی گوڈی کرنے لگی۔ اچانک مجھے لگا جیسے مٹی کے نیچے کوئی سخت چیز ہے۔ اب میں نے کھودنا شروع کیا تو کسی چیز کے ہونے کا احساس یقین میں بدل گیا۔ میں کھرپی لے آئی۔ کچن سے چمٹا بھی لے لیا تھا۔ رات سے بھوکی ہونے کے باوجود اللہ نے اتنی طاقت دے دی کہ اوپر کی تمام مٹی ہٹائی تو ایک بکس کے آثار نمودار ہوئے۔ بکس تقریباً تین بائی تین سائز کا تھا جسے نکالنا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ چارپائی پر چادر سوکھنے کو رکھی تھی' میں نے چارپائی گھسیٹ کر کھدی ہوئی جگہ پر رکھی کہ پڑوس سے کوئی بچہ وغیرہ اوپر سے نہ دیکھ لے کیونکہ صحن کھلا ہوا تھا پھر خود چارپائی کے نیچے جا کر کسی نہ کسی طرح بکس کھولا اور جو کچھ میں نے دیکھا' وہ عقل دنگ کرنے کے لیے کافی تھا۔ اس بکس میں نوٹوں کی گڈیاں' زیورات اور سونے کی چوڑیاں وغیرہ تھیں۔

میں فوراً چارپائی کے نیچے سے نکلی اور کمرے سے کپڑے کا تھیلا لائی اور اس میں بکس کی تمام چیزیں بھر کر کمرے میں پہنچا دیں پھر مٹی برابر کر کے پودینہ دوبارہ لگا دیا۔ اس کارروائی میں ایک گھنٹہ لگا تھا۔ اب تین بج رہے تھے۔ میری سانس پھولی ہوئی تھی اور چہرہ سرخ۔ کوئی میرے اندر سے کہہ رہا تھا کہ اب تیرے تمام دلدر دور ہو گئے۔

سب سے پہلے کیا کروں؟ لوگوں کا قرض واپس تا کہ کوئی دروازے پر نہ آئے؟ میں نے سوچنا شروع کیا۔ اسی وقت پہلے قرض دار دودھ والے کی بائیک کا ہارن سنائی دیا۔ میں نے سو روپے نکالے اور دودھ کا برتن لے کر دروازے پر پہنچی۔ دروازے کی جھری سے باہر کا منظر نظر آتا تھا۔ دودھ والے نے اپنی بائیک میرے دروازے پر روکی اور دستک دینے سے پہلے ایسی خشونت چہرے پر طاری کی کہ میں کلس کر رہ گئی پھر اس نے زوردار انداز میں دھڑ دھڑانے کا ارادہ کیا۔ میں نے فوراً اندر سے آواز لگائی۔ ''اچھا' اچھا۔''

وہ پہلوان نما دودھ والا مونچھوں پہ تاؤ دیتا ہوا گرجا۔ ''پیسے؟''

اگلے لمحے میں نے نوٹ آگے بڑھایا۔ نوٹ نے جادو کا کام کیا۔ آواز میں نرمی اتر آئی۔ ''دودھ کتنا چاہیے؟''

''ابھی نہیں چاہیے۔'' حالانکہ برتن لائی تھی لیکن اس کے رویئے کی وجہ سے ارادہ بدل گیا۔ پیچھے سے ایک اور دودھ والے کی آواز آ رہی تھی۔ میں نے اس سے دو لیٹر دودھ لے لیا۔ چولہا جلایا اور اس پر رکھ دیا پھر سامنے والی کا قرض واپس کرنے ان کے دروازے پر دستک دے کر اپنے دروازے پر آ گئی۔ جب سے فقر و فاقہ نے ڈیرے ڈالے تھے' سب کا رویہ بدل گیا تھا۔ اندر سے کوئی جواب نہیں آیا پھر دستک دی۔

''امی کام کر رہی ہیں۔'' اندر سے بچی نے جواب دیا۔ اتنے میں اس کی امی کی صورت نظر آئی۔ وہ سمجھ رہی تھی کہ میں پیسے مانگوں گی۔ انہوں نے ایک نظر دیکھا اور دروازہ بند کر لیا۔

میں نے ان کے دروازے پر جا کر کہا۔ ''اپنے پیسے لے لیجیے۔'' فوراً دروازہ کھل گیا۔ میں نے ان کا قرض لوٹا دیا۔ گلی میں بن' ڈبل روٹی والے آتے تھے۔ اس وقت بھی آ رہا تھا۔ میں نے اچھے والے شیرمال بن لیے۔ باورچی خانے میں آئی تو دودھ ابلنے والا تھا۔ اسے اتار کر رکھا تو پھر دروازے پر دستک ہو رہی تھی۔ کھولا تو کارخانے کے برابر والی جس سے میں نے قرض لیا تھا' وہ اپنی بہن کو لے کر آئی تھی جس نے آتے ہی لڑنا شروع کر دیا۔

''تم نے میری بہن کو بے وقوف بنا کر پیسے لے لیے؟'' ان کے تیور اچھے نہیں لگ رہے تھے۔ لگتا تھا' اگر آج پیسے نہ ہوتے تو وہ دونوں بہنیں مجھ کو پکڑ کر مارتیں۔

''ٹھہریں......'' یہ کہہ کر میں نے اندر سے پیسے لا کر دے دیئے۔

''دیکھا...... ایسے نکلتے ہیں۔'' اس کی بہن نے فاتحانہ نظروں سے اپنی بہن کی طرف دیکھا۔ ان کے جانے پر میں نے دروازہ بند کرنا چاہا تو مالک مکان آ رہی تھیں۔

''آیئے خالہ......!''

''اے...... خالہ والہ چھوڑ' کرایہ دے۔'' پہلے والی قرض خواہ میری طرف اشارے کرتی ہنستی ہوئی چلی گئیں۔

اپنی مالک مکان سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ میں نے نہ صرف کرایہ وقت پر دیا تھا بلکہ بسا اوقات وقت سے پہلے بھی ادائیگی کی تھی لیکن اب دو ماہ کا کرایہ چڑھ گیا تھا جس کی وجہ سے بڑی بی کی آنکھیں باہر کو آ رہی تھیں۔

''پیسے......''

''جی خالہ......!''

''کوئی خالہ نہیں' صرف پیسے......''

''ہاں خالہ......! آپ بیٹھیں تو۔''

''پہلے پیسے پھر کوئی بات۔'' میں نے اسٹور سے پیسے لا کر انہیں دیئے۔ میں چاہتی تھی کہ مکان خریدنے کی بات کروں لیکن وہ آپے میں نہیں تھیں۔ ان کو مجھ سے جھگڑتے دیکھ کر خرم رونے لگا۔ چھوٹا بھی روتا ہوا اٹھ گیا۔ میری بھی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ان کے جانے کے بعد دروازہ بند کر کے میں نے دونوں بچوں کو کلیجے سے لگایا۔

خرم کہہ رہا تھا۔ ''ہمارے گھر کھانا ختم ہو گیا ہے نا' اس لیے سب آپ سے لڑ رہی ہیں۔''

''نہیں میرے بچے......!'' میں نے بچوں کا منہ دھلایا اور انہیں کچن میں لے آئی۔ چھوٹا سا کچن' زمین پر چولہا جل رہا تھا۔ دری کا ٹکڑا بچھا دیتی تھی تو دونوں بیٹھ جاتے تھے۔ دودھ اور بن بچوں کو دیئے اور خود بھی کھائے۔ صبح سے اب تک جو کچھ ہوا تھا' وہ اچھے اچھوں کے حواس گم کرنے کے لیے کافی تھا۔ پیٹ میں کچھ گیا تو حواس تھوڑے بحال ہوئے اور میں سوچنے لگی۔

'اب کیا کروں؟' محلے کی دکان کا بھی تھوڑا سا

قرض تھا' اب اندھیرا چھا چکا تھا۔ میں نے بہت تھوڑے راشن کی لسٹ بنائی اور گلی کے کونے میں بنی دکان کی طرف چلی۔ پہلے کے پیسے اور نئے سودے کے پیسے لسٹ میں لپیٹ کر خرم کے ہاتھ میں پکڑا دیئے۔ دکان کونے پر تھی' خود چادر اوڑھ کر شانی کو گود میں لے کر ایک طرف کھڑی تھی اور ننھے خرم کو دکان پر بھیج دیا۔ دکاندار کے پاس دو تین آدمی بھی بیٹھے تھے۔

''کیا ہوا؟ تمہیں سودا نہیں مل سکتا۔ پہلے پیسے لاؤ۔'' لسٹ ہاتھ میں دیکھ کر دکان دار نے کہا۔ خرم بھاگ کر میرے پاس آیا۔

''بولو' اس میں پیسے ہیں۔'' میں نے کہا۔ خرم نے جا کر دکان دار کو یہی کہا۔

''کیا لکھ دیا تمہاری امی نے؟'' دکاندار نے جملہ کسا۔ میرا خون کھول کر رہ گیا۔ اسی مردود نے ایک مرتبہ بچے سے کہلوایا تھا کہ جو سودا چاہیے' لے لیا کرو' پیسوں کی خیر ہے۔ اس نے لسٹ کھولی تو نوٹ نکلے۔ اس کی زبان بند ہو گئی۔ راشن لے کر میں گھر آ گئی۔ رات گہری ہوئی تو بچے سو گئے لیکن میری آنکھوں سے نیند کوسوں دور تھی۔ لگتا تھا کہ یوں اتنے ڈھیر سارے پیسوں کا ملنا ناقابل یقین خواب ہے اور ابھی میری آنکھ کھل جائے گی...... پھر میں نے اٹھ کر دو رکعت نمازِ شکرانہ پڑھی کہ اس نے غیب سے میری مدد کی تھی۔

'اب کیا کیا جائے؟' میں نے خود سے سوال کیا۔ میں ایک بے بس و مجبور عورت تھی۔ اگر کسی کو ذرا بھی شک ہو گیا کہ میرے پاس اتنے پیسے ہیں تو جانے کیا ہو میرے ساتھ؟ میں نے فیصلہ کیا کہ اپنی مفلسی کا رونا جاری رکھوں۔ اس سے لوگ دور بھاگیں گے۔ خرچ برائے نام پہلے کی طرح رکھا تا کہ پیسہ نظر نہ آئے۔ اسٹور کمرے کے اندر تھا' اٹھ کر پھر زمین سے نکلا ہوا سامان دیکھا۔ رقم لاکھوں کے لگ بھگ تھی۔ کچھ ایسے شواہد بھی تھے جن سے پتا چلتا تھا کہ یہ اسی ڈاکو کا مال ہے جو اس گھر میں پولیس مقابلے میں مارا گیا تھا۔ میں سب کچھ رکھ کر بچوں کے پاس آ گئی۔ ڈر لگ رہا تھا' کہیں کوئی چور نہ آ جائے۔ اسی فکر میں نیند آ گئی۔

مارکیٹ سے کھانے پینے کی چیزیں پہلے بھی لینے جاتی تھی مگر گھر کا دھڑکا نہیں ہوتا تھا کیونکہ گھر میں کچھ ایسا تھا ہی نہیں کہ جس کی فکر کی جاتی لیکن اب بات دوسری تھی اسی لیے چند دن بعد میں نے وہ تمام مال بینک میں رکھ دیا۔ گھر میں پیچھے کی طرف والا دروازہ کھولا تا کہ بار بار گلی میں نہ نکلنا پڑے۔ اسی دوران میں نے ایک سیکنڈ ہینڈ فریج بھی لے لیا اور پڑوسیوں کو بتایا کہ شوہر نے کچھ پیسے بھیجے تھے۔ اس طرح میں ہفتے بھر کا کھانا پینا بھر دیتی تھی۔ ان ہی دنوں مالک مکان حج پر جا رہے تھے اور اپنا یہ مکان بیچنا چاہتے تھے۔ میں نے چپکے سے خرید لیا۔ مالک مکان بد دماغ عورت تھیں اس لیے کوئی ان کے گھر آتا جاتا نہیں تھا۔ اس طرح یہ بات راز رہ گئی۔ محلے والے سمجھتے تھے کہ میں اب بھی کرائے پر رہ رہی ہوں۔

''پیسہ ہے تمہارے پاس؟'' مالک مکان نے پوچھا تھا۔

''ان کے بابا کی نوکری ہو گئی ہے لندن میں۔'' میں نے سب سے یہ ہی کہا تھا کہ [illegible] شوہر کی جاب نہیں ہے اور وہ لندن میں ہیں اس لیے مجھے سلائی کرنی پڑتی ہے۔ مکان لیتے ہوئے سبھی کو یہی بتایا تھا' باقی میل جول پہلے بھی نہیں تھا جن سے تھا' ان کے چہرے اتنے بھیانک نکلے کہ پھر میرا دل کسی سے ملنے جلنے کو نہیں چاہا۔

دن اسی طرح گزرنے لگے۔ بچے کو اسکول چھوڑ کر گھر کے کاموں میں لگ جاتی۔ صفائی' کھانا پکانا' خرم کو لے کر آنا' اسی میں سارا دن گزر جاتا تھا۔

ایک روز گھر کے دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو دروازے پر کارخانے کے برابر والی وہی عورت تھی جو اس روز اپنی بہن کے ساتھ لڑنے آئی تھی۔ میں نے وہیں صحن میں بٹھا لیا۔

''اور کیا حال چال ہیں؟'' اس نے آنکھیں گھما گھما کر پوچھا۔ ''کیسے گزارہ چل رہا ہے؟''

''شکر ہے۔''

''شکر تو ہے' کہیں کام وام ملا؟''

''نہیں۔'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''میں دلوا دوں' کام بہت ہے' بس کام والا بندہ ہونا چاہیے۔'' اس نے معنی خیز انداز میں کہا۔

''کیا مطلب؟'' میں نے پوچھا۔

''بنگلے کوٹھیوں کا کام ہے' تم خوبصورت ہو' تمہیں کام بھی جلدی مل جائے گا۔''

''کام کا خوب صورتی سے کیا تعلق؟'' میں نے اسے حیرانی سے دیکھا۔

''اتنی نا سمجھ تو نہیں ہو۔ بچے میں رکھ لیا کروں گی' تم رات کو جانا' صبح آؤ گی تو میرا حصہ مجھے دے دینا۔ دیکھو' اتنی غربت میں بسر کر رہی ہو۔ تمہارے شوہر کو پروا نہیں ہے۔ زندگی پر تمہارا بھی حق ہے آخر۔'' اس کے پان سے خراب ہوئے دانت اور پھٹکار زدہ چہرہ دیکھ کر مجھے گھن آ رہی تھی' خون کھول رہا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کھری کھری سنا دوں لیکن عقل روک رہی تھی۔

''اتنی گندی ہوتی تو ان کے باپ کی عزت نہ لیے بیٹھی ہوتی۔'' میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے کہا۔

''یہ عزت وزت سب ڈھونگ ہے......''

''ان کے بابا کی پہلے جاب نہیں تھی' پر اب ہو گئی ہے۔ مجھے ضرورت کا بھیج دیتے ہیں۔''

''اچھا!!'' اس نے دیدے پھاڑ کے مجھے دیکھا۔

''جبھی تو میں کہوں' بڑی عجت والی بن رہی ہے۔''

''کیا پہلے میں عزت والی نہیں تھی؟ کیا دیکھا ہے آپ نے مجھ میں؟ بولیے؟'' میں نے قدرے اونچی آواز میں کہا۔ میرا لہجہ تلخ ہوتا دیکھ کر وہ اٹھ گئی اور خاموشی سے چلی گئی۔

''راشد......! کہاں ہو تم؟'' بہت دن بعد پھر آنکھیں برسنے لگیں۔ ''میرے اللہ! تو مجھے میرے راشد سے ملا دے۔'' رات میں یہ دعا کر کے سوئی اور صبح قبول ہو گئی۔ صبح ہی صبح دروازے پر دستک ہوئی۔ کھولا تو سامنے راشد کھڑے تھے۔ انہیں دیکھ کر چند لمحے تو پہچان ہی نہیں پائی' ان کی حالت انتہائی خستہ ہو رہی تھی۔

''راشد...... آپ......؟'' وہ بے قراری سے مجھ سے لپٹ گئے۔ راشد رو رہے تھے' میں بھی رو رہی تھی۔

''زری...... میں لٹ گیا' برباد ہو گیا......'' خرم بھی باپ سے لپٹ گیا۔ چھوٹا بھی باپ کی طرف لپک رہا تھا حالانکہ اس نے تو باپ کو کبھی دیکھا بھی نہ تھا۔ میرا دل اپنے رب کا شکر ادا کر رہا تھا کہ اس نے زندگی کی واحد کمی پوری کر دی تھی۔ اس رات راشد نے اپنی بپتا سنائی۔

''یہاں سے لے جا کر مجھے جبری مشقت میں ڈال دیا گیا۔ وہ لوگ سولہ' اٹھارہ گھنٹے کام لیتے اور کوئی پائی پیسہ نہیں دیتے تھے۔ بڑی مشکل سے جان چھڑا کر نکلا ہوں۔ یہاں آیا تو گھر کے لوگ مر چکے تھے اور تم غائب تھیں۔ بڑی مشکل سے تمہارا پتہ ڈھونڈا ہے۔''

پھر میں نے اپنی سنائی اور گھر میں دفن خزانے کے ملنے کے بارے میں بھی بتایا۔ راشد یہ سن کر حیرت زدہ رہ گئے۔

''راشد...... اب اس پیسے سے کوئی کاروبار کرنا اور غریبوں کی مدد کرنا۔ اب تم آ گئے ہو تو مجھے خدا کے سوا کسی کا ڈر نہیں ہے۔'' میں نے راشد کے سینے میں منہ چھپاتے ہوئے آسودگی سے کہا۔



شہلا سراج

اللہ کے دوست

حزیں صدیقی کا خیال

خدا کی دین ہے خود آگہی حزیں ورنہ
ہزار اہلِ خبر خود سے بے خبر ٹھہرے

صوم وصلوٰۃ کی پابند ایک بیوی کا ماجرا، اس کا شوہر دنیا پرست تھا

میری شادی جس خاندان میں ہوئی تھی' وہاں مذہب کا عمل دخل صرف اتنا تھا کہ اُن کے نام مسلمانوں جیسے تھے یا اُس گھرانے میں عیدین کی نماز پڑھ لینے کا رواج باقی تھا مگر نئی پود کے سرخیل میرے شوہر پر عید کی نماز بھی گراں گزرتی تھی۔

گھرانہ تو ہمارا بھی کوئی خاص مذہبی نہ تھا لیکن ہمارے ہاں نماز' روزے کا مذاق اس طرح نہیں اڑایا جاتا تھا جس طرح میری سسرال میں ہوتا تھا بلکہ جب سے ہمارے پڑوس میں قریشی صاحب کا خاندان آ کر آباد ہوا تھا' ہمارے یہاں مذہب کا عمل دخل کچھ بڑھ گیا تھا۔

قریشی صاحب کا گھرانہ ویسے تو خاصا ماڈرن تھا لیکن ان کے یہاں نماز کی پابندی اس سختی سے کی جاتی تھی کہ ہر بات پر نماز کو فوقیت حاصل تھی۔ ان کے بیٹے مغربی موسیقی بھی سنتے تھے لیکن نماز کا وقت ہوتا تو اپنی اسی جینز میں قبلہ رو کھڑے بھی ہو جاتے۔ ان کی دونوں بیٹیاں میڈیکل کی طالبات تھیں لیکن گھر سے نکلتے وقت پورے نقاب میں ہوتیں اور اسی طرح کالج جاتیں۔ اس خاندان کی خاص بات یہ تھی کہ انہوں نے مذہب کو خود پر طاری نہیں کیا تھا' اسے اپنے اندر رچا بسا لیا تھا۔ ان کی یہی باتیں تھیں کہ ہمارا پورا گھر خصوصاً میں ان سے قریب ہوتی چلی گئی تھی۔

قریشی صاحب کا اندازِ گفتگو ایسا تھا کہ ان کی باتیں دل میں اترتی چلی جاتی تھیں۔ ایک بار میں نے ایک مذہبی مسئلے پر جو میرے نزدیک خاصا متنازع رہا تھا' کے بارے میں اُن سے سوال کر لیا اور انہوں نے اتنے سہل اور آسان انداز میں اس کا جواب دیا کہ میں مطمئن ہو گئی۔ رفتہ رفتہ اُن کے بچوں کی دیکھا دیکھی میں نے بھی نماز شروع کر دی تھی۔ شروع شروع میں وقفے وقفے سے لیکن پھر اس میں باقاعدگی آتی گئی۔ یہاں تک کہ میں پابندی سے نماز پڑھنے لگی۔

قریشی صاحب کا تعلق لاہور سے تھا اور اُن کے گھر میں اکثر داتا صاحب کا ذکر ہوتا رہتا تھا اور یہ ذکر اُن کے گھرانے کا ہر فرد بڑی توقیر اور احترام



سے کرتا تھا۔ میں اس ذکر سے پہلے ہی متاثر تھی کہ میری سالگرہ پر انہوں نے مجھے کشف المحجوب کا تحفہ دے دیا۔ ان کے تحفے اسی طرح کے ہوتے تھے۔ ان کے اپنے گھر میں اگرچہ سالگرہ وغیرہ کی تقریبات نہیں ہوتی تھیں لیکن وہ ان کے اس حد تک مخالف بھی نہیں تھے کہ دوسروں پر پابندی عائد کرنے کی کوشش کریں یا ان تقریبات میں شرکت سے گریز کریں بلکہ میں نے تو انہیں اپنی گلی کے ایک عیسائی گھرانے کی خالصتاً مذہبی تقریبات میں بھی اسی طرح رغبت سے شریک ہوتے دیکھا تھا جس طرح وہ کسی بھی مسلمان گھر کی مذہبی تقریب میں شرکت کرتے تھے۔ اپنے اس عمل کے بارے میں اُن کا استدلال یہ تھا کہ ہمیں ان کی صفوں میں گھس کر اپنا پیغام ان تک پہنچانا چاہیے۔

میں انگلش میڈیم کی طالبہ تھی اس لیے "کشف المحجوب" میرے لیے خاصا ثقیل نام تھا اس لیے مجھے اس کتاب کو شروع کرنے میں کچھ وقت لگا لیکن جب ایک بار میں نے اسے پڑھنا شروع کیا تو پھر پڑھتی چلی گئی۔ کتاب کیا تھی' آگہی کا ایک خزینہ تھی کہ اسے جتنی بار پڑھو' ایک نیا مزہ دیتی تھی۔ پہلی بار پڑھنے کے بعد میں نے اسے بار بار پڑھا اور ہر بار اس کا ایک نیا رنگ سامنے آیا۔ اس کتاب کا مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ اب میری گفتگو میں بھی اس کے حوالے آنے لگے۔ کچھ کچھ تو میں مذہب کی طرف مائل پہلے ہی سے تھی لیکن اس کے بعد تو میں نہایت سختی سے مذہبی احکامات پر عمل کرنے لگی۔

نعیم نے مجھے کسی تقریب میں دیکھا تھا اور پھر گھر والوں کے سر ہوئے کہ شادی کروں گا تو اسی لڑکی سے ورنہ نہیں کروں گا۔ ہمارے اور ان کے گھرانوں کے درمیان معاشی فرق اتنا زیادہ تھا کہ میرے لیے اس گھرانے سے رشتہ آنے پر پورے خاندان میں میری خوش بختی کے ڈنکے بجنے لگے لیکن خود نعیم کی ماں، بہنیں اس رشتے پر زیادہ خوش نہیں تھیں۔ وجہ ظاہر ہے، وہی پرانی کہ میرے گھر سے جہیز کی صورت میں انہیں کچھ نہیں مل سکتا تھا جو کسی دوسرے گھر سے انہیں اپنے بیرونِ ملک تعلیم یافتہ نورِ نظر کے لیے ملنے کی امید ہو سکتی تھی لیکن یہ بات چوں کہ وہ صاف طور پر نہیں کہہ سکتی تھیں اور نہ ہی میری شکل وصورت پر اعتراض کیا جا سکتا تھا اس لیے تمام نزلہ میرے ڈھیلے ڈھالے لباس، بڑے دوپٹوں اور پابندیٔ نماز پر گرا۔ چنانچہ گھر میں داخل ہونے سے پہلے ہی مجھے ملانی کے خطاب سے نواز دیا گیا۔

سسرال میں میرے ابتدائی دن بہت کٹھن تھے، اتنے کٹھن کہ اگر قریشی صاحب کے خاندان کا سہارا نہ ہوتا تو شاید میں پاگل ہو جاتی۔ نعیم سمیت تمام افراد مجھے جس طرح کی ڈریسنگ میں دیکھنا چاہتے تھے، وہ میرے لیے ناقابلِ برداشت تھی۔ اوپر سے آئے دن پارٹیاں اور ان میں بے ہودہ شور شرابہ۔ میرے نماز، روزے پر تنقید مجھے کسی صورت گوارہ نہیں تھی لیکن قریشی صاحب ان تمام باتوں کو بھی مختلف انداز میں دیکھتے تھے۔ •

"دیکھو بیٹا! اگر ایک بوند گندگی سے ڈول کا پانی ناپاک ہو سکتا ہے اور ایک مچھلی پورے تالاب کو گندہ کر سکتی ہے تو کیا عطر کے چند قطرے فضا کو معطر نہیں کر سکتے؟ تم صرف چند دن صبر کرو پھر دیکھو آہستہ آہستہ ماحول کیسے تبدیل ہوتا ہے۔" ان کی ایسی ہی باتوں سے میں پہلے سے زیادہ خود اعتمادی سے مقابلے کے لیے تیار ہو جاتی تھی۔

شادی کے ابتدائی چند ماہ تو جیسے تیسے گزر گئے لیکن پھر میں نے محسوس کیا کہ آہستہ آہستہ صورتِ حال تبدیل ہو رہی ہے۔ سب سے بڑی تبدیلی نعیم میں آئی تھی کہ اب پارٹیوں میں جانے سے پہلے وہ میرے لباس پر اعتراض نہیں کرتے تھے اور نہ ہی میرے بھاری میک اپ سے پرہیز پر معترض ہوتے تھے بلکہ میں جس حال میں بھی ہوتی، انہیں اعتراض نہیں ہوتا تھا۔ رویّے کی اس تبدیلی پر پہلے تو میں سمجھی کہ شاید اپنی بک بک کا اثر نہ ہوتا دیکھ کر انہوں نے حالات سے سمجھوتہ کر لیا ہے لیکن بعد میں مجھے علم ہوا کہ میرے یونیک ہونے نے یہ کام دکھایا ہے۔

بناوٹ اور دکھاوے کے اس ماحول میں میری سادگی بھی ایک اسٹائل بن گئی تھی۔ سسرالی خاندان کی چند لڑکیوں نے بند گلے کی ڈھیلی قمیصوں اور بڑے بڑے دوپٹوں کا فیشن اپنا لیا تھا۔ مردوں سے گفتگو سے حتی الامکان گریز نے بھی کسی حد تک مجھے پاپولر بنا دیا تھا۔

فیشن زدہ خواتین کو بھی مجھ سے گفتگو کرتے ہوئے بوریت کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ میں ان کے پسندیدہ موضوع پر گفتگو کرتے کرتے اچانک بڑی خوبصورتی سے انہیں اپنی پسند کے موضوعات پر لے آتی تھی۔ خواتین میں میری بڑھتی ہوئی مقبولیت سے میری ساس بھی خوش تھیں۔ وہ خود کو بہت سوشل کہتی تھیں پھر جب ان کی بہو کی بھی تعریف ہونے لگی تو وہ خوش کیوں نہ ہوتیں۔ ایک بار بیماری کی تشخیص ہو جائے اور اس کا علاج سمجھ میں آ جائے تو باقی باتیں ثانوی رہ جاتی ہیں۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا۔

شادی کے پہلے ہی سال میں نے نعیم سے

بوتیک کھولنے کی بات کی تو وہ بخوشی تیار ہو گئے۔ میری نندوں کو بھی ایک ایکٹی ویٹی مل گئی اس لیے وہ بھی کمر کس کر کود پڑیں۔ ڈیزائننگ اور کٹنگ کا کام میں نے سنبھال لیا اور بقیہ کاموں کے لیے ملازمائیں رکھ لی گئیں۔ ہمارے کپڑوں کی ڈیزائننگ یونیک ہوتی تھی اس لیے خوب چلنے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے کم خرچ بالا نشین والے سوتی کپڑوں نے فیشن ایبل ریشمی ملبوسات کو مات دینی شروع کر دی۔

یہ تمام باتیں اپنی جگہ تھیں لیکن مذہب سے اس گھرانے کی دوری بلکہ ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی ہوئی دوری بھی ایک مسلمہ حقیقت تھی، تاہم اس کے ساتھ ہی یہ فرق ضرور آ گیا تھا کہ اب میرے نماز، روزہ یا دیگر باتوں کا مذاق اڑانا تقریباً ختم ہو چکا تھا یا یوں کہہ لیجیے کہ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیا گیا تھا۔ میں اس سے مطمئن تو تھی لیکن خوش نہیں تھی لیکن کوئی ایسا طریقہ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے گھر والوں کو مذہب کی طرف مائل کر سکوں۔

شروع میں اس معاملے پر گفتگو ہو جاتی تھی خصوصاً نعیم کے ساتھ کافی بحث مباحثہ رہا لیکن پھر انہوں نے بھی اس موضوع پر بات کرنی بند کر دی تھی۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ان کا مطالعہ وسیع ہے اس لیے وہ مجھے قائل کر لیں گے لیکن جب صورتِ حال اس کے برعکس ہونے لگی تو وہ دامن بچا گئے بلکہ مجھے تو اس حد تک بھی یقین تھا کہ وہ صرف اپنی انا کی خاطر پیچھے ہٹ گئے تھے ورنہ قائل تو ہو چکے تھے۔

شادی کے تین سال بعد تک ہمارے یہاں اولاد نہ ہو سکی۔ پہلے تو نعیم کا کہنا تھا کہ وہ دو سال تک بچہ نہیں چاہتے اور بعد میں قدرت ہم پر مہربان نہیں ہوئی۔ میری سسرال اس معاملے میں کافی روشن خیال تھی البتہ میں خود تخلیق کے اس مرحلہ سے گزر کر اپنی ازدواجی زندگی کی تکمیل کی خواہش مند تھی۔

ان تین برسوں میں پاکستان کے کئی شہروں کے ساتھ دنیا کے کئی ممالک کی سیر کا اتفاق بھی ہوا لیکن میری پسند کے مقامات کے ذکر پر نعیم چڑ جاتے تھے۔

میں انہیں لاہور جانے کا کہتی تھی لیکن لاہور کے ذکر پر ہی اُن کا ردِعمل ایسا ہو جاتا تھا جیسے میں نے کوئی بہت ہی غلط بات کہہ دی ہو کیونکہ وہ جانتے تھے، میں لاہور کیوں جانا چاہ رہی ہوں۔ وہ میرا اس بات پر کئی بار مذاق اڑانے کی بھی کوشش کر چکے تھے کہ پتا نہیں میری بیوی کو اتنے بھاری نام والی کتاب کو پڑھنے سے کیا ملتا ہے کہ یہ اسے بار بار پڑھتی رہتی ہے؟

دن اسی طرح گزر رہے تھے کہ ایک روز ہمارے ایک سسرالی رشتہ دار کی شادی کا پیغام ملا۔ وہ اسلام آباد میں رہتے تھے۔ اوپر تلے تین چار چھٹیاں بھی ساتھ آ رہی تھیں اس لیے ایڈونچر کے طور پر طے کیا گیا کہ کار کے ذریعے اسلام آباد تک کا سفر کیا جائے گا۔ اس پروگرام میں سسرالی خاندان کے دوسرے افراد بھی شامل ہو گئے اور قافلہ بڑھتا چلا گیا۔ ایک صاحب کے کسی عزیز کی لاہور میں کوٹھی بھی نکل آئی جو خالی پڑی تھی۔ دوسرے کسی صاحب نے ملتان میں قیام کا بندوبست کر دیا اور یوں پورا پروگرام طے کر کے آٹھ گاڑیوں کا یہ قافلہ کراچی سے روانہ ہوا۔

نعیم نے کراچی سے چلتے وقت مجھ سے یہ وعدہ بھی کر لیا کہ وہ لاہور میں مجھے داتا دربار بھی لے جائیں گے۔ میں نے ان کی یہ بات مان لی کہ ہاں، آدھے گھنٹے سے زیادہ نہیں رکوں گی۔

دل تو میرا اولیاء کی سرزمین ملتان میں بھی رکنے کو بہت چاہا لیکن اول تو ہم رات میں پہنچے تھے، دوسرے میں نہیں چاہتی تھی کہ نعیم کو کسی بھی قسم کا بہانہ

مل جائے اس لیے جب صبح سویرے وہاں سے نکلے تو میں نے کسی بھی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ راستے میں رکتے ہوئے کچھ تھوڑی بہت مشکلات مثلاً ٹائر پنکچر وغیرہ کا سامنا کرتے ہوئے ہم جب لاہور پہنچے تو اُس وقت رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب ماڈل ٹاؤن نیا نیا آباد ہو رہا تھا اور کوٹھیوں کے درمیان کئی کئی پلاٹ خالی رہتے تھے۔ جوں جوں لاہور قریب آ رہا تھا' میری کیفیت عجیب ہوتی جا رہی تھی۔ میں نے راستے میں نعیم سے یوں ہی سرسری طور پر کہہ دیا کہ اگر ہم اس وقت داتا دربار چلیں تو کیسا رہے گا؟ اور خلافِ توقع وہ تیار بھی ہو گئے۔

''ٹھیک ہے' صبح صرف تمہاری وجہ سے سب کا وقت ضائع ہوگا اس لیے بہتر ہے' ابھی ہو آتے ہیں۔'' اور میں خوش ہو گئی۔ طے یہ ہوا تھا کہ مطلوبہ کوٹھی پر پہنچنے کے بعد میں اور نعیم کسی صاحب کو لے کر جائیں گے اور پھر واپس آ جائیں گے لیکن اپنے مطلوبہ مقام پر پہنچنے کے بعد نئی مشکل سامنے آ گئی۔ کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ گزشتہ کئی روز سے پانی بالکل نہیں آ رہا ہے۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ پینے کی حد تک تو پانی موجود تھا جو ہم ساتھ لے کر چل رہے تھے لیکن اس سے زیادہ کی گنجائش نہیں تھی۔ انڈر گراؤنڈ ٹینک بقول چوکیدار کے' بالکل خشک تھا۔ نعیم نے مجھ سے چلنے کے لیے کہا تو میں نے جواب دیا کہ بغیر نہائے میں اس حالت میں تو وہاں نہیں جاؤں گی۔

''اور اتنا پانی ہے نہیں کہ تم نہا سکو۔'' انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ وہ پہلا موقع تھا جب مجھے ان پر غصہ آیا تھا۔ وہ میری مجبوری کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ''اگر صبح تک تمہارے یہ داتا صاحب نہانے کا بندوبست کروا دیں تو میں بھی چلا چلوں گا۔'' انہوں نے انتہائی تمسخرانہ انداز میں کہا۔

''اور بھابھی' میں بھی۔'' یہ میری نند تھی جو اپنے بھائی کے ساتھ میرا مذاق اڑا رہی تھی۔

میں روہانسی ہو گئی تھی اور پھر میرا چہرہ دیکھ کر انہوں نے مزید مذاق کا پروگرام ملتوی کر دیا تھا ورنہ یہ ایسی بات تھی جس پر وہاں موجود تقریباً تمام ہی افراد میرا مذاق اڑانے کے لیے تیار ہو جاتے۔

ہمیشہ کی طرح صبح فجر کے وقت میری آنکھ کھلی۔ اتنا پانی تو تھا کہ میں وضو بنا سکتی۔ مجھے اٹھتا دیکھ کر چوکیدار میرے لیے چائے بنا لایا جو میں نے نماز کے بعد پی۔ اس کے بعد میں نے اسے پیسے دے کر ناشتے کے لیے کچھ چیزیں منگوانے کے لیے بھیج دیا۔ وہ اپنی سائیکل پر روانہ ہو گیا اور میں لان میں ٹہلنے لگی۔ اس سے بڑی بدقسمتی میرے لیے کیا ہو سکتی تھی کہ میں لاہور آ کر داتا دربار نہیں جا سکتی تھی جہاں جانے کی آرزو ایک عرصے سے میرے دل میں تڑپ رہی تھی۔ تمام لوگ سو رہے تھے اور میں بے چینی سے یہاں سے وہاں ٹہل رہی تھی کہ دیوار پر ایک بچہ نمودار ہوا۔ نیکر اور بشرٹ میں وہ گول مٹول سا بچہ پہلی نظر میں ہی مجھے بہت پیارا لگا تھا۔

ابھی میں اس بات پر حیران ہو رہی تھی کہ اتنا چھوٹا سا بچہ اتنی اونچی دیوار پر کیسے چڑھ گیا؟ کہ وہ مجھ سے مخاطب ہوا۔ ''میں اپنے گھر سے آپ کو بہت دیر سے دیکھ رہا ہوں آنٹی' آپ شاید کچھ پریشان ہیں؟''

میں نے سوچا' بچہ شاید برابر میں رہتا ہے اور مجھے اس طرح ٹہلتے دیکھ کر اپنے بڑوں کی نظریں چرا کر دیوار پر چڑھ گیا ہے۔ بہت ممکن ہے' دیوار کے اُس طرف یعنی اُن کے مکان کی سائیڈ پر کوئی ایسی چیز رکھی ہو جس پر وہ چڑھ کر مجھ سے مخاطب ہوا ہے۔'

''کچھ نہیں بیٹا......! یہاں پانی نہیں آ رہا ہے

اور مجھے نہانا ہے' بس یہی پریشانی ہے۔'' میں نے اپنا مسئلہ اس لیے بتا دیا تھا کہ اُس بچے نے بڑی چاہت سے مجھ سے سوال کیا تھا۔

''تو یہ بھی کوئی پریشانی ہے؟ میں اپنے گھر سے پائپ لے آتا ہوں اور اوپر کی ٹنکی بھر دیتا ہوں۔ آپ جی بھر کر نہا لیں۔'' اُس نے حل بتاتے ہوئے کہا۔

اُس لمحے وہ مجھے دنیا کا سب سے اچھا انسان محسوس ہوا تھا پھر اگلے ہی لمحے وہ دیوار سے اتر کر غائب ہو گیا۔ مجھے اس طرح اچانک پانی مل جانے کی جو خوشی تھی' اس خوشی میں یہ بھی بھول گئی کہ ربڑ کے پائپ سے وہ کس طرح اوپر ٹنکی تک پانی پہنچائے گا؟ صبح کی روشنی ابھی پھیلی نہیں تھی کہ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ملگجا اندھیرا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں وہ بچہ مجھے ایک پائپ کا کونہ پکڑے اوپر ٹنکی کے پاس نظر آیا پھر اُس نے وہ پائپ ٹنکی میں پھنسا دیا اور شاید اس میں پانی گرتا دیکھ کر مطمئن ہوتے ہوئے اُس نے مجھے کہا۔

''آنٹی' پانی آ رہا ہے' آپ جا کر نہا لیں۔ ٹنکی بھر جائے گی تو میں پائپ نکال لوں گا۔'' اُس کا جملہ سنتے ہی میں خوشی سے بے حال ہو گئی۔

''بہت بہت شکریہ بیٹے......!'' میں نے اُس سے کہا اور نہانے کے لیے اندر آ گئی۔ میں نے سوچا کہ نہانے کے بعد روانگی سے پہلے میں اُس کی ماں سے ضرور ملوں گی اور اُس کا بھی شکریہ ادا کروں گی' ساتھ ہی مجھے حیرت تھی کہ اب تک کسی کو اس بات کا خیال کیوں نہیں آیا؟ ٹھیک ہے' رات میرا موڈ آف ہو گیا تھا لیکن باقی سب تو صحیح تھے لیکن زیادہ سوچ بچار کا موقع نہیں تھا۔ میں نے بیگ سے کپڑے نکالے اور غسل خانے میں گھس گئی۔ نہ جانے کتنی دیر تک غسل کرتی رہی بلکہ اس طرح نہائی جیسے زندگی

نام

حیا
وفا
کر پاسداری
میری محبت کو
تم کچھ بھی کہہ سکتے ہو
مگر اتنا بتا دو
کہ تمہاری مجبوری کو
میں بھلا کیا نام دوں؟
انا
خودداری
یا بے وفائی؟

اصفا فیصل۔ کراچی

میں پہلی بار نہا رہی ہوں۔ فارغ ہو کر باہر نکلی اور ابھی بال خشک ہی کر رہی تھی کہ نعیم بھی بیدار ہو گئے۔

''تم نے یقیناً اپنے شوق کی خاطر تمام پانی بہا دیا ہوگا اور اب سب کی نظروں میں مجھے ذلیل کرواؤ گی۔'' انہوں نے کسی قدر غصے سے کہا۔ ان کی بات پر مجھے قطعی غصہ نہیں آیا۔ میری ایک بہت بڑی خواہش پوری ہو رہی تھی اس لیے میرا موڈ بہت اچھا تھا۔

''جی نہیں جناب' برابر والوں کے بچے نے اوپر کی ٹنکی میں پائپ لگا کر پانی بھرا ہے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''وہاٹ نان سنس؟ کون سے برابر والے؟'' انہوں نے اٹھتے ہوئے کہا۔

''رائٹ سائیڈ پر جو مکان ہے۔'' میں نے اطمینان سے کہا۔

''کیا تم پاگل ہو گئی ہو؟'' انہوں نے کسی قدر تشویش آمیز لہجے میں کہا۔

''نہ رائٹ نہ لیفٹ' دونوں جانب کئی پلاٹ چھوڑ کر ایک مکان ہے۔'' ان کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ میں بھونچکا رہ گئی۔

''لیکن یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ اُس بچے نے تو کہا تھا......'' میرا جملہ پورا ہونے سے پہلے ہی وہ کھڑے ہوگئے۔

''تمہیں اس طرح یقین نہیں آئے گا۔ آؤ' میں تمہیں خود دکھاتا ہوں اور پھر اس علاقے میں تو کئی روز سے پانی آ ہی نہیں رہا ہے۔'' انہوں نے میرے ساتھ نکلتے ہوئے کہا۔

ہم دونوں غیر ارادی طور پر اتنی تیز آوازوں میں باتیں کر رہے تھے کہ قریب سوئے ہوئے کچھ اور لوگ بھی نیند سے بیدار ہوگئے۔ ان میں میری ایک نند بھی شامل تھی۔

نعیم واقعی درست کہہ رہے تھے' دائیں جانب کا مکان چھ پلاٹ چھوڑ کر تھا اور بائیں جانب کا فاصلہ بھی تقریباً اتنا ہی تھا۔ روشنی پوری طرح پھیل چکی تھی اور حقیقت مجھ پر واضح ہوگئی تھی۔

''لیکن نعیم......! وہ بچہ......'' میں نے بے چارگی سے کہا۔

''آؤ' اندر چلیں۔'' نعیم نے مجھے تسلی دینے والے انداز میں کہا۔

ہم دوبارہ گھر میں داخل ہوئے تو کئی افراد اٹھ چکے تھے۔ میں حیران تھی لیکن فوراً ہی میری حیرانی میں بقیہ افراد بھی شریک ہوگئے۔ باتھ روم کے نل سے پانی آ رہا تھا۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ اوپر ٹنکی میں پانی موجود ہے۔

''یہ سب کیا ہے؟'' ایک فرد نے ڈری ڈری سی آواز میں کہا۔

''ہوسکتا ہے' رات میں پانی آ گیا ہو اور چوکیدار پانی چڑھا کر گیا ہو۔'' ایک صاحب نے توجیہ پیش کی۔

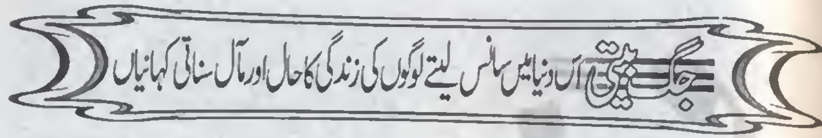
''اور بھابھی نل میں پانی آتا دیکھ کر فریب نظر کا شکار ہوگئی ہوں۔ آخر کو......'' لیکن اس سے پہلے ہی نعیم انڈر گراؤنڈ ٹینک کی طرف بڑھ گئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے کئی افراد بھی گئے۔ انڈر گراؤنڈ ٹینک خشک تھا' بالکل خشک۔ ایک صاحب کو اوپر بھیجا' ٹنکی لبالب بھری ہوئی تھی۔ تمام افراد بیدار ہو چکے تھے۔ ہر ایک کے چہرے پر سوال تھا کہ یہ سب کیا ہے؟ اتنے میں مجھے نعیم کی کہی ہوئی بات یاد آ گئی۔

''یاد ہے نعیم' تم نے کہا تھا کہ اگر ہمارے نہانے کا انتظام ہو گیا تو......''

''مجھے اپنا وعدہ یاد ہے۔'' نعیم نے عجیب کھوئے ہوئے انداز میں کہا۔

اس کے بعد جو کچھ ہوا' اس کا اندازہ ہر شخص کر سکتا ہے۔ نعیم نے نہا کر نماز پڑھی اور گڑگڑا کر اپنے گناہوں کی معافی مانگی اور ہمارا قافلہ اسلام آباد جانے سے پہلے داتا دربار گیا۔ وہاں سے ہم سہ پہر کے لگ بھگ روانہ ہوگئے لیکن وہ کام جو میں مسلسل کوششوں سے نہیں کر سکی تھی' اِس ایک واقعے نے کر دکھایا۔

آج ماشاء اللہ' ہمارے چار بچے ہیں' دو بیٹے اور دو بیٹیاں اور ہم انہیں دنیاوی تعلیم کے ساتھ دینی تعلیم بھی دلا رہے ہیں۔ نعیم بھی مجھ سے اس معاملے میں متفق ہیں۔ انہوں نے تو خود کو بالکل ہی تبدیل کر لیا ہے۔ تبدیلی تو سب میں آئی ہے' ہمارا پورا گھرانہ نماز' روزہ اور دیگر احکاماتِ دین کا پابند ہو گیا ہے مگر نعیم نہ صرف باریش ہوگئے ہیں بلکہ دین کے معاملات میں مجھ سے ایک قدم آگے ہی نظر آتے ہیں۔ ہم دونوں تین حج کر چکے ہیں اور اس بار چوتھے حج کے لیے جا رہے ہیں۔ خدا اپنے نیک بندوں کے طفیل' ہماری عبادت قبول فرمائے۔ (آمین!)



عبدالعزیز جی آ

عشق نہ پوچھے ذات

قابل اجمیری کا خیال

کوئے محبوب سے چپ چاپ گزرنے والے
عرصہ زیست میں اک حشر اٹھا دیتے ہیں

دو سچے پریمیوں کی کہانی، ان کا دشمن کوئی اور نہیں ہمارا ظالم سماج تھا



برسات کا موسم تھا' ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی' فلک پر ابر محیط تھا' دفعتاً کالی گھٹاؤں نے مشرقی افق سے پھوٹتے ہوئے اجالے کو نگل لیا' یوں لگتا تھا جیسے رات نے پھر سے اپنی سیاہ زلفیں پھیلا دی ہوں۔ دیکھتے ہی دیکھتے چہار سو اندھیرا چھا گیا۔ مراد صبح کی سیر کرنے گاؤں کے قریب بہنے والی ندی کی طرف جا رہا تھا۔ چاروں طرف پھیلی ہری بھری فصلوں' تروتازہ پھولوں' دلکش نظاروں' پھلوں سے لدے درختوں' شبنمی سبزہ زاروں کے بیچوں بیچ بل کھاتی پگڈنڈی پر خراماں خراماں ندی کی طرف بڑھتے ہوئے اسے بہت لطف آ رہا تھا۔ خوشبو بھری بادِ صبا میں درخت مستوں کی طرح جھوم رہے تھے۔ ان پر لٹکتی سرسبز خوبصورت بیلیں پرکیف نظارہ پیش کر رہی تھیں۔ پرندوں کی خوش نوائی اور والہانہ پروازیں منظر کی دلکشی میں اضافہ کر رہی تھیں۔ وہ جوں جوں آگے بڑھ رہا تھا' اس کا دل مسرور ہوتا جا رہا تھا۔ وہ لہکتا' چہکتا' جھومتا' گنگناتا ندی کنارے جا پہنچا۔ آج ندی بھی پورے جوبن پر تھی' پانی کا ریلا ٹھاٹھیں مارتا گزر رہا تھا۔ قدرت کے حسین نظاروں میں اچانک اس نے دیکھا' ندی کے اُس پار پہاڑ کی چوٹی سے اترتی ایک حور شمائل پہلو میں گگریا اٹھائے گیت ملہار کے گاتی چلی آ رہی تھی۔ اس کے پیچھے کچھ فاصلے پر میلے کچیلے کپڑوں میں ملبوس ایک ٹھگنے قد کا لڑکا بغل میں سبوچہ دبائے بھاگا چلا آ رہا تھا اور سب سے پیچھے درمیانی قامت کا ایک خوبصورت روئی کے گالے کی طرح سفید کتا تھا۔ اس پری جمال کی مترنم آواز جنگل میں ایک سحر سا پیدا کر رہی تھی۔ اس کا خوبصورت گیت مراد کی سماعتوں میں رَس گھولتا ہوا روح میں اتر گیا۔ وہ ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ندی کے کنارے پہنچی اور پانی میں سے ابھرے ہوئے ایک بڑے پتھر پر بیٹھ کر پانی بھرنے لگی۔ مراد نے اسی وقت نیفے میں اُڑسی ہوئی بانسری نکالی اور ایک بڑے درخت کے تنے کی اوٹ میں ہو کر پہاڑی الاپ دیا۔ فضا میں جیسے جلترنگ سے بج اٹھے۔ بانسری کی مدھر آواز جب اس حسینہ کی سماعت سے ٹکرائی تو وہ پتھر کی طرح جامد و ساکت ہو کر رہ گئی' یوں جیسے وہ کوئی صنم کدے میں سنگی مورتی ہو۔ کچھ دیر تک وہ بانسری کے سحر میں کھوئی رہی' اس خودفراموشی میں اسے اپنے آپ کا ہوش نہ رہا کہ وہ ندیا کنارے پتھر پہ بیٹھی کیا کر رہی ہے۔ اس نے کئی بار بے اختیار اس سمت ضرور دیکھا جہاں سے بانسری کی سریلی آواز آ رہی تھی مگر بانسری بجانے والا اسے کہیں نظر نہیں آیا تھا۔

''نوری......! او نوری کی بچی......! تو کن خیالوں میں کھو گئی ہے؟ تیری گگریا تو وہ جا رہی ہے۔'' ٹھگنے کی آواز پر چونکی کہ وہ پانی بھرنے ندی کنارے آئی تھی۔ جب اس کی نظر اپنی گگریا پر پڑی جو پانی پہ تیرتی ہوئی اس سے کافی دور جا چکی تھی تو سینے پہ ہاتھ مارتے ہوئے بولی۔

''ہائے' میں مرگئی' میری گگریا' پکڑو بامن' میری گگریا پکڑو۔''

ٹھگنے نے ناگواری سے کہا۔ ''میں کیسے پکڑوں' مجھے تو تیرنا بھی نہیں آتا اور ندی بھی چڑھی ہوئی ہے میں رُڑ جاؤں گا۔'' مراد جو تنے کی اوٹ سے سب کچھ دیکھ رہا تھا' بانسری کے سروں پر اٹھتی بیٹھتی اس کی انگلیاں رک گئیں۔ وہ درخت کی اوٹ سے باہر آیا' بانسری زمین پر رکھی' جوتے اتارے' قمیص اتاری اور ندی میں چھلانگ لگا دی۔ کناروں سے آگے پانی کافی گہرا تھا' وہ ماہر تیراک کی طرح تیرتا ہوا لہروں پہ ہچکولے کھاتی گاگر تک پہنچا اور اسے پکڑ کر کنارے تک لے آیا۔ نوری اور بامن کنارے کے ساتھ ساتھ دوڑتے ہوئے مراد تک پہنچے۔ مراد نے جب نوری کو قریب سے دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا۔ لڑکی تھی یا کوہ نور کا ٹکڑا......وہ گاگر اٹھائے مبہوت کھڑا اسے دیکھنے لگا۔

''بہت شکریہ جی' آپ کا۔'' بامن کی آواز پر وہ چونکا۔

''اس میں شکریہ کی کیا بات ہے' یہ تو میرا فرض تھا۔'' مراد نے کہا۔ ''تم لوگ کون ہو اور کہاں رہتے ہو؟ تم کو پہلے کبھی نہیں دیکھا؟'' مراد نے ان سے پوچھا۔

''اوپر پہاڑ کے دامن میں ہمارا ڈیرا ہے جی......!'' بامن کہنے لگا۔ ''ہم خانہ بدوش ہیں' کل ہی ڈیرا لگایا ہے۔'' مراد نے اثبات میں گردن ہلائی اور ایک بار پھر نوری کے حسن و جمال میں کھو گیا۔

وہ سولہ سترہ سال کی کومل سی لڑکی پہلی ہی نظر میں مراد کے دل میں بیٹھ گئی۔ رنگ گندمی' نین نقش تیکھے' سیاہ گھنیری زلفیں' بدن کا انگ انگ خوشنما' ہر عضو پرکشش' مراد کو محو پا کر بامن سے رہا نہ گیا' وہ نوری سے سخت لہجے میں بولا۔

''کیا بت بنی کھڑی ہے' چل نا۔'' دوسرے ہی لمحے وہ نوری کا ہاتھ پکڑ کر پہاڑ پر چڑھنے لگا تو پیچھے سے مراد نے آواز دی۔

''گاگر تو لیتے جاؤ۔'' جو ابھی تک اس کے ہاتھوں میں تھی۔ نوری ہاتھ چھڑا کر پلٹی۔ مراد نے پانی سے بھری گاگر اس کے سر پر رکھی' دونوں کی نظریں چار ہوئیں اور ایک دل آویز تبسم دونوں کے ہونٹوں پر پھیلتا چلا گیا۔ عین اس لمحے تیز ہوا کے ساتھ آسمان سے موٹی موٹی بوندیں گرنے لگیں اور چھن چھن کرتی پازیب کی آواز اس سے دور ہونے لگی۔ وہ اس وقت تک وہیں کھڑا رہا جب تک نوری اس کی نظروں سے اوجھل نہ ہو گئی۔ اسی وقت اسے لگا جیسے اس کی کوئی قیمتی شے کھو گئی ہو' سینے میں انوکھا درد اٹھا جیسے اس کے جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر جدا کر دیا گیا ہو۔ وہ آزردہ سا واپس پلٹا' ندی عبور کی' بانسری اٹھائی' قمیص کاندھے پہ رکھی' جوتے پہنے اور گھر کی راہ لی۔

بظاہر وہ موسم کی تمام تر دلفریبیوں سے لطف اٹھاتا گھر پہنچا مگر ندی کنارے سے وہ ایک عجیب قسم کی کسک دل میں سمیٹ لایا۔ اب اسے کسی پل چین نہیں آ رہا تھا۔ جتنی دیر بارش برستی رہی' وہ اپنے گھر کے آنگن میں بے چینی سے ٹہلتا رہا۔ ماں نے اسے بارش میں نہانے سے منع کیا کہ بیمار ہو جاؤ گے' اندر آ جاؤ مگر اس نے ماں کی بات پر کوئی توجہ نہ دی۔ بہن نے پیاری (چھوٹا سا دیہاتی کچن) سے آوازیں دیں۔ ''مراد' کپڑے بدلو اور ناشتا کرلو۔'' اس نے بہن کی بات کو بھی نظر انداز کیا اور سیڑھیاں چڑھتا ہوا چھت پر چلا گیا۔ مکان کے پچھواڑے کھلی زمینیں تھیں۔ تاحد نظر سرسبز لہراتے کھیت تھے۔ ندی کا منظر یہاں سے صاف دکھائی دیتا تھا۔ وہ کافی دیر تک ندی کے نیلے پانی کا نظارہ کرتا رہا۔ سامنے پہاڑ کے دامن سے دھوئیں کی لکیر آسمان کی طرف اٹھتی دکھائی دے رہی تھی۔

'خانہ بدوشوں کا ڈیرہ شاید وہیں پر ہے۔' نوری ایک بار پھر اس کے خیالوں میں مسکرانے لگی۔

وہ زیر لب بڑبڑایا۔ ''اوپر والے نے بھی کمال کر دیا۔ ایک شاہکار تخلیق کیا اور خانہ بدوشوں کے گھر بھیج دیا۔ اسے تو محلوں کی شہزادی ہونا چاہیے تھا۔''

ماں اور بہن نیچے سے آوازیں دے دے کر تھک گئیں مگر اسے آج کسی کی پروا نہ تھی۔ جب اسے اپنے پیچھے سیڑھیوں پر قدموں کی چاپ سنائی دی تو وہ واپس پلٹا۔ اس نے بوڑھی ماں کو سیڑھیاں چڑھتے دیکھا۔

''آیا اماں......! آپ نے کیوں زحمت کی؟''

''جلدی آؤ نیچے۔'' ماں نے اسے ڈانٹتے

ہوئے کہا۔ وہ ماں کے پیچھے پیچھے نیچے اترا' کپڑے بدلے' ناشتا کیا جو کافی حد تک ٹھنڈا ہو چکا تھا مگر بہن نے پھر سے گرم کر دیا تھا۔ بارش تھم چکی تھی مگر بادل نمایاں تھے۔ اس نے بانسری اٹھائی' بھیڑ بکریوں کے باڑے کا جنگلہ کھولا اور ریوڑ کو ندی کی طرف ہانکنے لگا۔ آج وہ وقت سے پہلے ہی ریوڑ کو جنگل کی طرف لے کر چلا تھا۔ ماں نے وجہ پوچھی' بہن نے کریدا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا۔ بھیڑ بکریاں جنگل میں چرنے لگیں۔ وہ ایک اونچے ٹیلے پر جا بیٹھا جہاں سے خانہ بدوشوں کی بستی صاف دکھائی دیتی تھی۔ ٹیلے پر بیٹھا وہ بہت دیر تک نوری کے بارے میں سوچتا رہا۔ غیر ارادی طور پر اس نے نیفے سے بانسری نکالی اور پہاڑی راگ چھیڑا۔ اس کی مخروطی انگلیاں تمام تر ہنرمندی کے ساتھ سروں پر رقص کرنے لگیں۔

بھیگا بھیگا موسم آیا برسے گھٹا گھنگھور
پریت کا پہلا نٹ کھٹ ساون دیکھو مچائے شور

موسم کے حوالے سے یہ گیت اس کے دل میں ایک انوکھی گدگداہٹ پیدا کرنے لگا۔ ایک سرور کی سی کیفیت' لذت کا انوکھا احساس اس پر طاری ہونے لگا۔ اس کی نظریں بار بار دامنِ کوہ کی طرف اٹھ جاتیں جہاں سے دھوئیں کی سرمئی لکیریں آسمان کی طرف اٹھ رہی تھیں۔ وہ خوش بھی تھا اور غمگین بھی۔ اس کا بے قرار دل اس حسینہ کے لیے ضد کرتا کہ ایک بار پھر نظر آئے۔ اس کی متلاشی نظریں بار بار کبھی ٹھاٹھیں مارتی ہوئی ندی کی طرف اٹھ جاتیں اور کبھی ندیا کے دوسرے کنارے کا طواف کرتیں جہاں اس پری چہرے سے ملاقات ہوئی تھی۔ اچانک وہ اسے پہاڑ سے اترتی دکھائی دی۔ مراد اٹھا اور اس سمت دوڑ لگا دی۔ وہ ندی کنارے جا کر رک گیا۔ پانی کا بہت بڑا ریلا گزر رہا تھا۔ پہلے کی نسبت پانی کا بہاؤ تیز تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ ندی پار کیسے کی جائے؟ وہ کچھ دیر تذبذب کے عالم میں کھڑا رہا پھر اس نے اپنی ساری ہمتیں یکجا کر کے ندی میں چھلانگ لگا دی۔ کچھ ہی دیر میں تیز لہروں سے لڑتے ہوئے وہ دوسرے کنارے پر پہنچ گیا۔ نوری ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی درختوں کے جھنڈ سے نمودار ہوئی اور ندی کنارے کھڑے مراد کے پاس آ گئی۔ پہلے تو وہ جھجکی' نسوانی حیا نے اس کے قدم روک لیے۔ وہ مراد سے کچھ فاصلے پر کھڑی گہری نظروں سے اس اجنبی نوجوان کو دیکھنے لگی جس نے اس کے دل کے تاروں کو ایک انوکھی لے پر چھیڑا تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو سرشاری نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ نظروں ہی نظروں میں وہ ایک دوسرے کے اندر اترتے چلے گئے۔ آخر نوری نے خاموشی کے بت کو توڑا۔

''بجاؤ ناں بانسری۔'' اور مراد نے بانسری کے سر چھیڑ دیئے اور نوری ان سروں کی لے میں مدہوش سی ہو گئی۔

اچانک انہیں اپنے قریب ہی کتے کے بھونکنے کی آواز سنائی دی۔ نوری کتے کی آواز پہچانتی تھی۔ کتا ان کا اپنا تھا جسے وہ پیار سے موتی کہتے تھے۔

''کتے کے ساتھ بامن بھی ہوگا۔'' نوری نے سہمے ہوئے انداز میں کہا۔ وہ دونوں بھاگ کر ایک بڑی چٹان کے نیچے بڑے بڑے دیو ہیکل پتھروں کی اوٹ میں جا چھپے۔ نوری کا دل بری طرح دھک دھک کر رہا تھا۔ مراد کے کپڑے گیلے ہونے کی وجہ سے اسے ٹھنڈ لگ رہی تھی۔ نوری اس کے اتنے نزدیک کھڑی تھی کہ اس کے قرب نے اسے بے خود سا کر دیا تھا۔

سرخ و سفید رنگ' دلکش چہرہ' غضب ناک خدوخال' تراشیدہ جسمانی خطوط' ریشمی ملائم کالی سیاہ زلفیں' کمانِ ابرو خوبصورت لانبی پلکیں' ستواں ناک' یاقوتی لبوں پہ کھلتا دل آویز تبسم' شانوں پہ اٹھکھیلیاں کرتے بال' سیب جیسے گال۔ مراد اس پری جمال کے حسن میں ایسا کھویا کہ اسے آس پاس کا کوئی ہوش نہ رہا۔ اس سے پہلے کہ وہ بے خود سا ہو کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیتا' نوری' بامن کے خوف سے تیزی سے چٹان کی پچھلی طرف گھنے درختوں کے جھنڈ میں گم ہو گئی۔ مراد کچھ خاصی دیر تک وہیں بیٹھا نوری کی جسمانی مہک کو محسوس کرتا رہا پھر اسے ریوڑ کا خیال آیا تو وہ پتھروں کی اوٹ سے باہر آیا اور دل کو تسلی دیتا ہوا ندی عبور کرنے لگا کہ نوری اسے دھوکہ نہیں دے گی۔ وہ اسے ہر حال میں حاصل کرے گا۔ اسے یقین تھا' بانسری کی آواز پہ نوری جہاں کہیں بھی ہوئی' بھاگتی چلی آئے گی۔ اس نے ہاتھ میں پکڑی ونجھلی کو میٹھی نظروں سے دیکھا اور چوم لیا۔

بامن رشتے میں نوری کے چچا کا بیٹا تھا اور اس کا منگیتر بھی۔ نوری سے عمر میں سات سال بڑا تھا۔ اس کا نام تو فیاض تھا مگر قد میں ٹھگنا رہ جانے کی وجہ سے سارا قبیلہ اسے بامن کہتا تھا۔ نوری پری عرف نوری قبیلے کے سرخیل کتھک سبائی کی اکلوتی اولاد تھی۔ بہت پیاری لاڈلی کومل سی نور پری قبیلے بھر کے مرد و زن کی آنکھوں کا تارا تھی۔ نوری جوان ہوئی تو حسن کے ساتھ ساتھ قد کاٹھ بھی خوب نکالا۔ بامن اس کے سامنے بونا لگتا اور بالکل بھی نہ جچتا تھا۔ وہ اسی غم میں گھلتا رہتا کہ میرا قد چھوٹا کیوں ہے؟ میں نوری کی طرح لمبا کیوں نہیں؟ وہ کبھی کبھی آسمان کی طرف منہ کر کے خدا سے شکوہ کناں ہوتا کہ تو نے مجھے چھوٹا کیوں بنایا؟ اگر بنایا ہے تو نوری کو بھی چھوٹا رہنے دیتا تا کہ اس کی میری شادی ہو جاتی۔ چھوٹا قد اس کے لیے سوہانِ روح تھا۔ قد بڑھانے کے چکر میں وہ مختلف قسم کی دوائیں اور جڑی بوٹیاں' حکیمی نسخے آزما چکا تھا مگر کچھ افاقہ نہ ہوا۔ وہ کبھی کبھی میلوں دوڑتا' پہاڑی ٹیلے پھلانگتا' درختوں سے لٹکتا' طرح طرح کی ورزشیں کرتا' اپنی ہڈیاں چٹخاتا مگر اس کا قد نہ بڑھنا تھا نہ بڑھا جب ہی ایک دن نوری کی ماں رختی نے بامن اور نوری کی منگنی توڑنے کا اعلان کر دیا جس کا رنج پورے قبیلے کو تھا مگر کسی کی مجال نہ تھی کہ رختی کے فیصلے کو چیلنج کرتا۔ منگنی ٹوٹ جانے کا دکھ سب سے زیادہ بامن اور اس کی ماں نجلی کو تھا۔ قبیلے کے ہر فرد کے سامنے دونوں ماں بیٹے نے دبے دبے لفظوں میں احتجاج کیا' بڑے بوڑھوں کے سامنے روئے پیٹے' فریادیں کیں مگر ان کی بات پر کسی نے توجہ نہ دی۔

بامن کی ماں جب بھی تنہا بیٹھتی' آہیں بھرتی اور کرب بھرے لہجے میں کہتی۔ ''اے کاش' بامن کا باپ آج زندہ ہوتا تو یہ رشتہ کبھی نہ ٹوٹتا۔ نوری میری بہو ضرور بنتی۔''

بامن' نوری کے لیے بے چین رہتا' اس کی جدائی میں چھپ چھپ کر روتا' پہروں سسکیاں بھرتا' صبح شام اس کے ارد گرد منڈلاتا رہتا۔ نوری کو منانے کے سو جتن کرتا مگر اسے کامیابی نہیں ہو رہی تھی۔ وہ منت سماجت کرتے کرتے تھک گیا تھا مگر اس نے امید کا دامن بھی نہیں چھوڑا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ایک دن نور پری کو منا کر اسے اپنی دلہن بنا لے گا۔ اس کی زندگی کا مقصد ہی اب نوری کا حصول تھا۔

اس صبح جب نوری بیدار ہوئی تو اسے ماں کی آواز سنائی دی۔

''دھی رانی' اٹھ' منہ ہتھ دھو۔ میں جب تک چائے بناتی ہوں تو جلدی سے دو چار پھیرے ندی سے پانی بھر لا۔ ایک بوند پانی نہیں' ٹھیکرے

(گھڑے) خالی پڑے ہیں اور بادل سر چڑھ آئے ہیں۔" نوری نے کسلمندی سے بستر چھوڑا۔ منہ پر دوچار چھینٹے پانی مار کر سستی دور کی اور گاگر پہلو میں اٹھائے چل پڑی۔

"ہائے...... اکیلی چل پڑی ہے۔" رختی زیرلب بڑبڑائی۔ "بامن' ہو بامن......" رختی نے درشت لہجے میں بامن کو آواز دی۔

"ماں' اُس بالشت بھر کو ضروری ہے میرے ساتھ بھیجنا؟ مجھے ڈر تو نہیں لگتا۔ ہم کوئی اس علاقے میں نئے نہیں آئے' ہزار دفعہ یہاں خیمے لگا چکے ہیں' وہی ندی' وہی جنگل بیلا' کھیت کھلیان' بھلا ڈر کس بات کا؟" یہ کہتے ہوئے نوری ڈیرے سے نکل آئی' پیچھے ماں اسے آوازیں دیتی رہ گئی کہ بامن کو بھیجتی ہوں' ذرا رک۔ فرحت بخش موسم نے آج نوری کے اندر کے موسم کو ایسی جلا بخشی کہ اُسے پر لگ جاتے تو ہواؤں میں اڑتی۔

قریبی خیمے میں سویا ہوا بامن' تائی اماں کی آواز پر جاگ اٹھا۔ نوری کا نام سنتے ہی اُس کی نیند بھاگ گئی۔ اس نے اپنے اوپر اوڑھی ہوئی رلی کو پرے پھینکا اور خیمہ سے باہر آ گیا۔

تائی ماں نے اسے سبوچہ تھماتے ہوئے کہا۔ "جلدی جا ندی پر' نوری پانی بھرنے گئی ہے۔" وہ سبوچہ بغل میں دبائے نوری کے پیچھے پیچھے پہاڑ اترنے لگا۔ اس نے دل میں سوچا۔ 'موقع اچھا ہے' نوری سے دل کی بات کروں گا۔ اسے شادی کے لیے رضامند کرنے کی کوشش کروں گا' نہ مانی تو اس کے پاؤں پکڑ لوں گا۔'

ٹھنڈی ٹھنڈی فرحت بخش ہوا چل رہی تھی۔ اس دلکش موسم میں مست مست سی نور پری کے من میں چھپی خوشی اس کے یاقوتی لبوں پہ مچل اٹھی اور وہ جھومنے گنگنانے لگی۔

ندی پر ہونے والا خوبصورت حادثہ جو ایک اجنبی نوجوان سے ملاقات کا باعث بنا تھا' فلم کی طرح اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا تھا۔ اس کے دل کا دروازہ نجانے کیوں اس نوجوان کی خاطر خود بخود کھل گیا تھا اور وہ چپکے سے اس کے دل کے سنگھاسن پہ آن بیٹھا تھا۔ وہ بظاہر آنکھیں بند کیے سردی کے بہانے کمبل اوڑھے اپنے خیمے میں تنہا لیٹی ہوئی تھی مگر من کی دنیا اس اجنبی شہزادے کی رفاقت میں ندی کنارے آباد کیے بیٹھی تھی۔ اس انوکھے پن اور میٹھے میٹھے خیالوں میں اسے نیند نے آ دبوچا اور وہ نیند کی وادیوں میں کھو گئی۔

اسے سوئے ہوئے ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ بانسری کی مدھر آواز نے اسے بیدار کر دیا۔ پہلے تو وہ اسے اپنا خوبصورت سپنا سمجھی مگر جب حقیقت کا ادراک ہوا تو وہ چپکے سے خیمہ سے نکلی اور ندی کی طرف جانے والے پہاڑی راستے پر تیز تیز قدموں چلنے لگی۔ اس نے ایک گھنی جھاڑی کی اوٹ میں ہو کر اپنی خیمہ بستی پر نظر ڈالی' تا حد نگاہ اسے پیچھے آتا ہوا کوئی بندہ دکھائی نہ دیا۔ یہ تسلی کر لینے کے بعد وہ قلانچیں بھرتی ندی کی اترائی اترنے لگی اور کچھ ہی دیر میں وہ مراد کے سامنے تھی۔ دونوں کسی خطرے سے بچنے کے لیے ایک بڑی چٹان کے نیچے جا چھپے تھے۔ ابھی دونوں ایک دوسرے کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہے تھے کہ کتے کے بھونکنے سے نوری کی جان ہی نکل گئی۔

"ہائے' میں مر گئی' بامن آ گیا' اس نے دیکھ لیا تو غضب ہو جائے گا۔ میرا باپ قبیلے کا سردار ہے' بڑا غصے والا ہے' اسے پتہ چلا تو وہ مجھے جان سے مار دے گا۔ میں چلتی ہوں پھر ملیں گے اسی جگہ اور ہاں......" وہ چند قدم آگے جا کر پھر واپس پلٹی۔ "اب بانسری نہ بجانا' میں کل اسی وقت یہاں پر آپ کا انتظار کروں گی۔" اور پھر وہ چٹان کے پچھلی طرف سے خیمہ بستی کی طرف نکل گئی۔ واپسی کے لیے اس نے دوسرے راستے کا انتخاب کیا تھا۔

•......•......•......•

"اماں......! اگر نوری مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا' زہر کھا لوں گا یا کسی پہاڑ کی چوٹی سے کود کر جان دے دوں گا۔" بامن روہانسا ہو کر ماں سے کہہ رہا تھا۔

"تیرے منہ میں خاک...... بامن' کیسی باتیں کرتا ہے؟" ماں نے اسے ڈانٹا۔ "تو میرا اکلوتا پتر ہے' تیرا قد چھوٹا ہے تو کیا ہوا' ہے تو انسان کا بچہ ہے' کوئی جن بھوت تو نہیں کہ تجھے کوئی رشتہ نہیں دے گا۔ یہ تو اوپر والے کے کام ہیں' وہ پاک ذات کسی کا قد چھوٹا بنانا چاہے یا بڑا تو اپنا دل چھوٹا نہ کر میرا پتر......!" فجلی نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ "نوری کل بھی تیری تھی' آج بھی تیری ہے تو فکر نہ کر' نوری کا بیاہ تیرے ساتھ نہ کیا تو میرا نام فجلی نور نہیں۔"

"اماں......! آج پتہ ہے' کیا ہوا؟" وہ ماں کے اور قریب ہو گیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی عین غین آنکھیں مٹکاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اماں......! صبح جب میں نوری کے ساتھ ندی پر پانی بھرنے گیا تو ندی کے اُس پار ایک نوجوان بانسری بجا رہا تھا۔ نوری اُس کی طرف متوجہ ہو گئی اور اس کی گگریا پانی میں بہہ گئی۔ میرے شور مچانے پر اس بانسری والے نے ندی میں چھلانگ لگا دی اور گگریا پکڑ کر لا دی اور پتہ ہے اماں......! جب وہ نوجوان گگریا پکڑ کر کنارے پہنچا تو اُس کی نظریں نوری پر جم کر رہ گئیں۔ یہ حرامن بھی اُسے ٹکٹکی باندھے غور سے دیکھنے لگی۔"

"پھر کیا ہوا؟" فجلی نے پوچھا۔

"پھر کیا ہونا تھا اماں......!" بامن نے لمبا سانس کھینچتے ہوئے کہا۔ "میں نے نوری کو ڈانٹا اور بازو سے پکڑ کر گھسیٹتا ہوا گھر تک لایا۔ راستے میں اس نے مجھے بہت گالیاں دیں اور اپنے دل کی بات کہہ دی۔

"اچھا' کیا؟" اماں نے اس سے پر تجسس لہجے میں پوچھا۔

"یہی کہ مجھے تم سے نفرت ہے تو ٹھگنا ہے' موچھا ہے' بونا ہے' میں تجھ سے شادی نہیں کروں گی......"

"ہوں...... شادی نہیں کرے گی۔" فجلی نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ "لونڈیا کے لیے کوئی شہزادہ اترے گا آسمان سے۔ جیسی مائی' ایسی جائی۔" فجلی نے غصے سے پھنکارتے ہوئے اپنے اندر کا زہر اگلنا شروع کیا۔ "اس کی ماں رختی کے لچھن بھی جوانی میں ٹھیک نہیں تھے۔ تیرا تایا اور میرا جیٹھ سردار کتھک میرا بہنوئی بھی تھا' دہرا رشتہ تھا اس لیے میرے منہ سے نکلی ہوئی کسی بھی بات کو رد نہیں کرتا تھا۔ کہتا تھا' رختو' تو...... بھابھی ہی نہیں' میری چھوٹی بہن ہے۔ تیری ہر خواہش پوری کرنا میں اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ ہم سب اہلِ قبیلہ بہت لاڈ پیار' اخلاق اور محبت سے رہتے تھے۔ کشمیر ہمارا وطن ہے' ہمارے پرکھوں نے کوئی مستقل رہائش اختیار نہ کی نہ زمینیں خریدیں' نہ گھر بنائے' بس خانہ بدوشی میں عمریں تیاگ دیں۔ ہم بھی وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہمارے بڑے کرتے رہے' گانا بجانا' منگ پن کے کھانا' بھیڑ بکریاں' مویشی' گائے' بھینسیں' اونٹ تک رکھے' پیسہ کمایا' اچھا کھایا' لگایا' اوڑھا پہنا' کسی چیز کی کمی محسوس نہیں ہوئی پھر جیسے جیسے وقت بیتا' حالات بدلے' سارے جنجال ختم کر دیئے۔ دودھ' مکھن کے لیے اب چند گائیں' بھینسیں اور بکریاں ہیں۔ آنے جانے اور

بار برداری کے لیے گنے چنے ٹٹو اور خچر پال رکھے ہیں۔ باتوں باتوں میں کدھر چلی گئی' ہاں تو بات کررہی تھی اس چڑیل رختی کی' یہ ماجو سپیرے کی بیٹی تھی' چھ بہنوں میں سب سے بڑی' ان کا ڈیرا ہمارے ڈیرے سے چند گز کے فاصلے پر تھا۔ ماجو سپیرے کی میرے سسر سے دوستی تھی۔ میرے سسر کو سانپوں کی تاریخ جاننے اور ہر نسل کا سانپ دیکھنے کا بڑا شوق تھا جسے ماجو سپیرا وقتاً فوقتاً پورا کرتا' نت نئے رنگ و نسل کے سانپ پکڑ کر جب بھی لاتا' میرے سسر کو لازمی دکھاتا۔ اس طرح ہمارا ایک دوسرے کے ڈیرے پر آنا جانا تھا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ میرا جیٹھ سردار کتھک' رختو کو دیکھتے ہی اُس پر فدا ہوگیا۔ اس لونڈی کو اللہ نے حسن بھی بہت دیا تھا۔ بس اپنی اداؤں سے پہاڑ جیسا مرد پھانس لیا اور نکاح کر کے ماجو سپیرے نے اپنا بوجھ ہلکا کرتے ہوئے رختو' سردار کتھک کے حوالے کردی حالانکہ وہ جانتا تھا کہ سردار پہلے سے شادی شدہ ہے۔ میری بہن سجلی' سوکن کو برداشت نہ کرسکی اور وہ اسی غم میں سوکھ کر کانٹا ہوگئی اور ایک دن مرگئی۔ رختو' میری بہن کی قاتل ہے......" بامن بڑے غور سے ماں کی باتیں سنتا رہا۔ ماں بیٹا اپنی جھگی میں بیٹھے گرم گرم چائے کی چسکیاں لیتے خاندانی پس منظر پر تبصرہ کرتے رہے اور نوری کے حصول کے لیے منصوبے بناتے رہے۔

بارش تھم چکی تھی مگر ننھی ننھی پھوار لگی ہوئی تھی۔ پیٹ کا ایندھن جمع کرنے کے لیے اہلِ قبیلہ کاندھوں پر بغلیاں لٹکائے ہاتھوں میں کشکول پکڑے گلے میں مختلف رنگوں کے موتیوں اور منکوں کی مالائیں ڈالے' ایک ایک کر کے اردگرد کے مختلف دیہاتوں میں بکھر گئے۔ خیمہ بستی خالی ہوگئی' ڈیرے پر بوڑھے اور بچے ہی رہ گئے۔ نوری بھی قبیلے کی باقی لڑکیوں کی طرح عورتوں کے ساتھ بھیک مانگنے جاتی تھی مگر جب سے جوان ہوئی' ماں نے اسے ساتھ لے جانا چھوڑ دیا تھا۔ اب وہ زیادہ تر ڈیرے پر ہی رہتی' بزرگوں کی سیوا کرتی اور چھوٹے بچوں کے کھانے پینے کا خیال رکھتی' کام سے فارغ ہوکر وہ تاڑ (دف) لے کر بیٹھ جاتی اور گیت ماہیا' ٹھمری' صوفیانہ کلام گاتی کہ اس کی خوش الحانی سے جنگل بیلا جیسے رقص کرنے لگتے' راہ چلتے مسافروں کے قدم رک جاتے' گڈوی بجاکر جب وہ صوفیانہ کلام اور پرانے گیت گاتی تو انسان کیا' چرند پرند بھی ہمہ تن گوش ہوجاتے۔ دن بھر قریہ قریہ' کوبہ کو' شہر شہر' گاؤں گاؤں' دربدر گھوم پھر کر اہلِ قبیلہ شام سے قبل جب واپس لوٹتے تو مانگا تانگا رزق اکٹھا کرتے اور سب مل جل کر کھاتے' جو بڑے بوڑھے ڈیرے پر رہ جاتے' وہ دن بھر جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر اکٹھی کرتے' شام ہوتے ہی انہیں جلا کر قبیلے والے آگ تاپتے' الاؤ کے اردگرد ایک میلے کا ساماں ہوتا' سب چھوٹے بڑے قبیلے کے بزرگوں سے جن پریوں کی الف لیلوی داستانیں سنتے' طبلہ' ہارمونیم بجانا اور سکھانا نسل درنسل چلا آرہا تھا۔ سر سنگیت اور راگ ردہم کا علم رکھنا گویا قبیلے کے ہر نوجوان پہ لازم تھا۔ عورتیں بھی بڑی خوش الحان تھیں۔ اردگرد کے دیہات یا شہر میں کہیں شادی بیاہ ہوتا' یہ لوگ اپنے اپنے آلاتِ موسیقی لیے پہنچ جاتے۔ ڈھول' ماہیے' جگنی' علاقائی زبان میں شعر و ٹپے گا کر دادِ تحسین حاصل کرتے اور کرنسی نوٹوں سے جیبیں بھر لیتے۔ عورتیں گڈوی بجاکر' شادی بیاہ کے گیت سنا کر انعام واکرام پاتیں۔

نوری کی ماں رخمت نور عرف رختی اپنے وقت میں بلا کی حسین تھی۔ آواز بھی قدرت نے بہت خوبصورت دی تھی۔ فلمی دنیا میں جانے کا خواب اس نے دیکھا ضرور تھا مگر وہاں تک پہنچ نہیں پائی تھی۔

گزرے ماضی کو کریدتے ہوئے کبھی کبھی رو پڑتی اور پرعزم انداز میں کہتی۔ "جہاں تک میں نہ پہنچ سکی' میری نور پری ضرور پہنچے گی۔ وہ ایک دن فلم انڈسٹری کی نمبر ون ہیروئن ہوگی۔" اپنے ادھورے سپنوں کی تکمیل کے لیے اب وہ نوری کو تیار کررہی تھی۔ اس نے جوانی کے وقت کا ٹرانزسٹر ریڈیو بہت سنبھال کے رکھا ہوا تھا جو اس کے لیے سردار کتھک بڑے چاؤ سے دہلی سے تحفہ لایا تھا۔ کسی زمانے میں ریڈیو پر چلنے والے فرمائشی گیتوں پر وہ ڈانس کیا کرتی تھی' آج وہ اپنا فن نوری میں منتقل کررہی تھی۔ نوری بلا کی رقاصہ تھی' اپنی ماں سے چار ہاتھ آگے۔ اگر وہ فلم انڈسٹری تک پہنچ جاتی تو تہلکہ مچا دیتی۔ نوری کی آواز میں وہ جادو تھا کہ سننے والے کو اپنی گرفت میں لے لیتا تھا۔ ماں اس پر بہت محنت کررہی تھی۔ وہ جب کسی کے منہ سے نوری کے بارے میں تعریف سنتی تو فخر و غرور سے اس کی گردن تن جاتی۔

وہ متکبر لہجے میں کہتی۔ "میری نور پری جیسا بھی بھلا کوئی ہے' میری کوکھ سے دوسری لتا نے جنم لیا ہے۔"

بامن نے بندروں کا جوڑا پال رکھا تھا' وہ ڈگڈگی بجا کر' بندر نچا کر اپنا رزق کماتا تھا۔ اس کی اپنی حرکتیں بندروں جیسی ہی تھیں' انتہائی پھرتیلا اور چست و چالاک۔ بامن ہر وقت نوری کی ٹوہ میں ہی لگا رہتا تھا۔ جب سے نوری کا مراد سے ٹکراؤ ہوا تھا' وہ چوری چھپے نوری پر زیادہ نظر رکھنے لگا تھا۔ ایک دن جنگل میں لکڑیاں کاٹتے ہوئے نوری کو شہد کا چھتہ نظر آیا جو چھوٹی مکھیوں کا تھا۔ نوری نے دور ٹیلے پر بیٹھے ہوئے بامن کو آواز دی۔ بامن بھاگتا ہوا آیا۔

"کیا بات ہے نوری' کوئی سانپ دیکھ لیا؟"

"میں سانپ دانپ سے نہیں ڈرتی' چل' جلدی سے شہد اتار کے دے۔ وہ دیکھ' سامنے جھاڑی میں لگا ہوا ہے۔"

"ٹھیک ہے' میں برتن لے کر آتا ہوں۔" وہ بہت خوش تھا کہ بڑے عرصہ کے بعد نوری نے اس سے کوئی فرمائش کی تھی۔ وہ برتن لے کر فوراً آگیا اور شہد اتارنے لگا۔ نوری اس سے کچھ فاصلے پر جھاڑی کے پیچھے چھپی بامن کو بددعائیں دے رہی تھی کہ اس ٹھنگنے مردود کو شالا مکھیاں کاٹیں' اتنی کاٹیں کہ مر ہی جائے......وہ اس کے پیار کا دشمن تھا' اسے بالکل بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بامن نے چہرہ ڈھانپ کر شہد کی ٹہنی کاٹ لی اور چھتہ لے کر وہاں سے دور بھاگ گیا۔ اسے بدن پر بہت سی مکھیوں نے کاٹا مگر نوری کی خاطر اس نے کوئی پروا نہ کی۔ وہ دونوں شہد کے گلوپھے کھاتے ہوئے ڈیرے کی طرف چل پڑے۔ نوری سنجیدہ تھی مگر بامن کی باچھیں خوشی کے مارے کھِلی جارہی تھیں۔ نوری دل ہی دل میں اسے کوس رہی تھی۔

"شالا' تجھے وڈا بخار آجائے اور تجھے فرشتہ چک لے تو کیوں میری جان کے پیچھے پڑا ہوا ہے ٹھنگنے' کمینے' بندر کی اولاد؟" اور پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ بامن کو بخار نے آلیا' مکھیوں کے زہر نے ایسا اثر دکھایا کہ وہ سات دن منجی پہ پڑا کراہتا رہا۔ قبیلے کے ہر شخص نے اس کی عیادت کی' سوائے نوری کے' اس بات کا اسے بہت دکھ تھا کہ جس کی خاطر جان مار کر شہد اتارا' خود کو مکھیوں سے ڈسوایا' اس نے خبر ہی نہ لی۔

مراد بکریوں کو ہانکتا ہوا گاؤں سے باہر کھلی فضا میں پہنچا تو اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ آج نوری سے ملاقات ضرور ہوگی۔ اس نے بانسری نکالی' ابھی اس نے لب رکھے ہی تھے کہ اسے نوری کے وہ الفاظ یاد آگئے جو اس نے بچھڑتے وقت کہے تھے۔ "اب

بانسری نہ بجانا۔'' وہ جانتی تھی کہ بانسری کی آواز خیمہ بستی کے مکینوں کے کانوں تک پہنچ کر ہر شخص کو اس کی موجودگی کا احساس دلاتی ہے۔ ان دونوں کی ملاقات اسی چٹان کے نیچے ہوا کرتی جہاں وہ پہلی مرتبہ ایک لمحے کے لیے مل کر بچھڑ گئے تھے۔ پچھلے ایک ہفتے سے نوری اس سے مل نہیں پائی تھی کہ بامن کی بیماری کے بہانے اس کی ماں نچلی ڈیرے پر موجود رہتی اور نوری کی حرکات وسکنات اپنے جیٹھ سردار کتھک تک پہنچاتی وہ اپنی بیوی رختی سے دبتا تھا مگر اپنی بیوہ بھابھی کا ہمدرد و غم گسار تھا لیکن اندر خانے دال میں کچھ کالا بھی تھا جس کی وجہ سے دونوں میاں بیوی میں اکثر جھگڑا رہتا تھا مگر جیت ہمیشہ رختی کی ہی ہوتی اور کتھک سردار خاموش رہنے میں ہی عافیت سمجھتا۔

ڈیرے پر اب تقریباً سب ہی کو پتہ چل گیا تھا کہ نوری ونجھلی والے نوجوان کو ملنے جاتی ہے مگر اس بات کا برملا اظہار ابھی تک کسی نے نہیں کیا تھا۔ بامن اور اس کی ماں نے اندر خانے کو بدنام کرنے کی کوئی کسر نہ چھوڑی تھی۔ عشق اور مشک بھلا کب چھپائے چھپتے ہیں' مراد اور نوری کی محبت کے چرچے جنگل بیابانوں سے ہوتے ہوئے آباد مکانوں تک پھیلتے چلے گئے۔ کتھک قبیلے میں جب اس محبت کی بازگشت پہنچی تو سردار نے نوری کو پابہ زنجیر کرنے کا حکم صادر کیا جسے رختی سرداران نے رد کر دیا۔

''خبردار' میری بیٹی کا کوئی نام نہ لے' کس کی جرأت ہے جو میری بیٹی کو پابہ زنجیر کرے؟ میں اسے کچا نہ چباؤں گی۔ بڑے آئے نیک اور پارسا' میں سب کے لچھن جانتی ہوں' میرا منہ نہ کھلواؤ۔'' بیوی کے سامنے سردار کی بولتی بند ہوگئی۔ رختی رعب دار اور دبدبے والی عورت تھی' کسی کی مجال نہیں تھی کہ اس کے سامنے کوئی الٹی سیدھی بات کرے۔ قبیلے کا ہر فرد جانتا تھا کہ رختی غصہ کی تیز ہے اسی لیے سردار نے اس وقت خاموشی اختیار کر لی تھی۔ جب معاملہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو سردار نے تنہائی میں اپنی بیوی کو صبر وتحمل سے سمجھایا۔

''دیکھ نوری کی ماں! نور ہماری اولاد ہے' ہمارے جگر کا ٹکڑا ہے۔''

''جبھی اس کے پاؤں میں زنجیریں ڈالنے کی باتیں کرتے ہو۔'' رختی نے جلے ہوئے لہجے میں کہا۔

''اوہو' سنو تو سہی نیک بخت' نوری ہمیں جان سے زیادہ عزیز ہے۔ ہم اس کا بھلا ہی سوچیں گے۔ جو کچھ ہو رہا ہے' غلط ہو رہا ہے۔ لڑکی کو سمجھاؤ جس راستے پہ چل نکلی ہے' اگر نہ روکا تو ہماری عزت خاک میں مل جائے گی۔ ایک ماں بن کر سوچ' کچھ خیال کر......''

''میں نے سوچ لیا ہے۔'' رختی نے دوٹوک الفاظ میں کہا۔

''کیا سوچا ہے تو نے؟'' سردار بولا۔

''میری نوری کا جو دل کرے گا' وہی کروں گی۔'' یہ سن کر سردار سوچ میں پڑ گیا۔

کچھ توقف کے بعد سردار نے بڑے تحمل سے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے تو اپنی کہانی پھر دہرانا چاہتی ہے؟'' سردار نے غصہ دباتے ہوئے کہا۔

''جو بھی سمجھو۔'' رختی نے بے پروائی سے کہا۔

''ٹھیک ہے' اگر تیری یہی ضد ہے تو پھر میرا فیصلہ بھی سن لے۔'' سردار نے حتمی انداز میں کہا۔ ''جو وعدہ مرتے دم تک میں نے اپنے مرحوم بھائی سے کیا تھا' وہ میں ضرور پورا کروں گا۔ نوری کا بیاہ بامن سے ہی ہوگا اور آج ہی ہوگا۔'' آج سردار کے اندر اتنی جرأت نجانے کہاں سے آ گئی؟ اس نے دلیری کا مظاہرہ بیوی کے سامنے کر تو دیا مگر اس کی باتوں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ رختی جیسے ہتھے سے

اکھڑ گئی۔

''یہ ظلم ہے' زیادتی ہے' ناانصافی ہے' میں یہ ستم اپنی بیٹی کے ساتھ نہیں ہونے دوں گی۔ نوری کے ابا' پہلے اس ناٹے کا قد تو دیکھ۔ میری بیٹی کے ساتھ کہیں نہیں جچتا۔ کیوں بچی کی زندگی برباد کرتا ہے؟'' رختی نے چیختے ہوئے کہا اور غصے میں جھونپڑی سے باہر نکل گئی۔

•......•......•......•

''مراد' کیا دیکھا ہے تو نے اس فقیرنی میں جو تو اسی کے گیت گاتا پھر رہا ہے؟ تیری کزن ہزار درجے اس سے بہتر ہے' اس کا حسب نسب ہے' خاندان ہے' تیری خالہ کی بیٹی ہے' تیرا خون ہے' وہ خانہ بدوش نجانے کون ہیں؟ کہاں سے آئے ہیں؟ کس نسل سے تعلق ہے؟ تم کچھ نہیں جانتے اس لیے میرے دوست' فقیرنی کا خیال چھوڑ دو اور اپنی امی کی بات مان لو۔ بھاگ بھری تیرے بچپن کی منگ ہے اور منگ کبھی کسی نے نہیں چھوڑی' یہ ہمارے علاقے کی روایت ہے۔'' فضلو جو مراد کا جگری یار تھا' آج اسے بڑے بھائی کی طرح سمجھا رہا تھا۔ بکریاں نیچے 'رکھ' میں چر رہی تھیں اور وہ دونوں پہاڑی ٹیلے پر بیٹھے ہوئے تھے جہاں سے چہاروں طرف خوبصورت مناظر من کو لبھاتے تھے۔ مغرب کی جانب پہاڑی ڈھلوان پر انہیں اپنا پیارا گاؤں نور پور صاف دکھائی دے رہا تھا اور مشرق کی طرف پہاڑ کے دامن میں خانہ بدوشوں کی خیمہ بستی تھی جہاں نوری آنے والی شب کے انتظار میں بے چین چارپائی پر لیٹی گہری سوچوں میں غرق تھی۔ اسے کھانے کی پروا تھی نہ پہننے کی۔ وہ اندر سے ٹوٹ کر رہ گئی تھی۔ پچھلے کئی روز سے خیمہ بستی میں اسی کی ذات زیر بحث تھی۔ ماں باپ کے درمیان ہونے والے جھگڑے کی ذمہ دار بھی اسی کی ذات تھی۔

''میں مراد سے پیار کرتی ہوں' کرتی رہوں گی' میرا ابا یوں کیسا پتھر دل انسان ہے' اسے میری بالکل پروا نہیں' باپ تو بیٹیوں کی خوشیوں پہ قربان ہو جاتے ہیں۔ یہ کیسا باپ ہے جو میری خوشیوں کا قاتل ہے اس ناٹے بھتیجے کی خاطر؟'' وہ غصہ سے تلملاتی زیرلب بڑبڑا رہی تھی۔ ''شالا' تجھے پہاڑی کالا ناگ کاٹے تو دوسرا سانس نہ لے کمینے......'' نوری نے غصے سے بامن پر گالیوں کی بوچھاڑ کر دی۔ ''اچھا ہوا تو باندر لے کر پھیری پر نکلا ہوا ہے۔ اگر ابھی میرے سامنے ہوتا تو میں تیرا گلہ دبا دیتی۔ سب میرے پیار کے دشمن ہیں......'' وہ سسکنے لگی' بہت دیر تک آہیں بھرتی رہی اور اسی طرح روتے روتے اس کی آنکھ لگ گئی۔ رات کے نجانے کون سے پہر اس کی ماں نے اسے جگایا۔

''دھی رانی......! کوئی ٹکڑ پانی کھا پی لے تو نے دو دن سے کچھ نہیں کھایا۔ اٹھ میری بچی......!'' ماں نے زبردستی اسے چند نوالے کھلائے۔

''ماں......! رات کا کون سا پہر ہے؟'' نوری نے ماں سے سرگوشیانہ انداز میں پوچھا۔

''ذرا باہر نکل کر آسمان پر ستاروں کی چال دیکھ' کرکٹیاں اور ترنگڑ کتنا سفر طے کر چکے ہیں۔''

(آسمان پر باریک ستاروں کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں جھرمٹ کی صورت میں کرکٹیاں کہلاتی ہیں جبکہ ترنگڑ تین ستاروں کی لائن کو کہتے ہیں۔ آدھی شب سے قبل ہی آسمان پر یہ جھرمٹ جگمگانے لگتے ہیں اور پھر مشرق سے مغرب کی طرف نظامِ شمسی کے اصول کے مطابق شب بھر محوِ سفر ہوتے ہیں۔) خیمے سے نکل کر رختی نے آسمان پر چمکتے ستاروں پر ایک طائرانہ نگاہ ڈالی اور اندر جا کر بیٹی کے کان میں سرگوشی کی۔

''تیرے جانے کا وقت ہوگیا ہے۔ اٹھ' جلدی

کر' مراد تیری راہ تکتا ہوگا اور ہاں' ملاقات کر کے جلدی آنا۔'' بیٹی کو دبے پاؤں گھپ اندھیری رات ندی کی طرف جانے والے راستے پر ڈال کر رختی مڑنے لگی تو ماں کی ممتا نے جگر کے ٹکڑے کو تنہا جانے کی اجازت نہ دی۔ ایک خوف تھا' ڈر تھا' عجیب قسم کے وسوسے دل میں سر ابھارنے لگے حالانکہ پہلے اس طرح کا اضطراب کبھی نہ ہوا تھا۔ وہ کئی مرتبہ اکیلی جا چکی تھی۔

''میں تجھے توڑ چھوڑ کے آؤں گی نوری' میرا دل نہیں مان رہا۔'' رختی نے اپنی تیز دھڑکنوں پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''ماں......! تو واپس مڑ جا' میں چلی جاؤں گی' مجھے کوئی ڈر نہیں لگتا۔''

''ٹھیک ہے لیکن میری طرف سے اسے یہ ضرور کہنا کہ چار کلمے پڑھا کر پکے کاغذوں پہ انگوٹھے لگوا لے۔ یہ سلسلہ اب زیادہ نہیں چلے گا۔ نکاح کر کے ان ظالموں سے دور چلی جا۔''

•......•......•......•

''ماں......! خدا کے لیے' چپ ہو جا۔ دونوں ماں بیٹی میرا مغز چٹ گئی ہو۔ میں نے جو کہنا تھا' کہہ دیا۔ میں نوری کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میری شادی ہوگی تو نوری سے بس......وگرنہ ساری عمر کنوارہ بیٹھا رہوں گا لیکن بھاگ بھری سے شادی نہیں کروں گا۔''

''بیٹا......! ایسا نہ کہو' بھاگ بھری میری بہن کی ایک ہی بیٹی ہے' تیرے بچپن کی منگ ہے۔ اللہ مغفرت فرمائے' تیرے باپ روشن دین کو' اسی نے اپنی زندگی میں یہ رشتہ طے کیا تھا۔ اب اگر تو انکار کرتا ہے تو سوچ' تیرے باپ کی روح کو کتنی تکلیف پہنچے گی؟'' ماں نے اسے پیار سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ مراد چپ چاپ اٹھ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔

''ماں' اس چڑیل فقیرنی نے نجانے کیا گھول کر پلا دیا میرے بھائی کو' ہر وقت چپ چاپ رہتا ہے' ہنستا بولتا بھی نہیں۔ پہلے تو میرے ساتھ بہت مذاق کرتا تھا' اب سنجیدہ و رنجیدہ رہتا ہے۔'' مریم نے دکھی لہجے میں کہا۔ ماں جو بیٹے کے رویئے سے پہلے ہی دل گرفتہ تھی' رونے لگ گئی۔ مریم کی بھی آنکھیں چھلک پڑیں۔

•......•......•......•

مراد کا دل مضطرب تھا' وہ کافی دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتا رہا اور اٹھ بیٹھا۔ کلائی پر بندھی گھڑی دیکھی' رات کے ساڑھے بار بجے تھے' اس نے چپکے سے بیڈ چھوڑا' بیٹھک کو باہر سے کنڈی لگائی اور اندھیرے میں ایک طرف چل دیا۔

دونوں پریمی بڑے بڑے پتھروں کی آڑ میں بیٹھے ایک دوسرے کو محبت پاش نظروں سے دیکھ رہے تھے۔

''سچ بتاؤں نوری' جب سے تو ملی ہے' محبت کی حقیقت اور عظمت کا ادراک ہوا ہے' پہلے اتنی سمجھ نہیں تھی۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اب یوں لگتا ہے کہ تیرے بنا زندہ رہنا ناممکن ہے تو میرے وجود کا حصہ بن گئی ہے۔ مجھے تجھ سے عشق ہو گیا ہے' کیا بتاؤں' کھلی آنکھوں میں تیری صورت' بند آنکھوں میں تیرے سپنے' سوتے جاگتے' اٹھتے بیٹھتے جدھر دیکھتا ہوں' مجھے تو ہی تو نظر آتی ہے۔ اگر خدانخواستہ تو مجھے نہ ملی تو میں مر جاؤں گا۔''

''نہیں......'' نوری نے اپنا مرمریں ہاتھ مراد کے لبوں پر رکھ دیا۔ ''نہیں مراد' پھر ایسا نہ کہنا' میرے جسم سے روح نکل جائے گی۔ میں بھی تو تجھ پر مرتی ہوں' نجانے مجھے کیا ہو گیا ہے کہ تیرے سوا کچھ دکھائی نہیں دیتا' عشق نے مجھے بھی جلا رکھا ہے' دن کو چین نہ رات کو سکون ہے۔ مراد' کیا کر دیا ہے تو نے مجھے؟'' اس نے سسکتے ہوئے سر مراد کے سینے پر رکھ دیا۔

''نوری' میں جانتا ہوں' تجھ پر کیا بیت رہی ہے۔'' مراد نے اس کی لانبی زلفوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے کہا۔ ''مگر کچھ مجبوری ہے' ماں میری شادی اپنی بہن کی بیٹی سے کرنا چاہتی ہے جو میرے بچپن کی منگ ہے۔ امی نے ماموں کو پیغام بھیجا ہے' وہ کشمیر میں ہوتے ہیں' تھانے میں ہیڈ محرر ہیں' اسی معاملے کو سلجھانے کے لیے امی نے بھائی کو بلایا ہے کیونکہ میں نے بھاگ بھری سے شادی نہ کرنے کی قسم کھالی ہے۔ کل رات خالہ اور خالو دونوں آئے تھے' مجھے رات گئے تک سمجھاتے رہے۔ نوری' میں......''

''میں سمجھ گئی ہوں مراد......!'' نوری نے اس کی بات کاٹتے ہوئے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم بھاگ بھری سے شادی کر لو۔''

''کیا؟'' مراد نے اپنے دونوں ہاتھوں کے کٹورے میں اس کا چہرہ لیتے ہوئے دکھ سے کہا۔ ''نوری' یہ تو کہہ رہی ہے؟''

''ہاں' میں کہہ رہی ہوں' میں تجھے تیرے خاندان سے جدا نہیں کرنا چاہتی اور نہ ہی ماں کا نافرمان بیٹا بنانا چاہتی ہوں۔''

''اور تو کیا کرے گی؟''

''میں......میرا کیا ہے' تیرے نام یہ عمر ہو جاؤں گی۔'' نوری نے شکست خوردہ لہجے میں کہا۔

''نہیں' ہم جئیں گے تو ساتھ' مریں گے تو ساتھ۔'' اس نے نوری کو اپنے بازوؤں کے حصار میں بھر لیا۔ وہ ایک جھٹکے کے ساتھ اس سے الگ ہوئی اور خیمہ بستی کی طرف جانے لگی اور مراد اسے جاتا دیکھتا رہ گیا۔

بامن بھنگ کوٹ رہا تھا' بادام' پستہ' مغز اور نشہ آور طرح طرح کی جنگلی بوٹیاں اس میں شامل کر کے کچھ ہی دیر میں زبردست قسم کا نسخہ تیار کیا اور کٹورہ بھر کر تایا سردار کو تھمایا اور دوسرا کٹورہ خود ڈکار گیا۔ تھوڑی ہی دیر میں دونوں نشے کی حالت میں بے سدھ پڑے تھے۔ یہ تقریباً ان کا روز کا معمول تھا۔ سردار نشے کا عادی تھا اور بامن بھی بلکہ قبیلے کے زیادہ تر نوجوان نشہ کرتے تھے۔

رختی نے دونوں تایا بھتیجے کو خیمے میں سوتا دیکھ کر خدا کا شکر ادا کیا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں بامن' نوری کے پیچھے نہ نکل گیا ہو۔ اس سے قبل ایک دو مرتبہ شک کی بنا پر وہ نوری کا پیچھا کر چکا تھا مگر اس وقت نوری نے ماں کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔ جب نوری نے ایک رات ماں کے پوچھنے پر ساری کہانی کہہ سنائی تو ماں اس کا ساتھ دینے لگی کیونکہ وہ جانتی تھی کہ محبت کی آگ اگر انسان کے دل میں بھڑک اٹھے تو وہ کس قدر اذیت ناک ہوتی ہے۔ جوانی میں اس نے بھی محبت کی تھی اور محبت کے نشے سے وہ خوب واقف تھی۔ اب جس رات نوری کو مراد سے ملنا ہوتا' وہ شام سے پہلے ہی گھوٹے کے لوازمات پستے بادام بامن کے حوالے کر دیتی تاکہ رات کو وہ پی کر نشے میں مدہوش ہو جائیں اور محبت کے پجاری مل پائیں۔

•......•......•......•

''تایا ابا' میں سچ کہہ رہا ہوں' آپ میری بات پر یقین کریں' آدھی رات کو نوری اس وجلی والے عاشق سے ملنے جاتی ہے۔ شک تو مجھے پہلے بھی تھا مگر تائی ماں کے ڈر سے خاموش رہا۔ گزری رات جب سب لوگ بے خبر سو رہے تھے' میرے پیٹ میں گڑبڑ تھی جس وجہ سے بار بار اٹھتا رہا۔ نوری چپکے سے دبے پاؤں میرے قریب سے گزر گئی۔ میں جھاڑی کے پیچھے رفع حاجت سے فارغ ہو رہا تھا۔ اس نے

مجھے نہیں دیکھا۔ مجھے تشویش ہوئی' میں کچھ فاصلہ رکھ کر اس کے پیچھے چلنے لگا۔ وہ سیدھی اس پہاڑی چٹان کے نیچے پہنچ گئی جہاں وہ پہلے دن اس لڑکے سے ملی تھی اور میں نے دونوں کو دیکھ لیا تھا۔ آج جب وہ وہاں پہنچی تو وہ نچلی والا پہلے سے وہاں موجود تھا۔ دونوں کافی دیر تک رازونیاز کرتے رہے حتیٰ کہ پو پھٹنے کے وقت دونوں جدا ہوگئے۔''

''اچھا تو بات یہاں تک پہنچ چکی ہے۔'' سردار نے غصہ کو دباتے ہوئے تلخ لہجے میں کہا۔

''جی تایا ابا......!'' بامن نے اثبات میں گردن ہلائی۔

•......•......•

گھپ اندھیری' سیاہ کالی رات وہ اپنے محبوب کی آغوشِ الفت میں سر رکھے میٹھی میٹھی باتوں میں مصروف تھی کہ اچانک زمین نے زقند بھری' پہاڑ شق ہوا اور آناً فاناً وہ چٹان جس کے نیچے وہ دونوں پیار کے متوالے محوِ گفتگو تھے' ان کے اوپر آن گری۔ اس کے بعد کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مراد کہاں کھو گیا؟ وہ مراد مراد کرتی چیخ اٹھی۔

''کیا ہوا میری بچڑی......! ہائے اللہ! خیر' کوئی ڈراؤنا خواب دیکھا ہے؟'' رختی جو نوری کی چیخ سن کر اٹھ بیٹھی تھی' عجلت میں باہر کی طرف بھاگی اور صراحی سے پانی کا کٹورہ بھر لائی۔ نوری کے لبوں سے لگایا جو بدحواس سی تھی۔ رختی نے آگے بڑھ کر بیٹی کو سینے سے لگا لیا اور دلاسہ دینے لگی۔ ''صبر دھی رانی' اللہ خیر کرے گا۔'' نوری کی چیخ و پکار سے تمام چھوٹے بڑے اٹھ کر نوری کے خیمے میں آگئے۔ سردار کتھک جو ابھی تک سویا نہیں تھا بلکہ اپنے خیمے میں گاؤ تکیے سے ٹیک لگائے حقہ گڑگڑا رہا تھا اور کسی گہری سوچ میں غرق تھا' چیخ کی آواز سن کر اپنے خیمے سے باہر آیا۔

''رختی' کیا مسئلہ ہے' نوری کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

''ہاں' ٹھیک ہے' کوئی ڈراؤنا خواب دیکھ کر بڑبڑائی ہے۔'' رختی نے ناگوار لہجے میں کہا۔

''اور تم سب لوگ ادھر کیوں جمع ہو؟ کیا میلہ لگا رکھا ہے؟ جاؤ اپنے اپنے جھانپڑوں میں جا کر سو جاؤ۔'' سردار کی ڈانٹ سن کر سب کھسک گئے اور سردار خاموشی سے واپس اپنے خیمے میں چلا گیا۔

•......•......•

''رب سائیں خیر کرے۔ بامن ابھی لوٹا نہیں' کارروائی ڈالنے سے قبل کہیں مراد سے نہ ٹکرا گیا ہو۔ پھر بھی ٹھیک نشانے پر رکھوا کے آیا تھا۔ رات کافی ہو چکی ہے' ہو سکتا ہے' وہ مراد آج آیا ہی نہ ہو۔'' سردار کے گہرے سانولے چہرے پر تشویش نمایاں تھی۔ طرح طرح کے وسوسے دل و دماغ میں گڈمڈ ہو رہے تھے کہ اچانک خیمے کے باہر اسے قدموں کی چاپ سنائی دی۔ سردار اپنی جگہ سے اٹھا ہی تھا کہ بامن ہانپتا کانپتا اندر داخل ہوا۔

''تایا ابا' ہو گیا کام......مک گیا بندہ......'' اس نے سرگوشیانہ انداز میں لڑکھڑائے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''وہ لڑکا جیسے ہی چٹان کے نیچے اپنی مخصوص جگہ پر پہنچا' میں نے تراڑ (بہت بڑا وزنی پتھر) کو دھکا دے دیا جو ٹھیک اس عاشق کے اوپر گرا۔ اس دھڑاکے میں ایک ہلکی سی انسانی چیخ فضا میں ابھری پھر پہلے جیسی خاموشی چھا گئی۔ اب کیا ہو گا تایا ابا' مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے؟'' بامن نے تھوک نگلتے ہوئے خوف زدہ لہجے میں کہا۔

''کچھ نہیں ہو گا۔'' سردار نے لاپروائی سے کہا جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ''تم ابھی اور اسی وقت رام پور چلے جاؤ اپنی پھوپھی کے پاس اور جب تک میں پیغام نہ بھیجوں' ادھر مت آنا۔ معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا تو

میں تجھے خبر کر دوں گا۔ جاؤ......''

اگلی صبح کا سورج نکلا تو یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح پورے علاقے میں پھیل گئی کہ روشو لوہار کا بیٹا مراد ایک پہاڑی تودے کے نیچے دب کر مر گیا۔ یہ خبر اس کے جگری یار فضلو نے اس کے گھر تک پہنچائی تو گاؤں میں ایک کہرام سا مچ گیا۔ مراد کی ماں اور بہن پر غشی کے دورے پڑنے لگے۔ ان پر قیامت ہی تو گزر گئی۔ مراد کے ماموں جو تھانے میں ہیڈ محرر کی ڈیوٹی کرتے تھے' جب ان کو اس واقعے کا علم ہوا تو وہ پولیس کی نفری لے کر خانہ بدوشوں کے ڈیرے پر جا پہنچے۔ وہاں موجود ہر شخص سے پوچھ گچھ کی گئی مگر ڈھنگ کا جواب کسی سے نہ ملا البتہ بامن کو نہ پا کر اس کے بارے میں استفسار کیا گیا تو سب نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ پولیس نے لاش پتھر کے نیچے سے نکال کر پوسٹ مارٹم کے لیے بھجوا دی۔ پولیس کو دیکھ کر نوری جو بخار میں رات سے تپ رہی تھی' اٹھ بیٹھی۔ پہلے تو اس کی سمجھ میں کچھ نہ آیا لیکن جب اسے اپنے محبوب کی موت کا علم ہوا تو اس کی حالت بگڑ گئی' آنکھوں کے دیدے پھیل گئے' چہرے کا رنگ ہلدی مائل ہو گیا' دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہو گئیں' سانس اکھڑنے لگی اور دیکھتے ہی دیکھتے اس کی حالت غیر ہو گئی' وہ پیٹھ کے بل پیچھے گری مگر ماں نے اسے گرنے کی بجائے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔

''نوری......! نوری......! میری بچڑی......! کیا ہو گیا تجھے؟ ہو نوری کے ابا......! دیکھ دھی نوں کیہ ہو یا؟ پانی لا' جلدی کر۔'' دفعتاً رختی کے بازوؤں میں نوری کی گردن ایک طرف لڑھک گئی اور وہ اپنے مراد کے پاس جا پہنچی۔ نوری کی موت پر خانہ بدوشوں کے ڈیرے پر صفِ ماتم بچھ گئی۔ رختی پاگلوں کی طرح سینہ کوبی کر رہی تھی۔ چیختی چلاتی' بال نوچتی وہ سردار کتھک کی طرف بڑھی۔

''میری بیٹی کے قاتل......اب تیرے کلیجے میں ٹھنڈ پڑ گئی؟'' رختی نے اپنے شوہر کا گریبان پکڑ لیا۔

''تھانے دار صاحب' یہ ہے قاتل میری بچی اور اس کے پیار کا۔ اسے لے جاؤ' تھانے میں بند کر دو' سولی پہ چڑھاؤ اس بڈھے کو اور اس کے موچھ ٹھنگنے بھتیجے کو......کدھر گیا بامن؟ ہو مریں شالا' کدھر ہے تو؟'' وہ ڈیرے پر اِدھر اُدھر اسے تلاش کرنے لگی۔

بامن ہوتا تو ملتا' وہ تو راتوں رات رام پور پہنچ گیا تھا جس کے پیچھے پولیس پہنچ گئی اور اسے گرفتار کر لیا۔ سردار کتھک اور بامن سے جب پولیس نے اپنے طریقے سے پوچھا' دونوں نے سب کچھ اگل دیا۔

کچھ عرصہ بعد بامن کو سزائے موت ہو گئی اور سردار کو عمر قید......ندی کنارے اسی چٹان کے قریب ساتھ ساتھ دو قبریں ہیں جو مراد اور نوری کی ہیں۔ اگر آپ کا کبھی نور پور گاؤں جانا ہو تو آپ کو وہاں ایک پاگل عورت دکھائی دے گی جو صبح و شام جنگلی پھولوں سے اُن قبروں کو سجاتی اور سنوارتی رہتی ہے۔



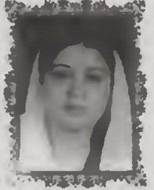
آنکھیں

سنو اے ساغر و مینا
تمہاری اب ضرورت ہی نہیں مجھ کو
مجھے اب ایسی آنکھیں مل گئی ہیں
کہ جن کو
میکدے سے میں
فقط دیتا نہیں تشبیہ
وہ آنکھیں میکدہ ہیں
اور ایسا میکدہ
جس میں
میں خود کو بھول آیا ہوں

ضیاء شاہد۔ کراچی

قرۃ العین زینب

اُلجھا ہوا سا مجھ میں......



محسن بھوپالی کا خیال

وقت کے تقاضوں کو اس طرح بھی سمجھا کر
آج کی گواہی پر مت قیاسِ فردا کر

بدگمانی کی چنگاری سے زندگی جہنم بنانے والے شوہر کا پچھتاوے بھرا ماجرا



میرے جذبات کیا تھے' تاثرات کیا تھے' یہ بیان کرنا بے حد مشکل تھا۔ کہا جاتا ہے کہ صرف لڑکیاں ہی شادی کے نام سے گھبراتی ہیں مگر کیا لڑکے انسان نہیں ہوتے! ایک بے فکرے' ذمہ داری سے آزاد انسان کو اگر خاندان کے جھمیلوں میں الجھانے کی تیاریاں کی جا رہی ہوں اور ایک ایسے انسان سے اس کا رشتہ عمر بھر کے لیے باندھا جا رہا ہو جس کو اس نے صرف تصویر میں یا دور سے ایک آدھ بار ہی دیکھا ہو تو گھبراہٹ ہونا لازمی ہوتی ہے' یہ بھی غنیمت تھا کہ اماں بی نے مجھے نہ صرف ملائکہ کی تصویر دکھائی تھی بلکہ دُعائے خیر والے دن جب وہ میری بہنوں کے درمیان بیٹھی تھی تو مجھے اسے دیکھنے کا موقع بھی دیا تھا۔

بلاشبہ یہ موقع مجھے دیر سے ملا تھا کیونکہ اس وقت تک انکار کی گنجائش قطعاً نہیں تھی مگر مجھے اماں بی اور اپنی بہنوں کے انتخاب پر بھروسہ تھا اور سب سے بڑھ کر رَب کی ذات پر بھروسہ تھا کہ وہ جوڑے بناتا ہے تو جو میرے نصیب کا ساتھی تھا' اسے مجھ سے ملنا ہی تھا۔

ملائکہ کے چہرے پر نور تھا' معصومیت تھی' ایسی روشنی تھی کہ دل نرم ہو جائے۔ میں اللہ کا شکر گزار تھا کہ اس نے مجھے خوبصورت و پیارا ساتھی عطا کیا۔ اب طبیعت کا تو ساتھ رہنے پر ہی پتہ چلنا تھا مگر میری دونوں بہنیں' ملائکہ کے گن گاتے نہیں تھکتی تھیں۔

میں اپنے بارے میں بتا دوں کہ ایک سرکاری ملازم ہوں' یوں اللہ عزت کی حلال روزی دے رہا تھا۔ دو بہنوں اور بیوہ ماں کا اکلوتا سہارا تھا۔ والد صاحب میرے بچپن میں ہی فوت ہو گئے تھے۔ اماں نے جمع شدہ پونجی کو سنبھال سنبھال کر رکھا اور اسے میری تعلیم اور بہنوں کو رخصت کرنے میں خرچ کر ڈالا۔ گھر کا خرچہ اماں نے کرائے پر چڑھی دکانوں سے کسی نہ کسی طرح پورا کر ہی لیا مگر اب جبکہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا تھا اور M.B.A. کر کے ایسی نوکری حاصل کر چکا تھا جس میں آگے بڑھنے اور ترقی کرنے کے آثار تھے' اماں کو گھر کا اکیلا پن کھانے لگا تھا اور گھر کے سناٹے نے آخر کار یہ رنگ دکھایا کہ میری شادی طے ہو گئی۔ جب تک شادی کی بات گھر میں نہیں چلی تھی' میں نے کبھی اس موضوع پر سوچا بھی نہیں تھا مگر اب جوں جوں شادی کا وقت قریب آ رہا تھا' میری عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ خوشی بڑھتی جا رہی تھی۔ دُعائے خیر والے دن میں نے دو تین بار کن انکھیوں سے ملائکہ کی جانب دیکھا تھا مگر وہ سر جھکائے بیٹھی رہی جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل تھا کہ شادی میں اس کی رضامندی ہے یا نہیں؟ اپنے آپ کو شیشے کے سامنے دیکھا تو بہنوں کی بات کچھ صحیح معلوم ہوئی کہ چاند اور سورج کی جوڑی ہے۔ لوگ تو یہی کہتے تھے کہ میں خوش شکل ہوں اور پھر اماں اور بہنوں کی آنکھ کا تارا تو تھا ہی۔

خیر' اللہ اللہ کر کے' وہ دن بھی آن پہنچا جب بارات لے کر مجھے ملائکہ کو لینے جانا تھا۔ ملائکہ کے گھر میں بھی تیاریاں عروج پر تھیں۔ آخر وہ بھی تین بھائیوں کی اکلوتی لاڈلی بہن تھی۔ اس کے گھر والے بھی دل کے سارے ارمان پورے کر رہے تھے۔

حسبِ معمول ہم باراتی لیٹ ہی پہنچے حالاں کہ موسم گرم نہیں تھا مگر گھبراہٹ کے مارے مجھے پسینہ آنے لگا اور سخت پیاس محسوس ہو رہی تھی۔ اسٹیج پر جب بٹھایا گیا تو ہر طرف سے مبارکباد اور کیمرے کی روشنیوں کی بوچھاڑ سی ہو گئی۔ ہمارا پورا خاندان اور ملائکہ کا پورا خاندان اُمڈ آیا تھا۔ ہمارے بہت سے رشتے دار جو شاید اپنی بیٹیوں کو مجھے دینا چاہتے تھے' ناراض بھی ہو گئے تھے اور شادی میں نہیں آئے تھے اور کچھ آئے تو تھے مگر ان کے چہروں پر خفگی کے آثار

تھے۔ خیر' ان باتوں کو اماں بی نے شادی کے بعد کے لیے رکھ لیا تھا۔ ان کا خیال تھا کہ خوشی کے موقع پر صرف شکرادا کرنا چاہیے۔

اسٹیج پر میرے ساتھ میرا سب سے قریبی دوست ریاض بیٹھا تھا' ویسے تو میرے دونوں بہنوئی بھی میرے ساتھ تھے مگر چونکہ وہ دونوں مجھ سے بڑے تھے اس لیے ان سے مجھے کافی جھجک تھی۔

میں نے چپکے سے ریاض کے کان میں کہا۔ ''یار' کہیں سے پانی تو لا دو' سخت پیاس لگی ہے۔''

ریاض بھی مذاق کے موڈ میں تھا' فوراً بولا۔ ''یار' بھابی کا اتنا خوف ہے کہ ابھی سے حلق خشک ہو رہا ہے؟ کیوں ہم شوہروں کی ناک کٹوانی ہے؟''

میرے گھورنے پر وہ فوراً پانی لینے چلا گیا۔ وہ اٹھا ہی تھا کہ اچانک ایک شخص ریاض کی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ میں سمجھا' کوئی مبارک باد دینے آیا ہے اور لڑکی والوں کی طرف سے ہے کیونکہ اسے میں تو نہیں جانتا تھا۔

وہ شخص بڑی رازداری سے میرے کان میں بولا۔ ''میں جانتا ہوں کہ میں نے آپ سے رابطہ کرنے میں بہت دیر کر دی مگر کیا کرتا' ان لوگوں نے ہر ممکن کوشش کی کہ آپ سے میرا کوئی رابطہ نہ ہو سکے۔ آپ کے ساتھ بہت ظلم ہوا ہے۔ آپ کے سادہ لوح گھر والوں نے بغیر کسی تحقیق کے ایک ایسے غلیظ خاندان میں رشتہ طے کر دیا ہے کہ شاید اب اس کا کوئی مداوا بھی نہ ہو سکے۔ یہ لڑکی جس سے آپ کا نکاح ہونے والا ہے' بے حد بدنام زمانہ ہے' پورے خاندان میں کہیں رشتہ طے نہیں ہوا تو ان لوگوں نے یہ بوجھ سر سے اتارنے کے لیے باہر کے سیدھے سادے لوگوں کو پھنسا لیا۔ بھائی......! میرا فرض تھا کہ میں آپ کو ایک مخلص ہونے کے ناطے آگاہ کر دوں کہ آپ لوگ آنکھوں دیکھی مکھی نگل رہے ہیں' بہت پچھتائیں گے۔ آگے آپ خود سمجھ دار ہیں۔ ایک ایسی لڑکی جس کے نجانے کتنے عاشق ہیں' وہ شادی کے بعد کیا رنگ دکھائے گی۔ بہر حال اپنی عقل استعمال کریں' ہمارا کام سمجھانا تھا۔''

نجانے وہ شخص اور کتنی دیر کیا کیا بولتا رہا' اتنے میں ریاض پانی لے آیا اور وہ آدمی فوراً غائب ہو گیا۔ اس وقت سب نکاح کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ کسی نے اس دو منٹ کی کارروائی کو نوٹ ہی نہیں کیا مگر ان دو منٹوں نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ ایک دم میری خوشی کے جذبات پر جیسے برف جم گئی تھی۔ دل میں ہلچل ہو رہی تھی۔ دماغ نے کام کرنا جیسے بند کر دیا تھا۔ میرے ذہن پر اس انجان شخص کی باتیں ہتھوڑے کی طرح برس رہی تھیں۔ اب ملائکہ کا چہرہ مجھے معصوم نہیں بلکہ عیار لگنے لگا۔ ملائکہ کے بھائیوں کو دیکھ کر مجھے یوں لگا جیسے انہوں نے میری سادہ لوح ماں اور بہنوں کو بے وقوف بنا ڈالا ہے۔ مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ کیا نکاح کے وقت مجھے سب کے سامنے برملا انکار کر دینا چاہیے یا پھر شادی کر کے اس کو سبق سکھانا چاہیے؟ آخر کار میرے دماغ نے اس بات کا فیصلہ کیا کہ جن لوگوں نے ہمارے ساتھ اتنا بڑا افراڈ کرنے کی کوشش کی ہے' ان کو مزہ چکھانا ضروری تھا اور نکاح کے بعد ان کو ان کی اوقات یاد دلا کر ہی ممکن تھا۔ مجھے یاد ہی نہیں کہ کیسے ساری رسومات کو مکمل کیا گیا؟ ہاں' اتنا ضرور تھا کہ اماں بی اور میری بہنوں نے محسوس کر لیا کہ میں حد درجہ سنجیدہ ہوں۔ ملائکہ دلہن بن کر بہت خوبصورت لگ رہی تھی مگر اُس وقت میرا دل نہیں کر رہا تھا کہ میں اُس کی شکل بھی دیکھوں۔ ملائکہ کے گھر والے اُس سے بڑھ کر چالاک و ہوشیار لگ رہے تھے' جب ملائکہ کے ابو اور امی مجھے بیٹوں کی طرح دُعائیں دے رہے تھے تو وہ مجھے دنیا کے سب سے بڑے مکار لگ رہے

تھے۔

نجانے کس طرح رخصتی عمل میں آئی اور میں انتہائی بے دلی سے گھر کی جانب چل دیا۔ ریاض جو میرے ساتھ تھا' وہ بھی محسوس کر رہا تھا کہ میں پریشان ہوں مگر ہم دونوں کو بات کرنے کا موقع ہی نہیں مل رہا تھا اور میں اسے بتاتا بھی تو کیا بتاتا؟ اپنی ہی بیوی کے بارے میں کیا بھید کھولتا؟ اس کے لاکھ پوچھنے پر بھی میں خاموش ہی رہا اور بہانہ کر دیا کہ ابا جی بہت یاد آ رہے ہیں۔ کاش' وہ بھی ہوتے۔ اس پر ریاض بھی اداس ہو گیا کیونکہ جب سے اس نے اپنے ابو کو کھویا تھا' وہ میرے درد کو بھی سمجھنے لگا تھا۔

آخر کار تمام رسموں کے بعد وہ وقت آ گیا جب مجھے ملائکہ کا سامنا کرنا تھا۔ میں کمرے میں جانا نہیں چاہتا تھا مگر رشتہ داروں کے سامنے تماشہ بننے سے بچنے کے لیے میں مرے ہوئے دل سے کمرے کی جانب چل پڑا۔ ملائکہ سراپا انتظار بنی بیٹھی تھی مگر اس وقت وہ مجھے انتہائی قبیح لگ رہی تھی۔ اس انجان شخص کی باتیں میرے ذہن میں گھومنے لگیں اور میں انتہائی غصے میں آ گیا۔ میں نے ایک بھرپور غصے والی نگاہ ملائکہ پر ڈالی جو نظریں جھکائے بیٹھی تھی۔

''ہاں تو بی بی' آج میرے سامنے ذرا کھل کر تو بتائیں کہ شادی سے پہلے آپ کے کل کتنے عاشق تھے جن کے قصوں نے آپ کو اتنا مشہور کر دیا کہ آپ کے اپنے خاندان میں کوئی بہو بنانے پر تیار نہیں ہوا؟''

میری بات پر ملائکہ نے ایک دم حیرت زدہ انداز میں میری طرف دیکھا' شاید اسے توقع نہیں تھی کہ اس موقع پر اس پر ایسی بجلی بھی گر سکتی ہے؟ میری زبان سے آگ برسنے لگی۔ میری آنکھوں کی نفرت نے اس کی آنکھوں سے سیلاب جاری کر دیا۔ عین اُسی لمحے میں نے فیصلہ کر لیا کہ اب کہنا کچھ نہیں' کر

وقت وقت کی بات

☆ جب سانپ زندہ ہو تو وہ چیونٹیاں کھاتا ہے اور جب مر جائے تو چیونٹیاں اُسے کھاتی ہیں۔

☆ ایک درخت سے کئی لاکھ ماچس کی تیلیاں بنتی ہیں مگر ایک ماچس کی تیلی کئی لاکھ درخت جلا سکتی ہے۔

☆ زندگی میں کبھی کسی کو مت ستانا شاید آپ طاقت ور ہوں مگر مت بھولو وقت آپ سے زیادہ طاقت ور ہے۔

عمران ہارون چھوٹالی

کے دکھانا ہے۔

میں نے انتہائی بے رخی سے کہا۔ ''جاؤ' جا کر کپڑے بدلو اور سو جاؤ۔ میرے سامنے یہ شریف زادیوں والے ڈرامے کرنے کی ضرورت نہیں' تم میرے سامنے کھل چکی ہو اور تم کیا' تمہارے گھر والوں کی اصلیت بھی مجھے معلوم ہو چکی ہے۔ اب تم لوگوں کو پتہ چلے گا کہ دوسروں کو بے وقوف سمجھنے والے خود کتنے بڑے بے وقوف ہوتے ہیں۔''

یہ کہہ کر میں واش روم میں گھس گیا اور کپڑے بدل کر بیڈ پر لیٹ گیا۔ مجھے نہیں معلوم کہ ملائکہ کس وقت اٹھی' کب اس نے لباس تبدیل کیا اور ساری رات کہاں بیٹھی رہی؟ صبح جب میری آنکھ کھلی تو وہ صوفے پر بیٹھی گہری سوچ میں گم تھی' اس کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں اور چہرے پر ویرانی تھی۔ مجھے ایک دم اس پر بے حد ترس آ گیا۔ نکاح کا بندھن ایسا ہوتا ہے کہ دلوں میں خود بخود محبت جاگ جاتی ہے۔ پل بھر کو پچھتاوا ہوا کہ میں نے شاید کچھ غلط کر دیا مگر پھر اچانک شیطانی خیالات نے مجھ پر یلغار کر دی۔ اپنے اور اپنے گھر والوں کے ساتھ ہونے والے دھوکے نے آنکھوں پر نئے سرے سے پٹی باندھ دی۔ صبح جب میری دونوں بہنیں کمرے میں آئیں تو

کمرے کی صورتِ حال دیکھ کر سکتہ میں رہ گئیں۔ میں تو فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی باجی میرے پیچھے آ گئیں۔

"یہ سب کیا ہے شکیل' کیا ہم نے تم سے تمہاری رضامندی نہیں لی تھی؟ جب سب کچھ تم سے پوچھ کر کیا ہے تو اب اس سب رویے کا کیا مطلب ہے؟"

باجی کا جارحانہ انداز دیکھ کر بہت ضروری ہو گیا تھا کہ اُن کو حقیقت بتا دی جائے۔ میں نے ساری بات باجی کو بتا دی مگر حیرت انگیز طور پر انہوں نے اپنا سر پکڑ لیا۔

"تم کو ایک انجان انسان کی بات پر اتنا بھروسہ ہو گیا کہ تم نے ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ قرآن میں واضح طور پر لکھا ہے کہ پاک مردوں کے لیے پاک عورتیں ہیں اور ناپاک مردوں کے لیے ناپاک عورتیں ہوتی ہیں۔ کیا ہم اپنے اکلوتے بھائی کی شادی بغیر چھان بین کے کسی بھی راہ چلتی لڑکی سے کر دیں گے؟ کیا تم کو اتنا بھی خیال نہیں آیا کہ میں اپنے گھر والوں پر بھروسہ نہ کروں؟ پہلے تحقیق تو کر لیتے نہ جانے کون خبیث تھا جس نے تمہارے دل میں یہ وسوسے ڈالے؟ کیا ثبوت ہے تمہارے پاس جو تم ایک نیک لڑکی پر ایسا گندہ الزام لگا رہے ہو؟" باجی کی سخت باتوں نے ذہن پر جمی گرد صاف تو کی مگر وہ پوری طرح ہٹا نہ سکی اور میں بھی اپنی بات پر جما رہا۔

"باجی' جہاں آگ ہوتی ہے' وہیں دھواں ہوتا ہے۔ کچھ تو ہو گا جو عین شادی والے دن یہ سب میرے علم میں آیا۔ یہ تو اس کے گھر والوں کی عزت کی خاطر میں نے نکاح کر لیا۔ اگر میں انکار کر دیتا تو کیا کر لیتے آپ سب؟"

باجی نے اس وقت مجھ سے کوئی بحث نہیں کی اور چپ چاپ کمرے سے نکل گئیں۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا مگر پھر بھی نجانے کیوں ایک پھانس سی دل میں چبھ گئی تھی۔ اس کی بدکرداری کا اگر کوئی ثبوت نہیں تو اس بات کا بھی کوئی ثبوت نہیں تھا کہ وہ پاک باز ہے۔ میں نے سوچا' جب شادی کرنے کا ڈرامہ کیا ہی ہے تو پوری طرح نبھاؤں۔ ایک بار یہ سارے رشتے دار چلے جائیں پھر کھل کر سامنے آؤں گا' یہی سوچ کر میں نے ولیمے کے لیے تیار ہونے کا سوچا اور کپڑے لینے کے لیے کمرے کی جانب چل دیا۔ جب اپنے کمرے کے دروازے پر پہنچا تو مجھے باجی کی آواز سنائی دی۔ وہ ملائکہ سے ہی بات کر رہی تھیں۔ میرے قدم رک گئے۔

"ملائکہ' شکیل کو بہت بڑی غلط فہمی ہوئی ہے' نجانے کون تھا جس نے تم پر بہتان لگایا مگر اب تم پر جو آزمائش آئی ہے' اس میں تمہیں کھرا اترنا ہوگا۔ یہ صرف تمہاری اور تمہارے گھر والوں کی عزت کا سوال نہیں ہے' ہماری بھی عزت کا سوال ہے۔"

بہت دھیمی سی آواز میں ملائکہ بولی۔

"باجی......! امی ابو نے مجھے رخصت کر دیا ہے' اب تو میرا جینا مرنا آپ سب کے ساتھ ہے۔ میری خواہش تو یہی ہے کہ میرا آخری سفر اپنے شوہر کے کندھوں پر ہو اور وہ مجھ سے راضی ہوں۔ اب آپ مجھے بتائیں' میں کیا کروں؟ میری بے گناہی کا گواہ اللہ ہے۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتی کہ کس نے یہ سب کیا اور کیوں کیا؟"

"چلو ابھی خیر سے ولیمہ ہو جائے پھر اس مسئلے کا حل نکالیں گے۔ تم فی الحال اپنے گھر والوں کو کچھ مت بتانا ورنہ وہ پریشان ہوں گے۔ ہم خود سب کچھ حل کر لیں گے۔" باجی نے ملائکہ کو تسلی دی اور میں کمرے میں داخل ہو گیا اور کپڑے لے کر باہر نکل گیا۔

ولیمے میں بھی ملائکہ خوبصورت لگ رہی تھی۔

اُس لمحے شدت سے میرے دل میں خواہش اٹھی کہ کاش' یہ سب جھوٹ ہو اور یہ لڑکی ویسی نہ ہو جیسا میں نے سنا ہے مگر میرے اندر شک کا ناگ ایسا پھن پھیلا کے بیٹھ گیا تھا کہ عقل ماؤف تھی۔ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں تھا مگر نجانے کیوں یقین تھا کہ جو کچھ میں نے سنا ہے' وہ اگر سو فیصد سچ نہیں تو اس میں کچھ نہ کچھ سچ ضرور ہو گا۔

ولیمے کے بعد ایک رسم میں جب ملائکہ اپنے گھر گئی تو میں نے جانے سے صاف منع کر دیا۔ پتہ نہیں' امی اور باجیوں نے کس طرح بات سنبھالی۔ ملائکہ کے گھر والے بھانپ چکے تھے کہ کوئی مسئلہ ہے مگر ملائکہ نے باجی کی کہی بات پر عمل کرتے ہوئے اپنے گھر والوں سے کچھ نہیں کہا۔ گھر واپس آنے کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہوا مگر میں نے کسی بھی دعوت میں جانے سے صاف منع کر دیا۔ اپنے خاندان والوں کو تو امی نے سنبھال لیا مگر ملائکہ کے خاندان کو جب منع کیا گیا تو پھر ملائکہ کی امی پہنچ گئیں۔ وہ سخت پریشان تھیں' شاید بیٹی کا اترا چہرہ اُن پر دبے راز کھول رہا تھا۔ آخر کار امی' باجیوں نے یہی مناسب سمجھا کہ ساری بات کھول کر بتا دی جائے اور انہوں نے یہی کیا۔ ملائکہ کی امی دم بخود تھیں کہ ایسا کون کر سکتا ہے؟ مجھے امی نے آفس فون کیا کہ میں جلدی گھر آ جاؤں' ملائکہ کی امی مجھ سے بات کرنا چاہتی ہیں مگر میں اُن سب کا سامنا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس وجہ سے معمول سے بھی دیر سے گھر لوٹا۔ میں نے ملائکہ کے ساتھ شادی کی پہلی رات کے بعد سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ رات کو جب میں کمرے میں لوٹا تو ملائکہ جاء نماز پر بیٹھی رو رہی تھی۔ نجانے کیوں کبھی کبھار میرے دل میں ہمدردی اور محبت اُمڈ آتی تھی۔ دل کرتا' سب کچھ بھول جاؤں' نئے سرے سے شروعات کروں مگر پھر اتنی نفرت اور غصہ اُمڈ آتا کہ ملائکہ کی ایک ایک حرکت ڈھکوسلہ معلوم ہوتی۔

اُس وقت بھی ملائکہ کو دیکھ کر میرے ذہن نے اُسے ڈرامہ کوئن کا خطاب دے ڈالا ورنہ نماز میرے گھر واپس آنے کے وقت ہی پڑھنی تھی۔ میں نے صاف صاف باجی کو کہہ دیا تھا کہ اگر یہ عورت یہاں رہنا چاہتی ہے تو گھر سے قدم باہر نہ نکالے۔ ہاں' اس کے ماں باپ بھائی آ کر مل جائیں مگر یہ وہاں نہیں جائے گی۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ وہ اپنے پرانے قصے دوبارہ شروع کرے۔ اس دوران ملائکہ کے بھائیوں' والد نے بھی مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش کی مگر میرا دل اُن سے ملنے کو تیار نہیں تھا۔ ظاہر ہے' وہ اپنی بیٹی کی حمایت کرتے اور میرا دل صاف کرنے کی کوشش کرتے۔ آخر ایک دن امی نے میرا راستہ روک لیا۔

"بیٹا......! آج تمہاری شادی کو پورا ایک مہینہ ہو گیا ہے مگر اس ایک مہینے کو ہم سب نے اتنی اذیت میں گزارا ہے کہ لگتا ہے جیسے سال گزرا ہو تو سوچو' آگے کی زندگی کیسے گزرے گی؟ تم ایک بار بیٹھو' بات کرو' دل تب بھی نہ مانے تو خود کو اور ملائکہ کو اس اذیت ناک تعلق سے آزاد کرو۔"

میں خود بھی نفرت اور غصے کا بوجھ اٹھاتے اٹھاتے تھک گیا تھا۔ آخر کار جمعے کا دن طے پایا۔ جمعے کی نماز کے دوران میں نے جب سجدے میں سر جھکایا تو بے اختیار میرا دل رو پڑا۔ میں جی بھر کے رویا اور پھر بے حد پرسکون ہو گیا۔ سب معاملات اللہ کے سپرد کر کے میں نے کھل کر حالات کا سامنا کرنے کا سوچا اور گھر پہنچ گیا۔

دوپہر کو گھر پر سب لوگ جمع تھے' میرے دونوں بہنوئی بھی تھے اور ریاض جو میرا جگری دوست اور ساری صورتِ حال سے کسی حد تک واقف تھا' وہ بھی آ گیا۔ ملائکہ کے ابو بہت سلجھے ہوئے تھے' انہوں

نے بات کا آغاز کیا۔

''بیٹا' ہمیں ایک بار تم بتاؤ کہ کیا ہوا تھا اور وہ شخص کون تھا جس نے تم سے یہ سب باتیں کیں؟''

ظاہر سی بات تھی' میں اُس شخص کو نہیں جانتا تھا مگر اب یاد آیا کہ وہ شخص اس زاویئے سے بیٹھا تھا کہ میں اسے واضح دیکھ بھی نہیں سکا تھا' بس اس کی آواز اور لہجہ تھا جو ذہن پر نقش ہوگیا تھا۔ میں نے اُن سب کے سامنے ساری بات بتادی۔ اس شخص کا پتہ لگانے کے لیے شادی کی مووی چلائی گئی مگر دورانِ شادی بہت سارے انجان لوگ آ کر میرے پاس بیٹھے تھے' کئی لوگوں نے باتیں بھی کی تھیں' اس وجہ سے سب لاحاصل رہا۔ اچانک میرے ذہن میں خیال آیا کہ میں نے ریاض سے پانی منگوایا تھا اور جب ریاض پانی لایا تو وہ شخص فوراً اٹھ گیا تھا۔ میں نے یہ بات بتا دی۔ یہ موقع ہمیں شادی کی مووی کی ماسٹر کاپی میں دیکھنے کو مل سکتا تھا۔ کیوں' مووی کی مکسنگ میں تو ایڈیٹنگ وغیرہ کر کے غیر ضروری چیزیں نکال دی جاتی ہیں۔ جب ماسٹر کاپی میں دیکھا گیا تو وہ شخص نظر آ گیا جو ریاض کے پانی لانے پر فوراً اٹھ گیا تھا۔ میں نے بھی تبھی اس کو غور سے دیکھا' وہ سفید باریش' خاصا معزز شخص تھا اور بار بار اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ ملائکہ کے بھائی غصے سے پاگل ہوگئے کیونکہ وہ ملائکہ کے سب سے چھوٹے بھائی کی بیوی کا رشتہ دار تھا۔ اس سب کا علم ہونے کے بعد وہ لوگ بغیر رکے چلے گئے۔ ایک ہفتے تک کوئی رابطہ وغیرہ نہیں ہوا اور پھر اچانک جمعے والے دن اُن لوگوں نے پھر ملنے کے لیے وقت مانگا۔ دوپہر کو پھر سے سب عزیز جمع تھے۔ ملائکہ کے ابو نے بولنا شروع کیا۔

''بیٹا شکیل' ملائکہ ہماری اکلوتی بیٹی ہے' ہم سب گھر والے اس کی ایک مسکراہٹ کی خاطر کسی بھی حد تک جا سکتے ہیں مگر تقدیر پر تو کسی کا اختیار نہیں۔ یہ سب کیوں ہوا' یہ اللہ بہتر جانتا ہے مگر کس نے اور کس مقصد کے لیے کیا' یہ ہم نے پتہ لگالیا ہے۔ وہ شخص جو تمہارے پاس آ کر بیٹھا تھا' وہ میری سب سے چھوٹی بہو کا رشتہ دار ہے۔ میری بہو کے گھر والوں کی بڑی خواہش تھی کہ ان کے بیٹے سے میری بیٹی کا رشتہ ہو جائے۔ ہم نے لڑکے کے بارے میں معلومات حاصل کیں تو وہ انتہائی مشکوک تھیں۔ ہم اپنی بیٹی کو خوش دیکھنا چاہتے تھے' اس وجہ سے ہم نے وہاں کے رشتے کے لیے انکار کردیا اور یہاں آپ کی طرف حامی بھرلی۔ اسی بات کی جلن ان لوگوں نے شادی والے دن یہ حرکت کر کے نکالی تاکہ تم عین نکاح کے وقت انکار کردو اور ہم بیٹی کی عزت کی خاطر وہاں رشتہ کرنے پر مجبور ہو جائیں۔ اب اگر تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو تو صحیح ہے ورنہ ہم سب میں سے کوئی تمہیں مجبور نہیں کرے گا کیونکہ رشتے مجبوری سے نہیں نبھائے جاتے۔''

میں نے سوچنے کے لیے وقت مانگا۔ اسی رات میں کمرے میں سوچوں میں غرق بیٹھا تھا کہ ملائکہ ہاتھ میں قرآن اٹھائے میرے قریب چلی آئی۔

''میں جانتی ہوں' آپ مجھ سے بدظن ہیں مگر آخری بار آپ کو اپنی بے گناہی کا یقین دلانے کے لیے میں اس پاک کتاب کی قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ میں پاک ہوں۔ میری بے گناہی کا ثبوت اللہ دے گا۔ میں اپنی صفائی میں اس سے زیادہ اور کچھ نہیں کہہ سکتی۔''

وہ ایک لمحہ تھا کہ میں بالکل پگھل گیا۔ میں نے سب کچھ بھلانے کا فیصلہ کرلیا اور سوچ لیا کہ اب نارمل زندگی کی جانب آؤں گا اور پھر میں نے ایسا ہی کیا۔ سب بے انتہا خوش تھے کہ بات ختم ہوگئی۔

آج جب ہماری شادی کو آٹھ سال ہوگئے ہیں اور میں دو بچوں کا باپ ہوں' تب بھی ایک پھانس

میرے دل میں چبھی ہوئی ہے۔ ملائکہ بے حد اچھی بیوی ثابت ہوئی اور سب سے بڑھ کر وہ بے حد پیار کرنے والی بہو تھی مگر میری شکی نگاہیں اُسے کتنی اذیت دیتی تھیں' وہ اس کا چہرہ بتا دیتا تھا۔ ایک دن میں آفس جانے کے لیے تیار ہو رہا تھا کہ ملائکہ نے بتایا کہ آج اس کے گھر جانا ہے' اس وجہ سے میں جلدی آ جاؤں' سو میں آفس سے جلدی گھر آ گیا اور ہم سب تیار ہو کر ملائکہ کے گھر پہنچ گئے۔

وہاں وہی شخص وہیل چیئر پر بیٹھا تھا۔ میں حیران تھا کہ وہ بے حد نحیف اور بیمار لگ رہا تھا۔ ملائکہ نے تو نفرت سے اسے دیکھا اور بچوں کو لے کر اندر کمرے میں غصے سے چلی گئی جبکہ مجھے ملائکہ کے ابو نے زبردستی پاس بٹھایا۔

''بیٹا......! اللہ پاک معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ قدرت اللہ سے' اللہ نے پاکباز لڑکی پر بہتان لگانے کا بہت سخت بدلہ لیا ہے۔ اب تم بھی ان کو معاف کردو۔''

اسی وقت اس کمزور سے شخص جس کا نام قدرت اللہ تھا' نے بڑی مشکل سے اپنے دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔ ''بیٹا......! جس بیٹے کی خاطر میں نے ملائکہ بیٹی پر بہتان لگایا۔ اللہ کو ناراض کیا' اسی نے مجھے اتنی اذیتیں دی ہیں کہ میں مفلوج ہو گیا۔ میں نے سوچا تھا کہ تمہیں بھڑکاؤں گا' تم ملائکہ سے نکاح کرنے سے انکار کردو گے اور ہم احسان جتاتے ہوئے ملائکہ بیٹی کا رشتہ اپنے بیٹے سے کردیں گے مگر تم نے جب نکاح کرلیا اور ملائکہ بیٹی کو بیاہ کر لے گئے تو ہماری امیدوں پر پانی پڑ گیا۔ اب وہی بیٹا جس کے لیے میں نے اتنا کیا کہ عاقبت داؤ پر لگادی' بیوی کی باتوں میں آ کر مجھے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیتا ہے۔ میں نے بہت بار ملائکہ بیٹی سے معافی مانگی ہے مگر وہ مجھے معاف نہیں کررہی' تم کہو تو شاید

زندگی

نوک پلک پہ
آ کر
جو ٹھہر گیا ہے
وہ تھکا آنسو
میری زندگی ہے

مون شاہ بخاری

میرا امتحان ختم ہو اور میں سکون سے مر سکوں۔''

میں جانتا تھا کہ ملائکہ کیوں اسے معاف نہیں کر رہی۔ میں سب کچھ بھول چکا تھا مگر ایک پھانس سی دل میں تھی' ایک شک سا تھا اور میری نظریں ملائکہ تک میرے شک کا پیغام پہنچا دیتی تھیں۔ دل تو میرا بھی اس شخص کو معاف کرنے کو نہیں کر رہا تھا جس کی وجہ سے میں اپنی زندگی کے سب سے خوبصورت وقت کو شک کی آگ میں جھونک چکا تھا مگر آج وہ پھانس بھی میرے دل سے نکل گئی۔ ملائکہ نے آج تک اس شخص کو معاف نہیں کیا مگر اب وہ اسے بددعا نہیں دیتی اور میں سوچتا ہوں کہ میں اپنے آپ کو کیا سزا دوں' میں نے پاکباز بیوی پر شک کیا۔ اللہ پر بھروسہ نہیں کیا مگر پھر سوچتا ہوں' میں تو ملائکہ کو جانتا ہی نہیں تھا اور اللہ پر بھروسہ تھا تو رشتہ نبھایا مگر اب زندگی کا وہ دور شروع ہوگیا ہے کہ پچھتاووں کا سلسلہ جاری ہے' شاید ماں کی دُعائیں تھیں کہ ملائکہ کو میں نے چھوڑا نہیں۔ بے شک قرآن میں درست لکھا ہے کہ جب کوئی منافق خبر لائے تو تصدیق کرلو۔ آپ بتائیں کہ میں ایسا کیا کروں کہ میرے اندر جلنے والا پچھتاوے کا عمل ہمیشہ کے لیے رک جائے؟

عندلیب سلمیٰ

اب حوصلہ نہیں ہارا

سعدیہ حریم کا خیال

اللہ نہ دکھلائے حریم اپنی دعا ہے
وہ وقت کہ جب ضبط کا یارا نہیں ہوتا

زمانے سے مقابلہ کرنے والی باحوصلہ عورت کی کہانی، وہ حالات سے ہار گئی تھی

کہتے ہیں، پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آ جاتے ہیں۔ محاورے کی صورت کہی گئی یہ وہ حقیقت ہے جسے صدیوں سے لوگ کہتے اور دیکھتے آئے ہیں۔ میری تیسرے نمبر کی چھوٹی بہن شہناز اس کی حقیقی تصویر تھی۔ وہ قد و قامت میں تو چھوٹی سی گڑیا لگتی لیکن اُس نے اتنی جلدی چلنا، بولنا سیکھا تھا کہ سب حیران ہوتے تھے۔ اسے سینٹ لارنس اسکول میں داخل کیا گیا تھا۔ ہر سال پہلی پوزیشن آتی تھی۔ اُس کی پرنسپل نے کئی بار ڈبل پروموشن کے لیے زور دیا تھا لیکن میرے والد صاحب منع کر دیتے تھے۔ وہ خود عالم فاضل اور مشیرِ تعلیم تھے۔ ان کے خیال میں اعلیٰ علم کے حصول کے لیے کلاس کا تسلسل ضروری تھا۔ بہر حال میری بہن اسی طرح کامیابی سمیٹتی انٹر تک آ گئی تھی اور اس کے بعد اسے لاہور کے ڈینٹل کالج میں داخلہ مل گیا تھا۔

لاہور کے ڈینٹل کالج میں اُس وقت باہر سے آنے والے طالب علموں کے لیے ہاسٹل کی سہولت موجود نہ تھی۔ بہر حال بمشکل تمام ایم بی بی ایس کالج کے ہاسٹل میں رہائش مل گئی تھی۔

شہناز صرف تعلیم کے میدان میں ہی نمایاں نہیں تھی، وہ بیڈمنٹن کی بہت اچھی کھلاڑی مانی جاتی تھی۔ اس حوالے سے یہاں کراچی کے گورنمنٹ کالج میں اُس کا بڑا نام تھا۔ اُن دنوں لاہور میں کچھ روز بعد ہی بین الجامعہ کھیلوں کے مقابلے ہونے والے تھے اور شہناز کو اُن کھیلوں کے مقابلے میں سلیکٹ کر لیا گیا تھا۔ دراصل شہناز کے لاہور جانے سے پہلے ہی لاہور کے تعلیمی اداروں میں اُس کی شہرت پہنچ چکی تھی اور جلد ہی اُس کے پرستاروں کا ایک اچھا خاصا گروپ وجود میں آ چکا تھا۔ ویسے بھی علم حاصل کرنے والے لڑکے لڑکیوں میں جہاں ایک خود اعتمادی پیدا ہو جاتی ہے، وہاں جنسِ مخالف کے جوان دلوں اور آنکھوں میں آنے والی زندگی کے خواب بھی جنم لینے لگتے ہیں۔

اُس روز شہناز انتہائی تندہی سے اپنی گیم پریکٹس میں مشغول تھی، محنت اور مشقت کے باعث دہکی ہوئی گندمی رنگت اور کمر تک لہراتے کھلے بال زندگی سے آباد ایک خوش کن منظر تھا۔ اس منظر کو دیکھنے والی آنکھوں میں دو آنکھیں نسیم ریاض اعوان کی بھی تھیں، وہ مسلسل نظریں

جمائے شہناز کو دیکھ رہا تھا اور اُس کا دل کہہ رہا تھا کہ اس سادگی پہ کون نہ مر جائے اے خدا! اسے دوستوں نے بتایا تھا کہ شہناز کراچی سے آئی ہے۔

وہ نوجوان نسیم ریاض ایک گاؤں سے آیا تھا۔ سرخ و سفید رنگت، بھوری بھوری شرارتی آنکھیں، درمیانہ قد، نو بہنوں کا اکلوتا بھائی ہونے کی وجہ سے وہ ماں باپ کا ہی نہیں بلکہ پورے خاندان کا لاڈلہ تھا۔ اُس کا باپ ایک کلرک تھا جو اتنے بڑے خاندان کا واحد کفیل تھا اور ماں ایک بے حد دین دار، کفایت شعار خاتون تھی جو بڑی تندہی اور سلیقے سے گھر کا کاروبار چلا رہی تھی۔

نسیم ریاض اعوان پہلی نظر کی محبت پر یقین رکھنے والا کوئی نوجوان نہیں تھا مگر وہ بھلا کیا کرتا کہ شہناز کی تصویر اب ہر دم اُس کی نگاہوں میں رہتی تھی۔ دوسری طرف شہناز کیوپڈ کی اس واردات سے بالکل بے خبر تھی مگر لڑکیوں کے توجہ دلانے پر اسے احساس ہوا تھا۔ اس معاملے میں کچھ نہ کچھ حقیقت بھی ہے۔ 'عشق کا عنوان کیا' تمہید کیا' وہ خوابوں کی دنیا میں رہنے والی لڑکی نہ تھی مگر اس دل کو کیا کرتی جس میں نسیم میاں دیکھتے ہی دیکھتے براجمان ہو چکے تھے۔

گزرتے وقت کے ساتھ شہناز کو بی ڈی ایس کر کے کراچی میں جناح اسپتال میں جاب مل گئی۔ دوسری طرف نسیم اعوان نے آرمی جوائن کر لی اور موقع ملتے ہی ماں باپ کو شادی کے لیے اپنا انتخاب شہناز کی صورت بتایا تھا۔ وہ اکلوتا اور لاڈلہ بیٹا تھا، بھلا وہاں انکار کی کیا گنجائش تھی مگر شہناز کے لیے ایک مسئلہ تھا، ایک بیوروکریٹ کی ناز و نعم سے پلی لڑکی جس کی خدمت کے لیے گھر میں چار چار نوکر تھے اور پھر سب سے بڑی بات یہ کہ اس کا اردو اسپیکنگ خاندان سے تعلق تھا۔ رشتے داروں اور سہیلیوں وغیرہ نے بہت روکا مگر شہناز تو اُس

تکمیل

تھی میری تکمیل
ہجر میں
اور اس کی
وصال میں
سُو
تکمیل ہو نہ سکا
کوئی بھی

نجمہ نسرین درانی

وجیہہ شہزادے نسیم اعوان کو اپنی زندگی کا ساتھی بنانے کا فیصلہ کر چکی تھی، سو وہی ہوا جو شہناز نے چاہا تھا۔

شہناز بڑی سادگی سے بیاہ کر اپنے سسرال پہنچی تھی۔ ایک کھاتی پیتی زندگی کی ہر آسائش کا مزہ اٹھاتی چھوٹی سی فیملی سے بڑے مشترکہ خاندان میں اپنے آپ کو ایڈجسٹ کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں ہوتا، بہت سی مشکلات درپیش ہوتی ہیں مگر شاباش ہے شہناز پر نہ اُس کی پیشانی پر بل آئے نہ ہونٹوں سے مسکراہٹ گئی۔ اُس نے جلد ہی سسرال میں اپنا مقام بنا لیا تھا۔

اس کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی شہناز کے خسر کا انتقال ہو گیا تھا اور نسیم کو اپنی فوجی خدمات کے سلسلے میں لبنان جانا پڑا تھا۔ اس طرح گھر کی ساری ذمے داری شہناز پر آ پڑی تھی۔ اسی دوران میں شہناز نے اخبار میں آنے والے ایک اشتہار 'فوج میں ڈینٹل سرجن کی ضرورت' پر درخواست دے دی تھی اور پھر وہ فوج میں پہلی خاتون ڈینٹل سرجن کیپٹن کے عہدہ پر فائز بھی ہو گئی تھی۔

وقت کا پہیہ اپنی رفتار سے رواں دواں تھا۔ سات نندوں کی شادی سے فراغت ہو گئی تھی، ساتھ ہی ایک ماں کے فرائض بھی اس کی زندگی میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کی پہلی بیٹی تو پیدا ہونے کے کچھ دن بعد انتقال کر گئی تھی پھر یکے بعد دیگرے تین بیٹوں نے جنم لیا تھا۔ یہ اُس کی اعلیٰ تعلیم اور تربیت کا ہی نتیجہ تھا کہ بڑے بیٹے نے ایئر فورس جوائن کی تھی، دوسرا ڈینٹل سرجن بن گیا تھا جبکہ تیسرا بیٹا بلال زیر تعلیم تھا۔

بلال خوبصورتی میں بالکل اپنے باپ پر گیا تھا، اسے جو دیکھتا اُسے پیار آتا۔ وہ نہایت فرماں بردار ادب آداب والا بچہ تھا۔ ویسے تو شہناز کا سارا سسرال ہی دین دار تھا لیکن یہ بچہ بلال تو انتہائی عبادت گزار اور پنج وقتہ نمازی تھا۔ وہ اکثر اپنی دادی سے کہتا تھا۔

"بڑے بھائی تو بہت خوش نصیب ہیں کہ ایئر فورس میں ہونے کی وجہ سے شہادت کا موقع مل سکتا ہے۔ کاش میں بھی فوج میں شامل ہو جاتا تو شہادت نصیب ہو سکتی تھی۔ جانے وہ قبولیت کی کون سی گھڑی تھی کہ شہادت بلال کے نصیب میں لکھ دی گئی تھی۔

وہ بقرعید کا تیسرا روز تھا اور جمعۃ المبارک کا دن بلال اپنے بڑے بھائی کے بیٹے کے ساتھ نمازِ جمعہ کے لیے مسجد گیا تھا اور پھر جب تمام نمازی سجدے میں تھے کہ ایک دھماکہ ہوا تھا۔ بلال نے جھٹ اپنے بھتیجے کو اپنے نیچے لے لیا تھا۔ دھماکے اور گولیوں کے شور میں بحالتِ سجدہ بلال کی آرزوئے شہادت پوری ہوئی تھی اور اس حالت میں بلال نے اپنے بھتیجے کو محفوظ رکھا تھا۔

میں اُس دوران میں کینیڈا میں تھی۔ فون کی گھنٹی بجی تھی۔ میں نے ہی ریسیور اٹھایا تھا۔ میری وہ فولاد صفت بہن شہناز روتی ہوئی کہہ رہی تھی۔ "آپا......! آپا......! میرا بلال مجھے چھوڑ کر چلا گیا۔" میرے دل پر جیسے گھونسہ لگا تھا، آنسو تھم نہیں رہے تھے، میری بہن کی گود اجڑ گئی تھی لیکن اب وہ شہید کی ماں کے عہدے پر بھی تو فائز تھی۔

نسیم تو بیٹے کی جدائی میں بری طرح نڈھال ہو گیا تھا۔ وہ حوصلہ جو شہناز کے پاس تھا، وہ اُس سے عاری تھا، ہر چیز سے بے زار ہو گیا تھا، آنکھیں مایوسیوں کا مسکن بن گئی تھیں اور پھر ریٹائرمنٹ کے بعد اُس نے اللہ سے لو لگا لی تھی اور ایک تبلیغی جماعت میں شمولیت اختیار کی تھی اور پھر ایک روز مسجد میں جاری تبلیغِ دین کی محفل سے وہ یہ کہہ کر گھر روانہ ہو گیا تھا کہ یہ امی کے کھانے کا وقت ہے اور فرماں بردار بیٹا، ماں کے ساتھ کھانا کھاتا تھا۔ وہ کھانا کھا کر پھر گھر سے سوئے مسجد روانہ ہوا تھا کہ راستے میں اچانک ایک طرف سے دو موٹر سائیکل سوار نمودار ہوئے تھے اور اُسے پیچھے سے ٹکر مار دی تھی۔ میجر جنرل نسیم ریاض اعوان خون میں نہا گیا تھا۔ اُسے فوراً اسپتال پہنچایا گیا تھا لیکن مسافر تو جا چکا تھا۔

گھر میں قیامت کا منظر تھا۔ ضعیف بیمار ماں کے آنسو رک نہیں رہے تھے مگر بین کی آواز نہ تھی، نو بہنوں کے اکلوتے بھائی کی میت دیکھ کر لوگوں کی چیخیں نکل رہی تھیں مگر شہناز چالیس سالہ زندگی کے ساتھی کی میت کے سرہانے بالکل ساکت بیٹھی تھی، بس پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھے جا رہی تھی۔

آج وہ فولاد صفت خاتون بریگیڈیئر شہناز حوصلہ ہار چکی ہے۔ مکان، دولت، عزت، شہرت سب کچھ ہے مگر وہ باغباں جا چکا ہے جس کے دم سے گلستان میں بہار تھی۔

سانسوں کا خراج

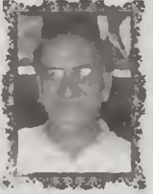
برف کے انبار کے نیچے دبے شعلہ بدن
اپنی سانسیں ہار کر یوں
دے رہے ہیں
اپنے ہم وطنوں کی سانسوں کا خراج
ایسے بے خوف و خطر
پُردم جوانوں کو سلام

آسماں سے سر لگائے
کوہساروں، برف زاروں پر
جو غازی
انجمادِ آب کے نقطے کے نیچے بھی
لہو کو گرم رکھتے ہیں
وطن کی آن پر جاں وارنے کا
عزم رکھتے ہیں
شجاعت اور وفا کے
معتبر ایسے نشانوں کو سلام

ملک کی توقیر و آزادی کے ضامن
......غیر ممکن کو کیے جاتے ہیں ممکن
موت جن کی ہم سفر ہے......ہم نشیں ہے
اُن کا رستہ دیکھتے
بے خواب، اَنتھک، آبدیدہ
دیدبانوں کو سلام



میجر احمد نواز



نذیر لغاری

میں کس کے ہاتھ پہ...

مصطفیٰ زیدی کا خیال

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

دو پھولوں کے بکھرنے کی سچی کہانی، شہر قائد میں ایسے حادثے معمول کا حصہ ہیں

میری بہن سکی گود سے دو پھول گرے اور مٹی میں جا کر سو گئے۔ میں نے اپنے کاندھوں پر دونوں بچوں کے جنازے اٹھائے۔ صبیحہ علی چار مضامین کے پیپرز دے چکی تھی۔ اسے پہلے روز اپنی ماں امتحانی مرکز لے گئی تھی، تین روز چھوٹا بھائی شاہد لے کر جاتا رہا۔ آخری پیپر کے روز سب سے چھوٹا بھائی حامد لے کر جا رہا تھا۔ دونوں بچوں کو نصرت بھٹو کالونی، نارتھ ناظم آباد سے رضویہ سوسائٹی کے قریب واقع



عثمانیہ گرلز کالج پہنچنا تھا۔ حامد اور صبیحہ موٹر سائیکل پر قلندریہ چوک سے سخی حسن چورنگی پہنچے اور وہاں سے دائیں جانب کو مڑ گئے۔ سخی حسن چورنگی کے قریب ٹریفک پولیس کے اہلکار کھڑے تھے۔ جہاں ٹریفک پولیس موجود ہو وہاں ٹریفک کی روانی میں کھلبلی مچ جاتی ہے۔ شہر کے کسی بھی چوک پر ٹریفک پولیس ٹریفک میں روانی پیدا کرنے کے لیے موجود نہیں ہوتی بلکہ انہیں اپنے شکار کی تلاش ہوتی ہے۔ وہ موٹر سائیکل سواروں، مال بردار چھوٹی بڑی گاڑیوں اور شکل وصورت سے بے چارے نظر آنے والے مسافروں کو لے کر جانے والے رکشاؤں کو گھیرتے ہیں۔ حامد اور صبیحہ ٹریفک پولیس کے سامنے سے گزر گئے۔ اُن کے پیچھے دو واٹر ٹینکر ایک دوسرے سے مقابلہ کرتے دوڑتے چلے آرہے تھے۔ واٹر ٹینکروں کی دوڑ کی وجہ سے ٹریفک میں مزید کھلبلی مچ گئی۔ ہر گاڑی کا ڈرائیور اپنی جان بچانے کے لیے اِدھر اُدھر ہونے لگا۔ کاریں، رکشے، ٹیکسیاں، مال بردار گاڑیاں اِدھر اُدھر ہونے لگیں۔ اسی افراتفری میں حامد نے اپنی موٹر سائیکل بچانے کے لیے بڑی کوشش کی مگر واٹر ٹینکروں نے اسے موقع نہ دیا۔ دونوں بہن بھائی موٹر سائیکل سے گرے، ایک ٹینکر کی زد میں صبیحہ آئی اور دوسرے کی زد میں حامد آیا۔

مجھے میری بہن فون کر رہی تھی۔ مجھے اس کا ایک لفظ بھی سمجھ نہیں آرہا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر ایک ایک لفظ ادا کر کے بات کرے مگر مجھے پھر بھی اس کی بات سمجھ میں نہیں آئی۔ میں نے اپنے پاس بیٹھی اپنی بیٹی سے کہا کہ تم سنو پھوپھی کیا کہہ رہی ہیں؟ میری بیٹی کو بھی پھوپھی کی کوئی بات سمجھ میں نہ آئی پھر اس سے میرے چھوٹے بھائی نے بات کی۔ اسے صرف صبیحہ اور حامد کے الفاظ سمجھ میں آئے۔ میری بیٹی نے دوبارہ فون کر کے چچا سے پوچھا کہ صبیحہ اور حامد کو کیا ہوا؟ اس نے بتایا کہ صبیحہ کو پرچہ دلوانے کے لیے حامد ساتھ لے کر گیا ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ سخی حسن کے قریب دو بہن بھائی حادثے کا شکار ہوئے ہیں۔ ہمیں یہ معلوم نہیں ہو رہا کہ وہ دو بہن بھائی کون ہیں؟ میں نے بیٹی سے فون لے کر بھائی سے کہا کہ تم فوراً امتحانی مرکز جاؤ۔ میں نے دوسرے بھائی سے کہا کہ تم فوراً عباسی شہید اسپتال جاؤ۔ میں اپنی اہلیہ کو ساتھ لے کر عباسی شہید اسپتال کے لیے روانہ ہو گیا۔ میں ابھی راستے میں ہی تھا کہ مجھے چھوٹے بھائی نے دل دہلا دینے والی خبر سنائی کہ حادثہ میں جاں بحق ہونے والے دونوں بچے ہمارے ہیں۔ میری ہمت جواب دے گئی۔ مجھے پہلی بار سمجھ میں آرہا تھا کہ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جانا کیا ہوتا ہے، دل کا بیٹھ جانا کسے کہتے ہیں، ضبط کے بندھن کیسے ٹوٹتے ہیں، دل کو چوٹ کیسے لگتی ہے، دماغ ماؤف کیسے ہو جاتا ہے، امید کیسے دم توڑتی ہے، آس کیسے ٹوٹتی ہے۔ میں اسپتال پہنچا۔ مجھے سامنے بہن نظر آئی۔ ابھی تک اسے برباد ہو جانے کی خبر نہیں ملی تھی۔ یہ بہت ہی کٹھن کام مجھے کرنا تھا۔

میں اپنے بہن بھائیوں میں سب سے بڑا ہوں۔ وہ مجھ سے پانچویں جگہ چھوٹی ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

''بیٹا......! صبیحہ اور حامد شہید ہو گئے۔''

اس کا گلا رندھ گیا، آنسو بہہ نکلے، اس کی سانسیں اٹکنے لگیں، وہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگی۔ میری بیوی نے سچ مچ ایک ماں کی طرح اسے سنبھالا۔ میں نے اپنی بہن سے کہا۔

''بیٹا......! بچے چلے گئے۔ اگر تمہیں بھی کچھ ہو گیا تو کچھ بھی باقی نہیں بچے گا۔''

بچوں کے جنازے میں ہزاروں لوگ شریک تھے، ہر آنکھ اشکبار تھی۔ نارتھ ناظم آباد بلاک ٹی میں کھیرتھر پہاڑی سلسلے کی آخری پہاڑیوں کے دامن

میں بنے اورنگی واٹر ریزروائر سے ملحق کھلے میدان میں نمازِ جنازہ ادا کی جا رہی تھی۔

ہم دنیا کا درد لکھتے ہیں' اپنا پورا درد بھی نہیں لکھ سکتے۔ بچوں کے جنازے میں صوبائی وزراء'ارکان اسمبلی اور سیاسی جماعتوں کے رہنما شریک تھے۔ بچوں کا باپ اور میرے پانچ بھائی میرے ساتھ چل رہے تھے مگر یوں لگ رہا تھا کہ ہم میں سے کوئی بھی موجود نہیں۔

ہم جنازے لے کر قبرستان پہنچے۔ میرے والد اور والدہ کے پہلو میں صبیحہ اور حامد کی قبریں تیار تھیں۔ دو ہفتے پہلے صبیحہ میری چھوٹی بہن اور اپنی خالہ کے ساتھ اسی مقام پر آئی تھی۔ دونوں خالہ بھانجی میں بڑی دیر تک اس بات پر تکرار ہوتی رہی کہ اماں کے پہلو میں اُن میں سے کس کی قبر بنے گی؟ خالہ کہتی تھی کہ یہاں میری قبر بنے گی اور صبیحہ کی یہ ضد تھی کہ یہ میری قبر ہے۔ دونوں بازار سے ایک بڑی چادر لائی تھیں۔ صبیحہ نے وہ چادر چاروں طرف درختوں کی شاخوں سے باندھ کر قبروں کے اوپر تان دی تھی۔ اب وہ اس چادر کے نیچے خود سو رہی ہے۔ اس کے دائیں جانب چھوٹے بھائی حامد کی قبر ہے۔

یہ میرا ذاتی غم ہے اور میرے خاندان کا غم ہے۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ میں اس سانحہ پر کالم نہیں لکھوں گا مگر ابھی قبروں کی مٹی بھی نہیں سوکھی تھی' ابھی قبروں پر پڑے پھول بھی نہیں کملائے تھے' ابھی ہماری آنکھوں کے آنسو بھی خشک نہیں ہوئے تھے' ابھی بچوں کے حادثے کو چار روز بھی نہیں گزرے تھے کہ اس حادثے کے ذمہ دار ڈرائیوروں میں سے ایک ڈرائیور کی ضمانت ہوگئی اور وہ جیل سے باہر آگیا۔ دوسرے ڈرائیور کو بھی جیل سے باہر آنے سے کون روک سکے گا؟ ستم یہ ہے کہ ان دونوں ڈرائیوروں کو پکڑ کر پولیس کے حوالے کرنے والے نوجوان اب بھی پولیس کی حراست میں ہیں۔ پولیس 10 روز کا ریمانڈ لے کر ان نوجوانوں سے تفتیش کر رہی ہے۔ میں طرم خان ہوں' میں 35 سال سے زائد عرصے سے باقاعدہ صحافی ہوں۔ میں نے آمریت اور اختیارات کے ناجائز استعمال کے خلاف جنگ لڑی ہے۔ میں ہر دور میں ہونے والے ادارہ جاتی دنگل میں اپنے جیسے بے توقیر عوام اور ان کے بے توقیر کیے جانے والے نمائندوں کے ساتھ کھڑا رہا ہوں۔ میں نظامِ عدل کے بارے میں کسی خوش فہمی کا شکار تھا اور نہ اب ہوں۔ یہاں انصاف عدل کے ترازو میں فروخت ہوتا ہے اور یہ میں ہی جانتا ہوں کہ میری بہن بہت غریب ہے' وہ اپنے بچوں کی جان لینے والوں کو عدل کے ترازو پر نہیں تول سکتی کیونکہ عدل کے ترازو کے ایک پلڑے میں کرنسی نوٹ اور دوسرے پلڑے میں انصاف رکھا ہوتا ہے۔ واٹر ٹینکر کے مالک کے پاس پیسے تھے' اس نے ترازو کے پلڑے میں کرنسی نوٹ رکھ کر اپنا ڈرائیور چھڑا لیا۔ مجھے نمازِ جنازہ سے قبل ہی یہ اطلاع مل گئی تھی کہ واٹر ٹینکر کا مالک کہتا ہے کہ میرا ڈرائیور تین روز میں باہر آجائے گا اور پھر ویسا ہی ہوا۔ یہاں عدل کی چوکھٹ پر انصاف کا قتل ہوتا ہے۔ کیا تعزیراتِ پاکستان میں کوئی ایسی دفعہ شامل نہیں جو سڑکوں پر منہ زور ڈرائیوروں کو ایک دوسرے سے مقابلہ کرنے اور زندہ انسانوں کو روند ڈالنے سے روک سکے؟ میں اور میرے شہر اور میرے دیس کے لوگ کتنی بار صبیحہ اور حامد کے جنازے اٹھائیں گے؟ میں یہ سوال تفتیش کاروں سے کروں یا اپنے نظامِ عدل سے؟ میری بہن کے گھر کے چراغوں کو کس نے گل کیا؟ میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں؟ میں نے تو سنا تھا کہ معاشرہ کفر پر قائم رہ سکتا ہے مگر ناانصافی پر قائم نہیں رہ سکتا۔ میں انصاف کے لیے کس کے دروازے پر جاؤں؟



حنیف سحر

گردشِ رنگِ چمن

رسا چغتائی کا خیال

صرف مانع تھی حیا بند قبا کھلنے تلک
پھر تو وہ جانِ حیا ایسا کھلا ایسا کھلا

اس عورت کا حقیقی روپ سامنے لاتی کہانی جسے زمانہ طوائف کہتا ہے، چھٹا حصہ



''فیصل!'' میرے منہ سے نکلا اور میں اپنے پورے وجود سے لرز کر رہ گئی سارے جسم میں انگارے سے دہکنے لگے اور میرا بس نہ چلتا تھا کہ اسی وقت اس رذیل کا کلیجہ چبا جاؤں جس کا نام فیصل تھا اور جس نے مجھے ان حالوں کو پہنچایا تھا... کچھ دیر تک کھڑی سوچتی رہی کہ مجھے اب کیا کرنا چاہیے غصہ اور خون کھولتے جذبات قابو میں آئے تو میں نے شانتی سے سوچنا شروع کیا اور اس بدلے ہوئے منظر میں جو سب سے پہلی سوچ ذہن میں ابھری' وہ یہ تھی کہ میں اس وقت بھی اچھے لوگوں میں نہ تھی...اور فیصل جیسے گھٹیا اور کمینہ صفت انسانوں میں ہی ایک بار پھر سے آ پھنسی ہوں اور اب مجھے یہ مان لینا ہی ہوگا کہ میری تقدیر مجھے ہمیشہ کے لیے بھول چکی ہے اور میں اب بنا نصیب کی ایسی انسان ہوں جس سے دنیا جب چاہے اور جیسا چاہے' اس کے ساتھ سلوک کرے...تو کیا خدا اپنے بندوں کو یوں بھول بھی جایا کرتا ہے؟؟؟؟ عجیب عجیب سوال تھے جو ذہن میں ہلچل مچا رہے تھے اور مجھے نہیں پتا کہ ان سب سوالوں کی کیا حیثیت تھی صرف ایک ہی بات تھی جو میرے دل میں پوری طرح جم کے بیٹھی ہوئی تھی کہ میری جیسی عورتوں کے ساتھ قسمت جو نہ کرے' وہ کم ہے...

اب میں اپنے یا پھر اس کمرے میں آ کے بیٹھ گئی جو کچھ ساعتوں کے لیے میرا بنا اور جس میں کچھ دیر پہلے بیٹھی ہوئی تھی۔ کافی دیر گزر گئی مگر کوئی بھی نہیں آیا اور میں ہر ہر آہٹ پر اس طرح منتظر بیٹھی تھی جیسے بس اب آیا کہ تب آیا... مگر کوئی کیوں نہیں آیا میں تو فیصل خبیث کا انتظار کر رہی تھی کہ آخر وہ یہاں تک کیسے پہنچا اور احسن اور ساجد سے اس کا کیا تعلق ہے...رات گزرتی رہی مگر کوئی نہیں آیا...تب ہی مجھے خیال گذرا کہ جس وقت کئی مرتبہ دستک ہوئی تھی اور میں نے انجانے خوف سے ڈر کر دروازہ نہیں کھولا تھا' اسی وقت سے انھوں نے مجھے سوتا سمجھ کر جگانا مناسب نہ سمجھا اور اب غالباً وہ صبح ہی مجھ سے رابطہ کریں گے' یوں بھی فیصل کو دیکھ کر میں غصے سے پاگل ہو گئی تھی ورنہ انھیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ میں نے اٹھ کر ان چاروں کو دیکھ لیا ہے اور ان کے ساتھ فیصل کو دیکھ کر میری روح میں مسلسل آگ سی دہک رہی تھی۔

جب بہت دیر ہو گئی اور کوئی نہ آیا تو میں نے ان کے پاس جا کر اس اندیشے اس سسپنس اور اس گومگو کی کیفیت سے نکلنے کا فیصلہ کر لیا کہ آخر فیصل کا ان لوگوں سے کیا تعلق ہے اور وہ یہاں کیوں آیا ہے میں فوری طور پر فیصل سے ملنا چاہتی تھی۔ ابھی میں اپنے کمرے کے دروازے تک ہی پہنچی تھی کہ مجھے اس سوچ نے پکڑ لیا کہ کیا فیصل کو پتا ہے کہ میں یہاں ہوں؟ اگر فیصل کو پتا ہے تب تو سمجھو کہ احسن فیصل کا ہی بندہ ہے اور جو اسے نہیں معلوم تو پھر یہ میری غلطی ہوگی کہ میں اس کے سامنے آ جاؤں اور وہ پھر سے میری بربادی کا کوئی نیا سامان کرنے کی منصوبہ بندی کرنے میں لگ جائے، بس یہ سوچ کر میرے بڑھتے ہوئے قدم رک گئے کہ ایسی صورت حال میں مجھے بہت سوچ سمجھ کر قدم اٹھانا ہوگا ابھی تو میرے پاس ساجد اور احسن کو برا آدمی ماننے کے لیے صرف قیاس ہی تھا ان کی حقیقت پوری طرح مجھ پہ کھلی نہیں تھی کیوں کہ ابھی کچھ بھی تو واضح نہ تھا... لیکن میری ساری ذہانت اور دل بھی یہی کہتا تھا کہ ہو نہ ہو' احسن اور ساجد فیصل سے ملے ہوئے ہیں ورنہ اتنی جلدی فیصل عین اسی مقام پر کیسے پہنچ سکتا تھا جہاں میں ٹھہری ہوئی تھی۔ معاملہ چونکہ پوری طرح مجھ پر کھلا ہوا نہ تھا اس لیے میں نے صبح تک انتظار کرنے کو ہی مناسب سمجھا اور ساری رات یہ سوچتی رہی کہ صبح جب فیصل میرے سامنے آئے گا تو مجھے کیسے رویے کا مظاہرہ کرنا ہے۔

اُس رات میں چاہتی بھی تو مجھے نیند نہیں آنی تھی سو میں پوری رات نہایت بے چینی، دکھ اور انتقام کے مختلف جذبوں کے ساتھ ساتھ جاگتی رہی کبھی ایک جذبہ سر اٹھاتا کبھی دوسرا.... لیکن صبح میری توقع سے قطعی مختلف نکلی' میں جن رستوں پر پوری رات بھٹکتی رہی' وہ محض میری بدگمانیاں ثابت ہوئے اور یہاں ایسا کچھ نہ تھا جیسا میں نے سمجھا...البتہ یہ مخمصہ اب بھی میرے ذہن کو تہہ و بالا کیے دیتا تھا کہ رات والے دونوں بندے گرچہ رات ہی کو چلے گئے تھے بقول احسن...

''تو تم رات بھر ہمیں چھپ چھپ کے دیکھتی رہی تھیں؟'' احسن نے پوچھا اس کے لہجے میں کچھ عجیب سی شرمندگی تھی جسے میں کوئی معنی نہیں دے سکی یعنی شرمندہ مجھے ہونا چاہیے کہ میں احسن کے مطابق انھیں رات کو چھپ چھپ کے دیکھتی رہی تھی مگر عجیب سا جھینپا پن احسن کے رویے میں تھا' نہیں رات بھر تو نہیں مگر کچھ دیر تک دیکھ کر واپس اپنے کمرے میں چلی گئی تھی...

''وہ دونوں کون تھے؟'' میرے سوال پر احسن نے مجھے غور سے دیکھا کہ آخر میں کیا جاننے کی کوشش کر رہی ہوں۔

''وہ ہمارے دوست تھے۔''

''وہ جس کے کان تھوڑے چھوٹے تھے' اس کا کیا نام تھا؟'' میں نے اپنے دل کا شک پوری طرح دور کرنا چاہا کہ وہ واقعی فیصل ہی تھا۔

'' اس کا مطلب ہے تم نے بہت غور سے دیکھا... پوچھ سکتا ہوں کہ اتنی تفتیش کیوں کر رہی ہو؟'' احسن نے میری طرف اور زیادہ توجہ سے دیکھا اور میں جو یہ سمجھ رہی تھی کہ وہ فوری طور پر فیصل کا نام لے دے گا اور میری بے چینی کو قرار مل جائے گا تو ایسا نہ ہوا۔

احسن کے سوال پر میں چپ رہی تو وہ پھر بولا۔

''کیوں' کیا وہ چھوٹے کان والا اچھا لگا تمہیں؟'' اس نے غیر سنجیدگی سے ہنستے ہوئے کہا۔

میں اسے کیا بتاتی کہ میں اس چھوٹے کان والے کی دشمن ہوں اور یہ حقیقت ہے کہ اگر میں فیصل کو اپنے ہاتھوں سے موت کے گھاٹ اتار دوں تو اس بے مہر دنیا میں جینے کی کوئی آرزو باقی نہ رہے گی۔ ''تم بتاؤ تو بعد میں بتاؤں گی کہ میرے دل میں کیا ہے؟'' میں نے کہا۔

''اوہ' تو تمہارے دل میں کچھ ایسا ہے جو خاص ہے، نام بتانے سے پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں کہ تم چاہو گی بھی تو وہ تمہیں نہ مل سکے گا...اس کا نام فرحان ہے۔''

''کیا...؟'' ایک زبردست حیرت کا جھٹکا تھا جو مجھے لگا۔ ''فرحان.... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟''

'' کیا مطلب کیسے ہو سکتا ہے؟'' احسن نے کہا۔

''یہی جو تم نے ابھی کہا' اس کا نام فرحان کیسے ہو سکتا ہے؟''

''تو کیا تم اسے جانتی ہو؟'' احسن کے لہجے میں بھی حیرت در آئی...

''بہت اچھی طرح جانتی ہوں' اس کا نام فرحان نہیں بلکہ فیصل ہے۔'' میرے لہجے میں ایک ایسی پھنکار تھی جیسے میرے اندر کا سارا کرودھ پھٹ کر بہہ نکلے گا۔

''کب سے جانتی ہو اسے؟''

''جب سے ہوش سنبھالا ہے' تب سے جانتی ہوں..'' میں نے بھرپور یقین کے ساتھ کہا۔

'' اس کے باوجود کہ تم اسے مجھ سے زیادہ عرصے سے جانتی ہو' میں یہی کہوں گا کہ اس کا نام

فیصل نہیں، فرحان ہے اس بحث کو ختم کرنے کا ایک سب سے اہم طریقہ یہ ہے کہ کل اسے بلا کے تم سے ملوا دوں گا پھر خود ہی فیصلہ کر لینا کہ کون صحیح کہہ رہا ہے۔ اس وقت میں تم سے ایک بہت ضروری بات کرنا چاہتا ہوں...''

احسن نے اچانک موضوع بدل دیا اور مجھے بھی لگا کہ وہ کسی بہت سنجیدہ مسئلے کی وجہ سے مجھے یوں ساجد کے سامنے سے اٹھا کر اور الگ کمرے میں لایا تھا اس وقت، ہم دونوں اس کمرے میں تھے جس میں مجھے ٹھہرایا گیا تھا۔ میں سوچنے لگی کہ ممکن ہے رات کے اندھیرے میں میں نے دیکھنے میں غلطی کر دی ہو اور وہ فیصل نہ ہو فرحان ہی ہو..

''بولو کیا بات ہے؟'' میں نے اسے دیکھتے ہوئے کہا۔

''یہ جو کچھ میں کہنے والا ہوں اسے سن کے یوں سمجھ لو کہ تمہارے پیروں کے نیچے سے زمین کھسک جائے گی بلکہ یہ کہوں تو اور بہتر ہوگا کہ بہت سوچا کہ تم سے یہ بات نہ کہوں مگر میرے پاس کہہ دینے کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ نہیں ہے، میں تمہارے ساتھ کچھ مختلف یہ کر سکتا تھا کہ تمہیں اپنی مرضی کی چوائس بھی دوں کہ تم کیا چاہتی ہو؟'' وہ رکا تو گویا میں ہانپ رہی تھی پتا نہیں وہ کیا کہنے والا تھا اور اتنی لمبی تاویل کی کیا ضرورت ہے جو کہنا ہے فٹافٹ کیوں نہیں کہہ دیتا احسن جو بھی کہنے والا تھا میں یہ ضرور جان گئی تھی کہ اب پھر مجھے کسی نئے جہنم میں جھونکنے کی تیاری کی جا رہی ہے۔

''اتنی لمبی تاویل کھینچ کر مجھے اور ہلکان مت کرو کہہ دو جو بھی کہنا ہے میں سب کچھ سننے اور سہنے کو تیار ہوں۔''

''تو پھر سنو ٹرین میں تمہارے ایک اجنبی ہمدرد نے تم سے کہا تھا کہ میں اسی طرح لڑکیوں کو بہلایا کرتا ہوں اور یہ میرا ایک قسم کا مشغلہ ہے تو اس نے غلط نہیں کہا تھا اگر اس غریب کو یہ معلوم ہو جائے کہ یہ میرا مشغلہ نہیں بلکہ پیشہ ہے تو وہ مجھے جان سے ہی مار دے...''

''پیشہ ہے مطلب...؟؟'' میرا دل ایسے زور زور سے دھڑکنے لگا کہ اگر جلد سے جلد مجھے اصل حقیقت کا پتا نہ چلا تو میرا دل سینے کی دیوار توڑ کے باہر نکل آئے گا۔ ''میں سمجھی نہیں، یہ تم کس قسم کے پیشے کی بات کر رہے ہو؟''

''پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے اپنے کسی انکل کا ذکر کیا تھا جن کے پاس تم کراچی آئی ہو؟ کیا تمہیں کچھ بھی یاد ہے کوئی نشانی یا کسی کا فون نمبر جس پر رابطہ کر کے تمہیں ان تک پہنچایا جا سکتا ہو؟''

''تم یہ کیوں پوچھ رہے ہو؟'' میں نے جیسے پھر کچھ کھوجنا چاہا، عجلت میرے لہجے سے عیاں تھی۔

''تمہارے لیے اس سے بہتر اور کچھ نہیں ہو سکتا کہ تمہیں جلد سے جلد تمہارے انکل تک پہنچا دیا جائے.. دیکھو اگر تمہارے پاس کوئی بھی سراغ ہے تو مجھے بتا دو میں انھیں ڈھونڈنے کی پوری کوشش کروں گا... پلیز، اب دیر مت کرو میں نے ساجد وغیرہ سے بڑی مشکل سے صرف ایک چانس لیا ہے وہ بھی زندگی میں پہلی بار صرف تمہاری خاطر.. کیونکہ......''

وہ بولتے بولتے رک گیا۔

''اپنی بات پوری کہہ دو مجھے سب سے زیادہ دلچسپی یہ ایک بات سننے میں ہے جو تم کہتے کہتے رک گئے ہو...'' میں نے بڑی گمبھیرتا سے کہا۔

''اب ان باتوں کا کچھ فائدہ نہیں بلکہ کبھی بھی فائدہ نہیں ہوتا.. ہو ہی نہیں سکتا.. مگر جب دل کو کوئی اچھا لگنے لگتا ہے بہت اچانک تو انسان کچھ دیر کو ہی سہی اپنا سب کچھ بھول جاتا ہے... مگر حقیقت کی ٹھوکر اسے پھر سے اس روشنی میں لے آتی ہے جس میں وہ کچھ اس طرح کھڑا ہو جاتا ہے کہ اس کے جسم پہ پورے کپڑے بھی نہیں ہوتے۔'' اس کی الجھی ہوئی باتوں سے میں اور بھی الجھ گئی اور جو سننا یا جاننا چاہتی تھی وہ اس الجھی ہوئی گفتگو کے رستوں میں جیسے خود بھی کہیں بھٹک گیا.. اس وقت تو مجھ میں اتنی سمجھ نہ تھی مگر اب مجھے یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ چکی ہے کہ انسان جب کچھ کہنا چاہتا ہے اور کہہ نہیں پاتا تب ہی وہ اس قسم کی باتیں کرنے لگتا ہے۔ اب میں اسے کیا بتاتی کہ اول تو میرا کوئی انکل کراچی میں تھا ہی نہیں، ظاہر ہے میں نے اس سے جھوٹ بولا تھا اور فرض کرو ہوتا بھی تو کیا جن حالات میں میں اپنے گھر کو چھوڑ کے آئی ہوں وہ ایسے حالات ہیں کہ میں اپنے انکل یا کسی بھی رشتے دار کے گھر جانے کے قابل ہوں؟ کہیں بھی جاتی کسی کے بھی پاس جاتی، نئی بدنامیوں اور نئی چہ میگوئیوں کو جنم دینے کا سبب بنتی یعنی جس بدنامی اور رسوائی سے بچ کر میں اپنے شہر سے بھاگ کر نامعلوم منزلوں کی طرف دوڑ رہی ہوں انھی کا سامنا اتنی دور اور ایک دوسرے شہر میں آ کے کیسے کر سکتی تھی...

''فرض کرو میرے کوئی انکل نہیں ہیں اور اگر ہیں بھی تو میں ان کے پاس نہیں جانا چاہتی تب؟'' میں نے پھر جاننا چاہا کہ آخر احسن کی ان سب باتوں کے پیچھے چھپی ہوئی اصل بات کیا ہے؟

''یہ پہیلیاں بوجھنے کا ٹائم نہیں ہے جو اگر انکل ہیں اور تم ان کے بارے میں کچھ بھی جانتی ہو تو مجھے بتا دو اس وقت تم انکل کے پاس کسی بھی وجہ سے نہ جانا چاہو.. مگر میں سمجھتا ہوں دنیا کی کوئی بھی وجہ اس سے زیادہ رکیک اور تباہ شدہ نہیں ہو سکتی جو یہاں تمہارے ساتھ ہونے والا ہے اور جس سے میں تمہیں بچانے کی ایک آخری کوشش کر رہا ہوں۔''

''پہیلیاں تو تم بجھوا رہے ہو، جلدی سے بتا کیوں نہیں دیتے کہ آخر تم کہنا کیا چاہتے ہو؟ دنیا میں وہ سب سے زیادہ کیا برا ہے جو میرے ساتھ ہونے والا ہے اور جس سے تم مجھے بچانا چاہتے ہو؟'' میں تقریباً چیخ ہی تو پڑی تھی۔

''اچھا تو پھر سنو میں نے کہا تھا نا ٹرینوں میں اکیلی لڑکیوں کی میں مدد کرتا ہوں اور یہ میرا مشغلہ نہیں ہے نہ ہی میں فلرٹی ہوں بلکہ یہ سب میرا پیشہ ہے... میں بے سہارا اور گھر سے بھاگی ہوئی لڑکیوں کو اسی طرح بہلا پھسلا کر اپنے ساتھ یہاں تک لاتا ہوں بعد میں ہم....'' وہ رکا۔

''بعد میں کیا؟'' اس نے منہ دوسری طرف پھیر لیا صرف اس کی آواز تھی جو میرے کانوں کو لہولہان کر گئی۔

''بعد میں ہم انھیں مناسب داموں پر بیچ دیتے ہیں...''

''کیا...!!!'' ایک لمبی چیخ تھی جو میرے وجود میں کمان ہو گئی۔

''کل جو لڑکے آئے تھے جس میں سے کسی ایک کو تم فیصل سمجھی ہو وہ بھی اسی گروپ کا حصہ ہیں کسٹومر لانا ان کی ذمہ داری ہے اسی لیے رات کو وہ تمہارے کمرے کا دروازہ بجا رہے تھے وہ تمہیں دیکھ کر اندازہ لگانا چاہتے تھے کہ تم کتنے کا مال ہو... تاکہ اسی حساب سے تمہارے لیے گاہک ڈھونڈیں...''

اس کے علاوہ بھی وہ جانے اور کیا کچھ کہتا رہا مگر میں تو جیسے کھڑے کھڑے ہی ایک لاش میں تبدیل ہو چکی تھی جیسے میرے کانوں میں کوئی سیسہ پگھلا کے ڈال دیا گیا ہو سارا جسم انگارے کی طرح دہکنے لگا اور جب میرے حواس بحال ہوئے، میں پورے شعور کے ساتھ کچھ سننے سمجھنے کے قابل ہوئی تو میرے ذہن کے پیالے میں بس ایک ہی بات گونج رہی تھی کہ یہ دنیا خبیث فیصل جیسے انسانوں سے بھری

پڑی ہے ہر گام ہر موڑ پر بھیس بدل بدل کے ایسے لوگ ملتے ہیں یعنی میں تو فیصل کو ہی دنیا کا سب سے نیچ انسان سمجھتی تھی مگر ایسا نہ تھا' اس زمانے میں فیصل جیسے لوگ قدم قدم پر موجود ہیں' احسن اور اس کا گروہ تو فیصل سے زیادہ رذیل تھا کہ یہ لوگ باقاعدہ عورتوں کی خرید و فروخت کا کروبار کرتے تھے، انھیں صرف اچھے داموں سے غرض تھی پھر چاہے لڑکیاں اور عورتوں کے ساتھ کیسا ہی سلوک کیوں نہ ہو اور یہ سب مدد کرنے کے ایک دلفریب دھوکے کی آڑ میں کیا جاتا تھا۔

''تم اب تک کتنی لڑکیوں کو اس جہنم میں دھکیل چکے ہو؟'' میرے اچانک پوچھے گئے سوال پر احسن نے پلٹ کر مجھے دیکھا۔ میرا چہرہ غصے سے تمتما رہا تھا اور جسم کا سارا خون جمع ہو کر جیسے چہرے پر جمع ہو گیا تھا میں نے اس انسان سے کیسی کیسی امیدیں باندھ لی تھیں' کیسے خواب تھے جو میری آنکھوں میں دندناتے ہوئے گھسے چلے آرہے تھے اور میں نے احسن جیسے رذیل اور قبیح آدمی کو کتنا معصوم سمجھا تھا کیا کچھ تھا جو اس وقت ایک مرتبہ پھر میرے اندر ٹوٹا تھا اور میں ایک مرتبہ پھر کھلے آسمان کے نیچے کھڑی تنہا اور بے یار و مددگار ہو گئی تھی... ایک ایسی انسان تھی جو اونچی پہاڑی سے لڑھکا دی گئی تھی...

''کن لوگوں کو بیچتے ہو تم مجھ جیسی بے سہارا عورتوں کو...؟'' ایک کراہ تھی' ایک ٹوٹے ہوئے وجود کی چیخ تھی جو اس وقت سوال بن کے میرے حلق سے خارج ہوئی...

احسن نے مجھے ایک ایسے انسان کی طرح دیکھا جو میری طرح نہیں تو مجھ سے کچھ کم مگر کچھ نہ کچھ زخمی ضرور تھا۔ ''اسی لیے میں کہتا ہوں تم مجھے اپنے انکل کا پتا دے دو میں نے ان لوگوں سے تمہیں چھوڑ دینے کا وعدہ لیا ہے اور یہ کہا ہے کہ میں زیادہ سے زیادہ دو دن میں تمہیں وہاں پہنچا دوں گا جہاں تم جانا چاہتی ہو، بعد میں یعنی دو دن بعد میرا تم پہ اختیار ختم ہو جائے گا اور پھر بک جانا تمہارا مقدر ہے...''

''میرا کوئی انکل نہیں ہے' میں نے تم سے جھوٹ کہا تھا۔'' میں نے مرے ہوئے لہجے میں ایک شکست خوردہ انسان کی طرح اسے بتایا جیسے اب اس بات کی کوئی اہمیت ہی نہ رہی ہو میری نظر میں...

احسن نے چونک کر مجھے دیکھا... اور بولا کچھ نہیں...

''مجھے کس کے ہاتھ بیچا جائے گا؟'' میں نے زخمی لہجے میں پوچھا، وہ چپ رہا جیسے اسے اپنی اس کوشش میں ناکامی پر افسوس ہوا ہو کہ وہ مجھے بچانا چاہتا تھا مگر بچا نہ سکا تھا۔

میں کسی شرابی کی طرح اس کے قریب آئی جیسے پیروں میں من من بھر کے پتھر بندھے ہوں جسم سارا لہولہان ہو... ''اے کاروباری انسان میں نے تیرے بارے میں بہت سے سپنے انجانے میں اپنی آنکھوں میں سجا لیے تھے اور سمجھ رہی تھی کہ میں کٹی ہوئی پتنگ تھی مگر بے رحم ہواؤں نے مجھے ایک ایسے پرشوق بچے کی گود میں لا پھینکا ہے جسے مجھ سے اس حد تک ضرور انسیت ہو گئی ہے کہ میرے ٹکڑے ٹکڑے کر کے میری چیر پھاڑ نہ کرے گا... بلکہ سینت سینت کے اپنے پاس رکھے گا... مگر میں مقدر ہیٹی ہوں' ایک بار جائے پناہ اور اپنا آسمان کھو چکی ہوں تو اب بس پیروں کی وہ دھول بننے لائق رہ گئی ہوں جسے کوئی انسان گھر میں نہیں لے جانا چاہتا بلکہ ٹھوک ٹھاک کر دہلیز کے باہر ہی چھوڑ جانا چاہتا ہے۔ احسن' تم مجھ سے اتنی ہمدردی تو ضرور کرنا کہ مجھے کسی ایسی جگہ بیچنا جہاں میری کچھ تو قدر ہو' مجھے بھلے ہی مخمل اور ریشم میں لپیٹ کر نہ رکھا جائے' پہننے کو کھدر ملے اور کھانے کو سوکھی روٹی مگر کچھ عزت سے ملے... کیا میرے لیے تم اتنا بھی نہ کرو گے؟'' میں رو پڑی اور اس کی گردن سے جھول گئی۔ جانے کس احساس سے اور پتا نہیں کیسے لمحے کے اس حصے میں اسے مجھ پر پیار آ گیا اور اس نے مجھے خود سے چمٹا لیا اور میں جو چھلک چھلک کے روئی تو کچھ لمحوں کے لیے اس کی آنکھیں بھی نمناک ہو گئیں۔

''اسی لیے تو کہتا ہوں کہ تمہارا کوئی ہے یہاں یا کہیں جانا چاہو تو میں چھوڑ آتا ہوں تمہیں۔'' وہ دھیمی گمبھیر آواز سے بولا تھا۔

''میرا کوئی نہیں' کیا تم مجھے اپنے پاس نہیں رکھ سکتے...؟'' ایک آخری امید پر اس کے چہرے کی طرف دیکھتے ہوئے میں نے کہا۔

''یہ یہاں کا اصول نہیں ہے' کوئی کسی کو اپنے پاس رکھنا تو دور' اس کے ساتھ کسی بھی طرح کا رشتہ بنانے کی ہلکی سی کوشش بھی نہیں کر سکتا... اجازت نہیں ہے جو ایسی غلطی چھپ کے بھی کرے گا اسے ایسی سخت سزا دی جاتی ہے کہ وہ پھر کبھی ایسی غلطی نہ کر سکے نہ ہی کوئی کسی کو بھی کہیں لے کر بھاگ سکتا ہے جو ایسا کرے گا' اسے پاتال میں سے بھی کھود کے نکال لیا جائے گا اور پھر اسے جان سے مارنے کا قانون ہے۔ پولیس اور بڑے بڑے بااختیار لوگ اس پیشے کی پشت پناہی کرتے ہیں لہٰذا کہیں کوئی شنوائی نہیں ہے یوں سمجھ لو یہ ناممکن بات ہے۔'' اس نے حتمی طور پر جیسے میری سوچوں کا یہ راستہ تو بند کر دیا اور پھر بولا۔ ''ابھی ان لوگوں کی دی ہوئی مہلت کل تک اور ہے تم بھی سوچو اور میں بھی سوچتا ہوں کہ اور کیا راستہ ہو سکتا ہے؟'' یہ کہہ کر وہ چلا گیا اور میں کمرے کے حبس زدہ ماحول میں اکیلی کھڑی رہ گئی۔

میری زندگی میں انگارے بھرے جا چکے تھے جتنا سوچتی تھی' اتنا ہی خود کو بے دست و پا پاتی تھی اور پھر ایسی سوچوں نے بھی مجھے اپنی طرف متوجہ کیا کہ اگر میری قسمت میں بکنا ہی لکھا ہے تو میں کیوں نہ ایسی جگہ پر بکوں جہاں کم سے کم اٹھتے بیٹھتے جوتے نہ کھانے پڑیں' کہیں نوکرانی وغیرہ کے کام میں بیچ دیا تو وہاں میرا جسم اور میری محنت سب میرے مالک کے جنبش ابرو کے محتاج ہوں گے اور اس کام میں نہ عزت محفوظ ہے نہ انا کی کوئی تسکین کا سامان ہے' بس ذلت ہی ذلت ہے... مگر ایک بکی ہوئی عورت کی عزت دنیا کے کسی بھی گھر میں کسی بھی پیشے میں ہو ہی کیسے سکتی ہے۔ یقیناً میں عورت نام کے دائرے سے باہر نکال دی گئی ہوں اور اب پیار عزت اور ذات کی تسکین جیسے جذبوں کا مجھ سے ہر قسم کا ناطہ اور تعلق ختم ہو چکا ہے۔

کیسی بے بسی تھی اور کیسے کمزور پڑتے جذبے اور حوصلے تھے جس طرح کی باتیں احسن نے کی تھیں اس کا مطلب ہے کہ اب میں ان لوگوں کے لیے ایک قسم کا سودا ہوں جس سے انھیں بھاری منافع ہونے والا ہے تو وہ اب مجھے عزت سے مرنے بھی نہ دیں گے... انھی دونوں خیالات کا ذکر رات کے کھانے کے بعد میں نے احسن سے کیا۔

''یہ مرنے والی بات مجھے پسند نہیں آئی اور تمہارے اس اقدام سے مجھے دکھ بھی بے حساب ہو گا دوسرے یہ لوگ مجھے جینے نہیں دیں گے کہ میں تمہاری حفاظت نہیں کر سکا میری موجودگی میں تم نے ایسا انتہائی قدم کیسے اٹھا لیا اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو ہو سکتا ہے کوئی پولیس کیس وغیرہ بن جائے' یہ سب میں تمہیں اس لیے بتا رہا ہوں کہ مرنا بھی اتنا ہی مشکل ہے جتنا کہ جینا دوبھر ہے البتہ تمہاری یہ دوسری سوچ کہ تم کسی کی غلامی میں نہیں جانا چاہتی' یہ ممکن ہے... سب ہی رستوں پہ بدنامی اور اندر کی ٹوٹ پھوٹ اور ذلت کی زندگی تمہاری جیسی لڑکیوں کی منتظر ہے مگر طوائف.. والا ایک راستہ ایسا ہے کہ مسلی بھی جاؤ گی اور روز روز بکو گی بھی مگر اس رستے پر

اپنی مرضی پوری طرح تو نہیں مگر بہت حد تک اپنی مرضی سے جینے کو مل جاتا ہے۔'' بڑی مشکل سے شاید اس نے یہ بات کہی مگر اسے بھی لگتا تھا کہ کہہ دینے میں ہی عافیت اور میری بھلائی ہے۔

طوائف...... یہ لفظ میرے تو جیسے حلق سے ہوتا ہوا میرے سارے جسم کو ہی ترش اور کڑواہٹ سے نگل گیا... آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ گئی اور پھر میں اپنے مقدر پہ خوب روئی یہ جانتے ہوئے بھی ابا اور اماں کو آوازیں دیں کہ وہ مجھے اب دنیا کے کسی بھی ظلم سے بچا نہیں سکتے تھے... مجھے یوں روتا بلکتا دیکھ کر ساجد نے تو صرف اتنا کہا کہ کاش ہم تمہارے لیے کچھ کر سکتے... جبکہ احسن مسلسل مجھے چپ کرانے اور چپ رہنے کی تلقین کرتا رہا... دنیا میں بڑے دکھ ہیں اور انسان اکیلا اور مجبور ہے...

اب میری مرضی سے ہی یہ طے ہو گیا کہ میرا سودا کسی طوائف کے ہاتھوں کیا جائے گا.. ان لوگوں کے رابطے میں ایسی عورتیں بھی تھیں جو لڑکیوں کو خرید کر انھیں اپنے دھندے کے بھید بھاؤ سمجھاتیں اور تربیت کر کے انھیں خوب طاق کر دیتیں تا کہ بعد میں وہ انھیں خوب کما کما کے دیتی رہیں اور اس طرح طوائفوں کا پیشہ صدیوں سے اپنا سفر نام و نشاں قائم رکھے ہوئے ہے... اور یوں میں دلشاد بائی تک پہنچی...''

ایک طویل سرد آہ کھینچ کے بلقیس چپ ہو گئی کمرے میں پرانی بوسیدہ ٹیوب لائٹ کی روشنی پیلاہٹ کی طرف مائل تھی اور عجیب اندھا دندھا سا اجالا تھا اس قسم کے ماحول میں جب ایک پرہول خاموشی نے ڈیرا لگایا تو سائرس کو نصرت کی سانسوں کی بلند آواز بھی ایسی لگ رہی تھی جیسے کانوں میں کوئی تیز آوازیں گھسی چلی آتی ہوں.. بلقیس کی پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک پوری اجڑی ہوئی عورت کی بے کسی جھانک رہی تھی کچھ دیر کی خاموشی کے بعد بلقیس نے خود ہی پھر سے لب کشائی کی جیسے اس بے پناہ دلدوز اور عورت کے لٹنے کے اس قصے نے تو سائرس کی سوچ کو بھی کچھ دیر کے لیے منجمد کر دیا، اور کوئی نیا سوال کرنے کا حوصلہ فوری طور پر اس میں نہ ہوا۔

بلقیس بولی۔ ''چالیس ہزار میں خریدا دلشاد بائی نے مجھے اور اب تک کئی گنا رقم وصول چکی ہیں مگر وہ کہتی ہیں' مہنگائی نے مت مار رکھی ہے جتنا بھی کماؤ پورا ہی نہیں پڑتا اور طوائفیں کوئی عام عورتیں تو ہوتی نہیں ہیں جو روکھا سوکھا کھا کے اور موٹا جھوٹا پہن کر بھی چپ چپاتے زندگی گزار دیتی ہیں۔ طوائف کی تو چمک دمک ہی بکتی ہے اور چمک دمک پیسوں سے آتی ہے اچھا کھانا اور اچھا پہننا' یوں سمجھو' بھاؤ بڑھانے اور دکان پر ہر وقت گاہکوں کا ہجوم جمع رکھنے کا کاروباری تقاضہ ہے یہ... سو....'' وہ پھر اداسی سے خاموش ہو گئی۔

''کبھی احسن نہیں آیا تم سے ملنے؟'' سائرس نے پوچھا تو بلقیس نے ایسے اجنبی انداز سے سائرس کو دیکھا جیسے کہنا چاہتی ہو کہ یہ اس قدر ذاتی سوال کرنے والے تم کون ہو؟

''اب میرے خیال سے' میری کہانی کا انت ہوا اور مجھے چلنا چاہیے... دلشاد رستہ دیکھتی ہوں گی۔'' بلقیس نے جس بے رخی سے احسن والے سوال کو نظر انداز کیا تھا' اس سے سائرس کو لگا کہ ابھی اس کہانی میں اور بھی کوئی تہہ داری ہے جسے بلقیس کہنا نہیں چاہتی..

''اتنا کچھ کہہ دیا پھر بھی ایسا کچھ نہ کچھ اب بھی ہے جو آپ نے نہیں کہا' اسے کہہ دینے میں کیا امر مانع ہے' کچھ الجھن سی ہے میرے من میں۔''

سائرس کی بات سن کر بلقیس تھوڑا سا مسکرائی۔''

آپ کی بڑی گہری نظر ہے آپ کی' ایک لکھاری کی نظر ایسی ہی ہونا چاہیے مگر جو آپ پوچھنا چاہتے ہیں' وہ میں بتانا نہیں چاہتی' بس اتنا جان لیجے کہ ''زندگی میں ہمیں سبق اس وقت ملتے ہیں جب ہم ان سے کچھ حاصل نہیں کر سکتے' سمجھو' ہمارے لیے بے کار ہو جاتے ہیں۔ میں ایسی بھی گیانی نہیں ہوں کہ ایسی بڑی بڑی باتیں کہنے لگوں کسی بڑے آدمی کا قول ہے' کہیں پڑھا تھا شاید میں نے اور اب یاد نہیں آ رہا کہ کہاں...'' بلقیس کے لہجے میں ایک ایسی پراسریت اور گہرائی تھی کہ سائرس کو لگا کہ بلقیس نے اگر یہ بات نہ کہی تو وہ اپنے ہونے کو ثابت نہیں کر سکے گی مگر پتا نہیں کیوں وہ یہ بات کہنے سے کترا رہی تھی۔

''تو آپ نہ بتانا چاہیں گی؟'' سائرس نے عجب مخمور سے لہجے میں اصرار کیا۔

نصرت ہونقوں کی طرح سائرس کو دیکھنے لگا۔

''کہانہ دلشاد بائی انتظار کرتی ہوگی۔''

''صرف انتظار ہی نہیں باجی' وہ تو یہ یقین بھی کر کے بیٹھ جائیں گی کہ کوئی گاہک مل گیا ہوگا پھر سو طریقوں سے مجھ سے اگلوائیں گی کہ کہاں ملا' کون تھا اور کیسا دکھتا تھا' تجھے کتنے پیسے ملے تو کہاں تھی... کیوں آیا...؟''

بلقیس دھیرے سے مسکرائی اور بولی۔ ''خوب باتیں بنانا آ گئی ہیں تمہیں بھی۔''

زرینہ ایک دم جیسے سہم کر گھبرانے لگی۔ ''کیوں آپا' کچھ غلطی ہوئی ہم سے؟ آپ ایسا کیوں کہتی ہو؟''

''ایسی بڑی غلطی نہیں ہے یہ... سائرس صاحب تو ہمارے اپنے ہیں' کسی غیر کے سامنے اپنے گھر کی باتیں نہیں کرتے سمجھی باؤلی..''

''جی آپا' خوب سمجھ گئی آئندہ بہت خیال رکھوں گی۔'' زرینہ نے کچھ سکون سا محسوس کر کے کہا...

بلقیس جانے کو اٹھی' زرینہ سارا سامان سمیٹ چکی تھی.. سائرس کو لگا کہ بلقیس نے کوئی ایسا اشارہ کیا ہے جس کے مطابق وہ یہ بات سب کے سامنے نہیں کرنا چاہتی تھی۔

*****

اس رات جب سائرس نے اس بلڈنگ کی سیڑھیاں چڑھیں تو وہ اکیلا ہی تھا' آج وہ بلقیس سے ملنے اس کے گھر آیا تھا' اس دن چلتے وقت اس نے جو بلقیس کو اپنا وزیٹنگ کارڈ دیا تو اسے یقین تھا کہ بلقیس اسے فون ضرور کرے گی... اور اِس وقت اُسی فون پر ہوئی گفتگو سے یہ ملاقات کا وقت طے ہوا تھا اور سائرس اکیلا آیا تھا مگر اسے اُس وقت کافی دشواری کا سامنا کرنا پڑا جب... دلشاد بائی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔

وہ سائرس کو دیکھتے ہی بولی۔ ''کیوں میاں رائٹر گھر تک آ پہنچے؟ کیا ہمارا دھندہ چوپٹ کرانے کا ارادہ ہے؟''

''آپ پریشان مت ہوں' آپ کے اندیشے درست نہیں ہیں' کیونکہ میں شاید آج پہلی اور آخری بار آیا ہوں۔'' سائرس نے دلشاد کی تسلی کرنے میں کسر اٹھا نہ رکھی۔

''اللہ کرے' جو تم نے کہا' وہ ہی پورا سچ ہو ورنہ معذرت چاہتے ہیں میاں رائٹر' ہم سے یہ سب بلاوجہ مراسم زیادہ برداشت نہ ہوں گے یوں بھی طوائف کی دنیا میں بنا مطلب کے مراسم کے کوئی معنی نہیں ہیں... امید ہے آپ کو خیال رہے گا' بھول مت جایئے گا۔'' دلشاد بھی اچھی طرح اس کی خاطر کیے بنا چھوڑنے والی نہیں تھی... سو سائرس نے ان کے آگے ہاتھ جوڑے کہ وہ کسی قیمت پر ان کی اس تنبیہہ کو فراموش نہ کریں گے.. ایک بڑے کمرے سے گزرنے کے بعد چند سیڑھیاں تھیں' اُن کو عبور کر

کے ہی اس کمرے میں جایا جاتا ہے جس میں بلقیس کا قیام ہے اور گھر کی ایسی بناوٹ ہونے کی وجہ سے یہ کمرا باقی گھر سے الگ تھلگ معلوم ہوتا تھا... بلقیس تیاری کرتی ہوئی ملی وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے بیٹھی ہوئی اپنی نک سک ٹھیک کرنے میں بزی تھی.. زرینہ نے سائرس کو بلقیس کے کمرے تک پہنچایا۔

''طوائفوں کی روایت نہیں کہ وہ کسی خالی جیب کے غریب آدمی کو زیادہ منہ لگائیں ورنہ میرا تو آپ سے ملنے کے بعد دل یہی چاہتا ہے کہ آپ کی صحبتوں کو طول دیتے رہیں' اچھا لگتا ہے آپ سے باتیں کر کے۔'' وہ رکی پھر بولی ساتھ ہی ایک نظر بھر کے اس نے سائرس کو دیکھا۔ ''آپ نے برا تو نہ مانا ہوگا میری بات کا' طوائف اتنی بھی بے تکلف نہ ہو تو اسے طوائف کون کہے گا' آپ کھڑے کیوں ہیں' بیٹھتے کیوں نہیں ہیں؟'' سائرس جھٹ سے بیڈ کے کونے پر ٹک گیا... سائرس کو ایسی جگہوں پر آنے کا کوئی تجربہ نہ تھا اس لیے کچھ فطری گھبراہٹ سی تھی اس کے رویئے میں۔

''جی' پوچھیے' ایسا کیا ہے جو اب بھی آپ کو پوچھنا باقی ہے؟ ہم نے تو اپنی کہانی ایسی ایمانداری سے سنائی کہ وہ سب بھی کہہ ڈالا جو نہ کہنا چاہیے تھا۔''

''کچھ ایسا ہے ضرور جو آپ نے اس ساری کہانی میں پوشیدہ رکھا ہے۔'' سائرس نے بات وہیں سے چھیڑی جہاں سے بلقیس نے کچھ غائب کیا تھا۔ کیا واقعی یہ پورا سچ ہے جو بلقیس نے اس روز بتایا تھا؟

''کیا جاننا چاہتے ہو؟'' بلقیس ایک دم اس کے منہ کے سامنے آ کے بیٹھ گئی۔

''یہی کہ کبھی تم سے ملنے احسن کیوں نہیں آیا؟ تم اس سوال کا جواب دینے سے کترا گئی تھیں' کچھ ایسا ہے جو تم بتانا نہیں چاہتیں؟''

''تم پوچھ کر کیا کرو گے؟ تمہیں اس سے حاصل بھی کچھ نہ ہوگا پھر بھی یہ سوچ کر بتائے دیتی ہوں کہ تم مجھے ہم جیسیوں کے ہمدرد لگتے ہو' کوئی ایسی حرکت نہ کرو گے جس سے میری زندگی کسی نئی مصیبت میں گرفتار ہو اور یوں بھی اس پرائے قضیے میں ٹانگ اڑانے سے تمہیں کچھ حاصل نہ ہوگا' مردوں پر اعتبار کرنا میں کب کا ترک کر چکی ہوں پھر بھی ایک بار اور تم پر بھروسہ کرنے کو دل چاہتا ہے' تم یوں بھی محض اپنا تجسس مٹانے کو کچھ اور جاننا چاہتے ہو ورنہ میری کہانی جو تمہیں چاہیے تھی' وہ تو اس وقت پوری ہوئی ایک ذرا سی لغزش نے تمہیں بے چین کر دیا جو میں اس وقت کہہ دیتی کہ ہاں' احسن آیا کرتا ہے تو دی اینڈ ہو جاتا اس سب قضیے کا...'' کچھ دیر کے توقف میں وہ اٹھی اور جھروکے سے باہر دیکھتے ہوئے لحظوں میں چپ رہی اور پھر اسی پراسراریت سے بولی جیسے کوئی سازش بن رہی ہو۔

''ہوا یوں کہ میں اس رات اپنی زندگی میں سب سے زیادہ بے چین رہی' روتی جاتی اور خود کو یہ یقین دلاتی جاتی کہ اب میری زندگی سے عزت اور محبت یہ دونوں الفاظ ہمیشہ کے لیے نکال دیے گئے ہیں' زندگی کیا ہے اب تو شب دیجور ہے جس میں روشنی کا ایک نقطہ تک نہیں ہے، کیا مردوں کو بھی ان کی ایسی غلطیوں کی ایسی ہی سزائیں ملتی ہوں گی جیسی معاشرہ ایک عورت کو دیتا ہے۔ گناہ آلود مرد تو نہا دھو کر پھر سے پاکباز بن جاتا ہے مگر عورت حج کر کے بھی آ جائے تو اس کا طوائف ماضی اس کا پیچھا نہیں چھوڑتا اگر یہ آدمی مجھے اپنا لیتا جس کا نام احسن تھا تو دنیا میں ایک عورت بکنے سے بچ جاتی لیکن اس کی مجبوریاں تو جیسے مجھ سے بھی زیادہ تھیں اپنی ہر بدنصیبی مجھے فیصل کی دین لگتی تھی جو نہ جانے کہاں عیش کرتا ہوگا اور میں بازار میں بیچی جانے والی تھی' میرے اندر کی عورت بس آخری سانسیں لے رہی تھی کہ اس

کے بعد ہر ایرا غیرا میری عزت کے دروازے پر دستک دے گا اور میں ایک ایسا کھلونا بنا دی جاؤں گی جس سے جو جب تک دل چاہے' کھیلے اور پھر نخوت سے باہر پھینک دے' میری زندگی اب یکسر بدلنے والی تھی اور میں بلقیس ایک عزت دار گھرانے کی معصوم سی لڑکی اب ایک ایسی شے بننے جا رہی تھی جسے دیکھ کر لوگ تھو تھو کریں گے اور مجھ سے سو گز دور ہو کر چلیں گے' یوں سمجھو کہ میں اپنی موت کی تیاری کر رہی تھی... احسن اور ساجد نے دلشاد بائی کا نام لیا اور مجھے احسن نے بتایا کہ وہ صبح دس بجے تک آ جائے گی پھر مجھے اس کے ساتھ جانا ہے اور اس کے کہنے کے مطابق زندگی گزارنی ہے احسن مجھے اپنی جانب سے طفل تسلیاں بھی دیتا رہا کہ وہ مجھ سے ملنے آیا کرے گا... اور یوں وہ دونوں اپنے بستر میں جا کے سو گئے میں رات کے اس پہر جب خوب رو چکی اور اپنے آپ کو یقین دلا چکی کہ اب میری زندگی میں کبھی صبح نہ ہوگی تو جانے کیسے ایک عجیب وحشت نے میرے اندر سر اٹھایا اور مجھے لگا کہ یہ جو خیال میرے ذہن کے دروازے پر دستک دے رہا ہے' مجھے اس پر ہر صورت عمل کرنا چاہیے کہ اپنی عزت کو یہ آخری بھینٹ دے دینا مجھے دنیا کا سب سے ضروری کام معلوم ہوا جسے کر کے ہی میں اس آگ کے دریا میں اترنا چاہتی تھی' تم جانتے ہو کہ میں نے پہلے بھی اپنی عزت کے دو لٹیروں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا اب پھر سے میرے اندر وہ ہی خونی اور قاتل بلقیس سر اٹھا رہی تھی...''

''یعنی...؟؟؟'' سائرس کا رواں رواں کانپ اٹھا۔

وہ زیادہ سرگوشی سے بولی۔ ''ہاں' اب میں ان دونوں کی بھینٹ اپنی عزت کو دینا چاہتی تھی' میں یہ نہیں کہوں گی کہ اس مکروہ فعل کا میرے پاس یہ جواز ہے' وہ دونوں مجھے طوائف بنانے کے ذمہ دار تھے نہ ہی میں یہ کہوں گی کہ ان کو مار ڈالنے کی میری پاس یہ معقول وجہ تھی کہ معصوم اور بے سہارا لڑکیوں کو بہکا کے لاتے تھے اور انہیں بیچ کر ذلت کی پستیوں میں دھکیل کر خود اس پیسے سے موج مستیاں کرتے تھے اور یہ تو بڑا گھناؤنا کام ہے' ایسے موذیوں کو صفحۂ ہستی سے مٹا دینا بڑے ثواب کا کام تھا... ہرگز نہیں مجھے اس قسم کے کھوکھلے خیالات سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی' میں تو اب بس اپنی عزت کو ایک ایسی بھینٹ دینا چاہتی تھی جس سے میرے اندر اطمینان تیرنے والا تھا مجھے اگر کوئی خیال آیا تو بس یہ کہ ایسا نہ ہو کہ میں دلشاد بائی کے کوٹھے پر پہنچنے کے بجائے جیل کی چار دیواری میں قید کر دی جاؤں اور وہاں مفت کا مال بن کے جیل کے افسروں کا دل بہلانے کی ایسی فضول شے بن جاؤں جو طوائفوں سے بھی بدتر زندگیاں گزارتی ہیں، مگر میں نے اس خیال کی پرواہ نہ کی مجھے ہر حال میں اپنی عزت کو یہ بلیدان دینا تھا اور مجھ پر اس سمے ایک ایسا بھوت سوار ہوا کہ اور سب کچھ بھول گئی' اب مجھے ان دونوں کو مرتے ہوئے دیکھنا تھا۔''

''پھر...؟'' سائرس نے سانپ کی سی پھنکاری بھری۔

''میں نے اپنے آنسو صاف کیے اور وہاں کچھ ایسے ہتھیار تلاش کرنے لگی جن سے میں اپنی بے چینی کو سکون پہنچا سکوں کچن سے مجھے تیز دھار چھریاں مل گئیں بلکہ ڈھونڈنے سے ایک پستول بھی با آسانی مل گیا مگر پستول سے مارنا مجھے ٹھیک نہیں معلوم ہوا کہ اس سے جو شور پیدا ہونے والا تھا اس سے آس پاس کے سب لوگوں کو خبر ہو جاتی اور میں اب بھی احتیاط کا دامن ہاتھ سے چھوڑنا نہ چاہتی تھی اس لیے میں نے دو چھریاں ہاتھوں میں مضبوطی سے پکڑیں اور ان دونوں کے بستر پر جا چڑھی.. وہ بڑے مزے کی نیند سو رہے تھے اور یہ میری خوش قسمتی سے زیادہ ان کی موت کا اسی طرح لکھا ہوا ہونا تھا کہ وہ

ایک ہی بستر میں سو رہے تھے' ایک بات کا میں نے اس وقت بھی خیال رکھا اور وہ یہ کہ سیدھے ہاتھ سے ساجد پر وار کیا اور الٹے ہاتھ سے احسن پر... الٹے ہاتھ کا وار زیادہ فورس سے نہیں پڑتا اور زیادہ بھرپور بھی نہیں ہوتا یہ میں جانتی تھی اور ایسا میں نے دانستہ کیا کیوں کہ میں احسن کو اپنے سامنے تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی میں چاہتی کہ جب احسن کی سانسیں اس کا ساتھ چھوڑ رہی ہوں تو اس کا سر میری گود میں ہو میں پوری طرح ایک ایسی خونی اور سفاک قاتل بن چکی تھی کہ آج سوچتی ہوں تو مجھے خود حیرانی ہوتی ہے کہ یہ سب میں نے کیا اور پھر عین اپنے منصوبے کے مطابق میں نے ان دونوں کو ٹھکانے لگا دیا ایک اور ذہانت میں نے یہ بھی کی کہ دونوں کے منہ بھی کس کے باندھ دیے تھے احسن نے تڑپنا شروع کیا تو میرے اندر جانے کیسے کیسے جذبوں نے سر اٹھایا میں نے اسے چیر پھاڑ ڈالا اور سمجھو کہ پوری طرح برہنہ کر دیا اور جب اس کی جان نکل رہی تھی تو میں نے اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا اور جب وہ ٹھنڈا ہو گیا تو میں دیر تک اس کے پاس بیٹھی بین کرتی رہی جیسے بیوائیں کرتی ہیں اور جب خوب رو چکی تو اس کی لاش کو کپڑوں سے ڈھانک دیا...''

اتنا کہہ کر بلقیس ایسے ہانپنے لگی جیسے یہ قتل اس نے ابھی ابھی کیے ہوں سائرس کی بھی سانسیں چڑھی ہوئی تھیں اور بلقیس ہانپتے ہانپتے زمین پر بیٹھ گئی سائرس کا دل چاہا کہ وہ اسی وقت اٹھے اور وہاں سے بھاگ کھڑا ہو مگر اسے لگا کہ اس کے پیروں میں اتنی سکت نہیں رہ گئی تھی کہ وہ اپنے اس ارادے پر عمل کر سکتا..

*****

اس کے بعد بلقیس نے سائرس کو بتایا کہ صبح ہونے سے پہلے وہ پوری طرح دلشاد بائی کے ساتھ جانے کو تیار ہو کے بیٹھ گئی اور دلشاد بائی کے لیے آج تک یہ بات حیرانی کا باعث ہے کہ جب وہ احسن اور ساجد کے گھر پہنچی تو دروازہ بلقیس نے کھولا اور اس انجان عورت کو جو اسے خریدنے آئی تھی یہ منظر اور یہ سب کچھ اتنا اجنبی لگا کہ جس لڑکی کو وہ خریدنے آئی تھی خود اس نے دروازے پر کھڑے کھڑے اس سے کہا کہ وہ لڑکی میں ہوں جسے آپ کے ساتھ جانا ہے ساجد اور احسن اس وقت کہیں کسی کام سے گئے ہوئے ہیں کہہ گئے تھے میں آپ کے ساتھ چلی جاؤں وہ بعد میں آ کے آپ سے پیسے لے لیں گے. دلشاد بائی بھونچکی رہ گئیں کہ یہ کیا ماجرا ہے مگر اسے آم کھانے سے غرض تھی پیڑ گننے کی بیکار کی مصروفیت تو وہ خود اپنی زندگی میں کب کی ترک کر چکی تھی سو چپ چپاتے بلقیس کے ساتھ وہاں سے نکل آئی۔

اگلے کئی دن تک جب ساجد اور احسن اپنی رقم لینے نہیں آئے تو دلشاد بائی نے بلقیس سے کہا کہ میں جا کے دے آتی ہوں ورنہ وہ مجھے بے ایمان سمجھیں گے اور طوائف کے جہاں میں بے ایمانی کا کیا کام .. بے ایمانی تو وہاں ہوتی ہے جہاں ایمان ہوتے ہیں.. تب بلقیس نے اسے بڑے دھیرے سے بتایا کہ تم اخبار نہیں پڑھتیں ان دونوں کو تو کسی نے مار ڈالا اب وہاں جانے کا مطلب کسی ایسی مصیبت کو دعوت دینا ہے جس میں تم بھی اس قتل کی واردات میں ملوث کر لی جاؤ گی.. دلشاد نے دل پکڑ کر یہ خبر سنی اور سہم کر چپ ہو رہی البتہ اس نے بلقیس کو ڈرتے ڈرتے ایک بار نظر بھر کے دیکھا اور اس کے بعد ساری زندگی اس بات کا نہ کبھی تذکرہ کیا نہ ہی بلقیس سے کچھ پوچھا...

سائرس نے کوٹھے کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سوچا کہ آج ماہ لقا کی داستان سنتے ہوئے اسے بلقیس کا ذکر ماہ لقا سے کرنا چاہیے یا نہیں کرنا چاہیے...

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے۔)

فاطمہ بلگرامی

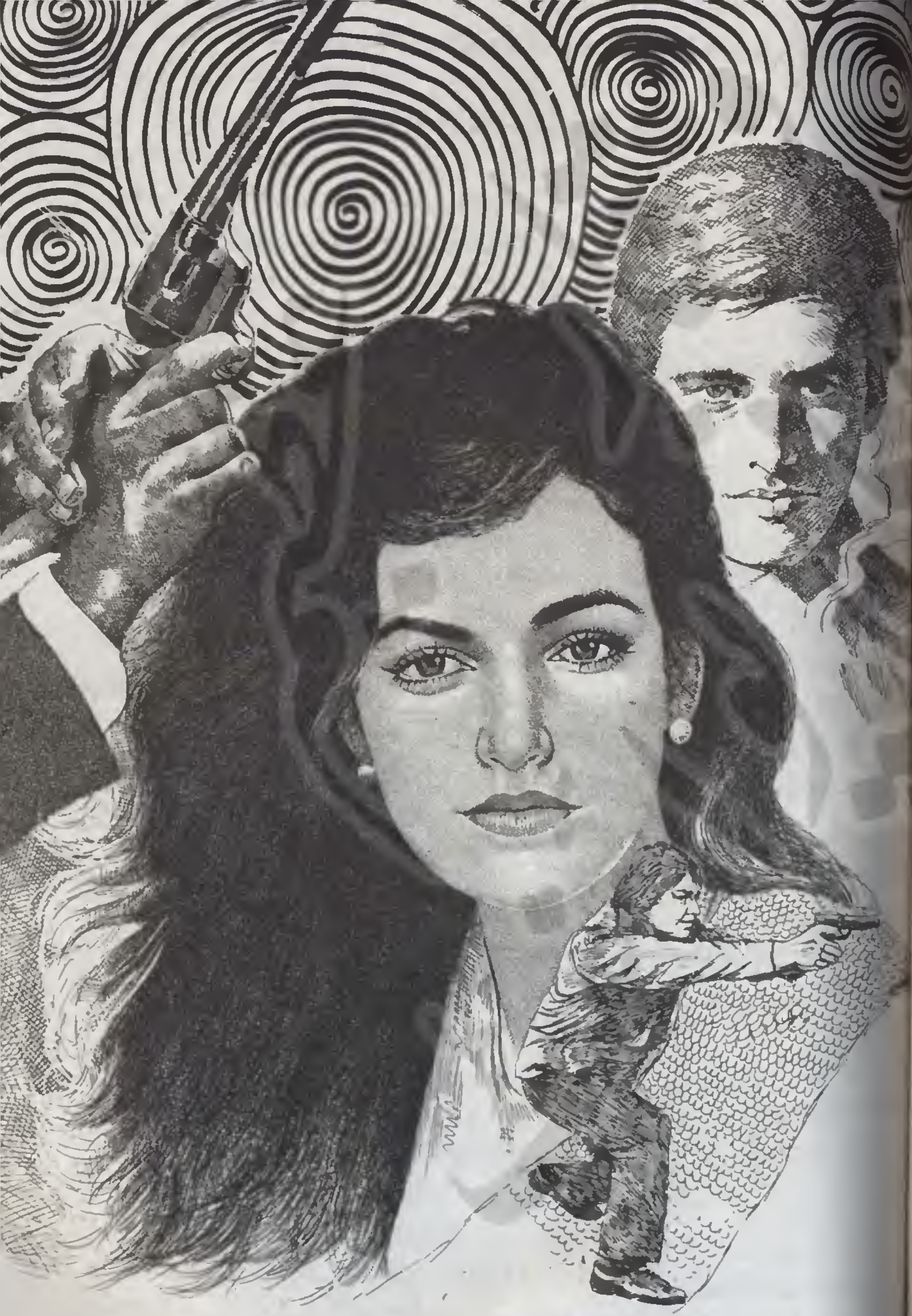
جن آنکھوں میں خواب بسے تھے

شاہد بخاری کا خیال

اب وہاں یادوں کا بکھرا ہوا ملبہ ہی تو ہے
جس جگہ عشق نے بنیاد مکاں رکھی تھی

سچی کہانیاں کی معروف سینئر لکھاری کا دلچسپ و تحیر خیز سلسلہ۔ قسط نمبر 9

خلاصہ: داؤد عرف ڈیوڈ کی ماں میری ایک انگریز عورت تھی جس نے ایک ایشیائی افتخار الملک نامی شخص سے شادی کی تھی...... اس رشتے کی پاداش میں میری کے ارب پتی باپ لارڈ ڈلفی نے اسے جائیداد سے عاق کر دیا تھا۔ اسی دوران حالات نے اسے اپنے شوہر سے جدا کر دیا...... اس کے بعد میری نے اپنے بیٹے کے ساتھ لندن میں بہت مشکل زندگی گزاری اور مر گئی۔ لارڈ ڈلفی کی موت کے بعد یہ وصیت سامنے آئی کہ اس نے اپنی تمام جائیداد کا وارث میری کے بیٹے ڈیوڈ کو قرار دیا ہے لیکن داؤد عرف ڈیوڈ یہ جائیداد قبول کرنے سے انکار کر دیتا ہے جب کہ لارڈ ڈلفی کی اس جائیداد پر ایک یہودی گروپ کی بھی نظر ہے۔ داؤد کی اس گروپ سے ایک جھڑپ بھی ہوتی ہے۔ لندن میں ہی بہن بھائی جیسے رشتوں سے محروم داؤد کی ایک پاکستانی فیملی سے ملاقات ہوتی ہے اور وہ اس فیملی کی ایک لڑکی کو بہن بنا لیتا ہے لیکن وہ لڑکی داؤد کو بھائی نہیں سمجھتی اور ایک ایسا قدم اٹھاتی ہے کہ داؤد کی عزت داؤ پر لگ جاتی ہے۔ حالات کا مارا داؤد پاکستان اپنے باپ افتخار الملک کے پاس جانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ جہاں وہ شادی کے بعد ایک بیوی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا ہے۔ جہاز میں سفر کے دوران اس کی ملاقات فاطمہ نامی ایک نہایت موڈ لڑکی سے ہوتی ہے جو اسے پاکستان میں ملنے کے لیے وزیٹنگ کارڈ بھی دیتی ہے۔ داؤد پاکستان آتا ہے تو اسے باپ ہی نہیں اپنی سوتیلی ماں اور اس کی بیٹی فہمیدہ سے بہت پیار، محبت اور شفقت ملتی ہے۔ داؤد اپنی دولت کے ذریعے ان لوگوں کی زندگی میں آسانی اور آسائش لانے کا فیصلہ کرتا ہے۔ پاکستان میں داؤد کی اپنے باپ سے جڑے رشتے داروں سے ملاقات ہوتی ہے۔ انہی میں ایک بہت خوبصورت ذہین اور حاضر جواب لڑکی عنبر بھی ہے جو داؤد کو اچھی لگتی ہے...... اور ایک رشتے دار رابیل اختر سے بھی ملاقات ہوتی ہے جس نے پولیس آفیسر ہونے کے باوجود جیل کاٹی ہے اور وہ منشیات کا عادی بھی رہ چکا ہے۔ پاکستان میں داؤد کو اس لڑکی راحیلہ کا ایک طویل خط ملتا ہے، جسے داؤد نے بہن سمجھا ہوتا ہے لیکن وہ داؤد کو محبوب سمجھ کر اُس کی بدنامی کا باعث بن گئی تھی۔ یہ خط راحیلہ نے مرنے سے پہلے تحریر کیا ہے۔ داؤد جہاں ایک طرف اس بات سے خوش ہے کہ عنبر اس کی ذات میں دلچسپی لے رہی ہے، وہاں اس کے لیے یہ بات بھی حیرانی اور پریشانی کا باعث ہے کہ موم تے آخر فہمیدہ سے جو اس کی بہن ہے اس کے رشتے کے بارے میں سوچا بھی کیسے...... داؤد کی ملاقات رابیل سے ہوتی ہے جو اسے اپنی کہانی سناتا ہے اور یہ کہانی کردار در کردار آگے بڑھتی ہے، رابیل خود اپنے بارے میں بتاتا ہے کہ اُسے ایک سازش کے ذریعے ہیروئن کا عادی بنایا گیا...... اور پولیس کی نوکری سے نکلوایا ہی نہیں، اُس سے مجرمانہ عمل کرانے کی بھی کوشش کی۔ یہاں



تک کہ وہ جیل پہنچ گیا......اور پھر جیل سے فرار ہوتا ہے، داؤد وغیرہ کی انٹریا آمد ہوتی ہے، یہاں مختلف اوقات میں رابیل داؤد کو اپنی کہانی سناتا رہتا ہے۔: **اور اب آگے پڑھیے:**

''جس طرح ہر انسان کے دل کی فنگر پرنٹ' رائٹنگ وغیرہ جدا ہوتی ہے۔ اسی طرح ہر انسان کے دل کی دھڑکنوں کے درمیان بھی فرق ہوتا ہے' رفتار میں بھی فرق ہوتا ہے۔ کمپیوٹر اس فرق کو فوراً پکڑ لیتا ہے۔ اگر وہی شخص ہے جس کے کوائف فیڈ کیے گئے ہیں وہ آتا ہے۔ تبھی سبز بلب جلتا ہے اور خودکار دروازہ کھل جاتا ہے۔ وہ دروازہ میٹنگ ہال میں کھلتا ہے لیکن یہ راستہ عام ممبر کے لئے ہے۔ میرے لئے دوسرا راستہ ہے۔''

''دوسرا راستہ کدھر ہے؟''

''ہوٹل میں چار ٹوائلٹ ہیں۔ ہر ٹوائلٹ میں دو حصے بنے ہیں۔ پہلے حصے میں باتھ ہے اور دوسرے حصے میں یورینل' ٹوائلٹ نمبر ٹو کے باتھ ٹب کے نیچے ایک ایسا ٹائلز ہے جسے فرش سے الگ کیا جاسکتا ہے۔ ٹائلز کے نیچے گڑھے میں ہاتھ ڈال کے ایک سوئچ کو اوپر کی طرف کھینچنے سے ٹوائلٹ کا سیکنڈ پارٹ یعنی یورینل والا حصہ کسی قسم کی آواز پیدا کیے بغیر لفٹ کی طرف چھ چھ فٹ اوپر اٹھ جاتا ہے۔ نیچے سیڑھیاں ہیں۔ ٹائلز کے اس کی جگہ فٹ کر دیجئے اور سیڑھیوں کے ذریعے نیچے اترتے چلے جائیے۔ جیسے ہی نچلی سیڑھی پر قدم پڑتا ہے یورینلو الا حصہ اپنی جگہ آ جاتا ہے اور اوپر باتھ روم کے دروازے کا لاک بھی کھل جاتا ہے۔''

''سیڑھیاں کہاں پہنچ کر ختم ہوتی ہیں؟''

''میٹنگ ہال کی پشت پر ایک پرائیویٹ کمرا ہے۔ اس کے بعد ایک اور کمرا ہے جو دراصل ہال کا ایک حصہ ہے۔ اسے میں نے خاص طور پر فائر پروف شیشے کی مدد سے بنوایا ہے۔ اس شیشے کی دوسری جانب عام ممبر پچھلی طرف اور خاص ممبر سامنے کی قطار میں بیٹھے رہتے ہیں۔''

''یہ عام اور خاص کا مطلب کیا ہوا؟''

''سنڈیکیٹ کئی اکائی میں بٹا ہوا ہے۔ سب سے نچلی اکائی میں فیلڈ ورکر ہیں۔ اس سے اوپر سکیورٹی دستہ تیسرے نمبر پر کمانڈو دستہ۔ اس دستے میں خونخوار قسم کے لڑاکے ہیں۔ ان سے اوپر خونی دستہ ہے۔ یہ دستہ جب ایکشن میں آتا ہے تو صرف قتل کرتا ہے۔ کمانڈو دستے کے چیف کا نام مشتاق ہے۔ خونی دستے کا چیف رانا ہے۔ ان سب دستوں کے اوپر ہے کمیٹی۔''

''کمیٹی یہ کیا بلا ہے؟'' کمال نے حیرت بھرے لہجے میں پوچھا۔

''سنڈیکیٹ کی بنیاد میں چھوٹے چھوٹے جرائم پیشہ گروپ کو ملا کر رکھی تھی۔ یہ سب الگ الگ منشیات کا دھندہ کرتے تھے۔ کل ملا کر بیس گروپ تھے۔ ہر گروپ کا سربراہ اب کمیٹی کا ممبر ہے۔ ان میں سے ایک اشفاق بھی ہے جو آج کل عثمانی کے بہت قریب ہے۔''

''کمیٹی کا کام کیا ہے؟'' میں نے سوال کیا۔

''کوئی بھی قدم اٹھانے سے پہلے میٹنگ ہوتی ہے۔ کمیٹی لائحہ عمل تیار کرتی ہے۔ اس پلان پر میں مہر ثبت میں کیا کرتا تھا۔''

''یعنی اگر کمیٹی آپ کو شیر خان مان لیتی ہے تو باقی لوگ بھی مان لیں گے؟''

''یقیناً''۔

آصفہ سر جھکا کر سوچنے لگی پھر اس نے کہا۔ ''ذرا قلم دیجئے گا۔''

سہیل نے قلم دے دیا۔ وہیں رکھے پیڈ پر اس نے کچھ لکھا اور پھر اسے ان کی طرف بڑھا کر بولی۔ ''دیکھیے تو آپ اس خط کو سمجھ سکتے ہیں یا نہیں؟''

سہیل نے خط لے کر دھیان سے دیکھا پھر مایوسی بھرے لہجے میں بولے'' مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا ہے صرف حرف پر اعداد نظر آرہے ہیں۔''

کاغذ واپس لے کر اس نے ہماری طرف بڑھایا اور بولی۔ ''تم سب بھی کوشش کرو شاید سمجھ جاؤ۔''

ہم سب خط پر جھک گئے۔ خط کا مضمون تقریباً وہی تھا جو سہیل نے عثمانی کو لکھ کر اپنے ہیڈ کوارٹر میں چھوڑ دیا تھا۔ البتہ اس خط میں آصفہ نے ہر لفظ پر حرف تہجی کے اعتبار سے نمبر ڈالے ہوئے تھے۔ جس کی وجہ سے خط ایک معمہ بن گیا تھا۔

باری باری سب نے خط پڑھا لیکن کسی کے چہرے سے ظاہر نہیں ہو رہا تھا کہ وہ سمجھ چکے ہیں۔ جب کہ میں نے خط میں چھپے پیغام کو سمجھ لیا تھا۔

صادقہ نے جھنجلا کر کہا۔ ''بھئی پہیلیاں بجھانا چھوڑ دو اور بتاؤ کہ کیا لکھا ہے۔''

''کل بتاؤں گی۔'' آصفہ مسکراتے ہوئے کھڑی ہوگئی۔

''کل؟'' نجمہ بڑبڑائی۔

''ہاں کل جب میں مکمل لائحہ عمل تیار کرلوں گی۔'' وہ کمرے سے باہر نکل گئی ہم سب بھی اٹھ کر اپنے اپنے کمرے میں چلے آئے۔

گھڑی نے رات کے دو بجنے کا گجر بجایا۔ دور گھنٹا گھر سے آتی ہوئی آواز سن کر میں اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر نکلا۔ کمال کے کمرے میں جا کر اسے اٹھایا پھر سرگوشی میں ہدایت دی کہ وہ آصفہ کے کمرے میں پہنچے۔ اس کے بعد نجمہ کے کمرے میں پہنچا۔ شاید وہ جاگ رہی تھی۔ آہٹ سنتے ہی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ میں نے فوراً ہی ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ دیا پھر دبی آواز میں بولا تم شگفتہ اور صادقہ کو لے کر آصفہ کے کمرے میں پہنچو۔ خبردار ہلکی سی بھی آہٹ نہ ہو۔ ہم اس ملاقات کو سہیل سے خفیہ رکھنا چاہتے ہیں۔''

وہ اٹھ کر ان کے کمرے کی جانب بڑھی اور میں سہیل کے کمرے کی جانب چل پڑا۔ دروازے سے جھانک کر دیکھا۔ وہ بستر پر سر جھکائے بیٹھا کچھ سوچ رہا تھا۔

میں نے آہستہ سے بغیر آواز پیدا کئے باہر سے کنڈی لگا دی اور آصفہ کے کمرے میں پہنچ گیا۔ وہ کروٹ کے بل لیٹی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی دوپٹا درست کرتے ہوئے اٹھ بیٹھی اور بولی۔ ''آؤ!''

''شش، شی!'' میں نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش رہنے کا اشارہ دیا۔ ''آہستہ؟''

''کیوں؟'' اس نے مسکرا کر پوچھا۔

''ہماری آواز ٹیپ ہوسکتی ہے۔''

''نہیں ہوگی۔ میں نے کنکشن کاٹ دیا ہے۔ مائک اس گلدستے میں تھا۔''

تب تک سب پہنچ چکے تھے۔ انھیں بیٹھنے کا اشارہ کرتے ہوئے آصفہ نزدیک پہنچ گئی۔

''مجھے خوشی ہے رابی کہ تو بھی ٹیپ سے ہوشیار تھا۔''

''مجھے تبھی شک ہوگیا تھا جب تم نے سہیل سے کہا تھا کہ تم نے ہماری بات چیت ٹیپ پر سن لی ہوگی۔ اسی لیے میں اپنے کمرے میں پہنچتے ہی مائک کی تلاش میں لگ گیا تھا۔ میری کوشش بار آور ثابت ہوئی تھی۔ ڈسٹ

بن میں مائک چھپا ہوا تھا پھر میں نے نجمہ، صادقہ اور کمال کے کمرے کا بھی مائک نکال لیا تھا۔

''بھئی مجھے نیند آرہی ہے۔ فٹافٹ بتاؤ اس میٹنگ کا مقصد کیا ہے؟'' صادقہ نے جماہی لی۔

''جب آصفہ نے وقت دیا ہے تو کچھ سوچ کر ہی دیا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''کب وقت دیا تھا؟ کمال نے اکتائے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

''میاں تم کیسے صحافی ہو الفاظ کی گہرائی نہیں سمجھتے؟'' میں نے طنز کیا تھا۔

''کون بے وقوف صحافی ہے۔ میں تو پیٹ کا جہنم بھرنے کے لئے اس لائن میں آیا تھا۔ اگر اس لائن میں بھی روٹی نہ ملتی تو بھٹے بھونتا۔'' کمال کا لہجہ تلملایا ہوا تھا۔

''شام کو ہی آصفہ نے خط لکھنے کے دوران میں پیغام دے دیا تھا۔''

''تم نے کیسے سمجھ لیا؟''

بچوں ایسی باتیں نہ کرو۔ اتنا سیدھا پیغام تھا یقیناً ایسا پیغام لکھنے کا خیال سہیل والے خط سے آیا ہوگا۔ میں نے ان حرف پر جو اعداد تھے انھیں ترتیب سے جمع کیا تو پیغام تھا آج رات دو بجے میرے کمرے میں ملو۔''

''واقعی تمہارا ذہن میرے دماغ تک پہنچ رہا ہے۔'' آصفہ نے مسکرا دیا۔

''آخر تمہارا شوہر ہوں، بھلے ہی سہاگ رات نہ منائی ہو۔''

''چپل کھینچ ماروں گی۔'' آصفہ کا پیار جتانا بھی خطرناک تھا۔ اگر اس کے تراشیدہ لبوں پر مسکراہٹ نہ رہتی تو میں دبک جاتا مگر مسکراتے دیکھ کر بولا۔ ''کیا یہ غلط ہے؟''

''بکواس نہیں، غور سے سنو! مجھے سہیل پر شک بھی ہے اور نہیں بھی۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔'' صادقہ بولی۔ ''اس پر شک بھی ہے اور نہیں بھی؟''

''نہیں! اس لیے کہ شک کی کوئی ایسی وجہ سامنے نہیں ہے جسے پیش کرسکوں۔ اس کی کہانی سچی اور ٹھوس اس لیے لگتی ہے کہ اس نے ٹھوس ثبوت بھی پیش کیے ہیں لیکن پتا نہیں کیوں میرا دل بھی کہہ رہا ہے کہ کہیں نہ کہیں ہم سے بھول ہو رہی ہے۔ وہ غلطی کیا ہے ابھی اس کی جانب عقل نے اشارہ نہیں کیا ہے۔ اس لیے پوری طرح اسے عقل کی کسوٹی پر جانچے بغیر اندھا اعتماد نہیں کرنا چاہیے۔''

اس کی بات غلط نہیں تھی۔ سب کے ساتھ میں بھی سوچ میں ڈوب گیا۔ یکایک میرے دماغ میں ایک نیا پہلو ابھرا تو میں نے کہا۔ ''سہیل نے سب سے دھماکے دار بات یہ بتائی ہے کہ شیر خان عثمانی ہے اگر ہم یہ پتا لگا لیں کہ واقعی وہ شیر خان ہے تو سہیل سچا ہے اور اگر شیر خان کوئی دوسرا ہے تو سمجھ لو سہیل ایک بہت بڑا شاطر اور سازشی ہے۔''

''بالکل صحیح لائن پر ہو۔'' آصفہ نے تعریفی نظروں سے مجھے دیکھا۔

''تو شیر خان کی اصلیت معلوم کرنے کے لئے کون سی چال چلی جائے۔'' کمال نے کہا۔

''میں سوچ چکی ہوں۔'' آصفہ کی مسکراہٹ گہری ہوگئی۔

''ہم بھی سنیں۔''

رابیل کہانی کے اہم موڑ پر پہنچا تھا کہ بیرے نے آکر کہا۔ ''صاحب اب آپ لوگ اپنے کمرے میں چلے جائیں، لائٹ بند کی جائے گی۔''

یہ لوجنگ کے بیرے کا حکم تھا ہمیں ماننا پڑا۔ ہم اٹھ کر کمرے میں آ گئے۔ اپنے کمرے میں پہنچتے ہی میں بستر پر ڈھ سا گیا۔ رابیل بھی اپنے بستر پر جا لیٹا۔ یکا یک کمرے کی تمام لائٹس بجھ گئیں اور خود ہی نائٹ بلب جل اٹھے۔ میں سمجھ گیا کہ سسٹم کہیں باہر ہے۔ بل میں کمی کے لیے ایسا انتظام کیا گیا ہوگا۔ لائٹ بند ہونے کے بعد نیند خود بخود آنکھوں میں اتر آئی۔ پھر احساس ہی نہیں ہوا کہ کب میں سو گیا۔

صبح آنکھ کھلی تو خالہ جاگ رہی تھیں۔ شاید انھیں نیند ہی نہیں آئی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ وہ بولیں۔ ''دیکھو اسے کہتے ہیں شہر، کتنا سویرے سب جاگ جاتے ہیں۔ ایک کراچی کے لوگ ہیں کہ دس بجے سے پہلے اٹھتے ہی نہیں۔''

ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہوتے ہوتے آٹھ بج گئے۔ نو بجے ہم نے ہوٹل چھوڑ دیا۔ سائیکل رکشا پر سوار ہو کر ہم اسٹیشن کے لیے نکل پڑے۔ رکشا جب شہر کے بیچوں بیچ بنے بڑے سے میدان کے سامنے سے گزرنے لگا تو خالہ کا چرخہ پھر سے چل پڑا کہ یہ وہی میدان ہے جہاں مسلم لیگ کا جلسہ ہوا تھا۔ اسی میدان میں کانگریس نے جلسہ کیا تھا۔ اسی کے برابر وہ ہال ہے جہاں پہلی بار قیام پاکستان کی ضرورت پر آواز بلند کی گئی تھی۔ یہیں عبدالرب نشتر نے جلسہ گاہ میں کسی شہید مسلمان کی کٹی ہوئی انگلی دکھا کر مسلمانوں کی حمیت کو للکارا تھا۔

جیسے تیسے ہم ان کی تاریخ دانی سنتے سنتے اسٹیشن پر پہنچے۔ سامان رکشے سے اتارا اور دو قلیوں کے سروں پر اسے لاد کر پلیٹ فارم پر آئے۔ ہر طرف شور و غل، طرح طرح کے لوگوں کا ازدحام۔ کان پڑی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ میں نے ایک کونے کی جانب اشارہ کیا۔ قلی نے سامان اتار کر رکھ دیا۔ ہم سب وہیں پہ چادر بچھا کر بیٹھ گئے۔

برابر میں ہی برقعے میں ملبوس ایک عورت اور دو جوان لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ وہ ہمیں دیکھ کر کھسر پھسر کر رہی تھیں۔ ان کے ساتھ ایک سولہ سترہ سال کا لڑکا بھی تھا جو کبھی ان کے لیے پانی لاتا اور کبھی بھنے چنے تو کبھی انناس کا پورا ٹکڑا۔ وقت گزرتا رہا اور بارہ بج گئے مگر ٹرین کو نہ آنا تھا نہ آئی۔ ہم نے اب تک دوپہر کا کھانا نہیں کھایا تھا۔ بھوک مجھے بھی لگ رہی تھی پر ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ سب کو اکیلے سارے سامان کے ساتھ چھوڑ کر اسٹیشن کی دکان سے کچھ لے کر آؤں۔ ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ وہ خاتون کھسک کر خالہ کے قریب آ گئی اور انتہائی اپنائیت سے بولی۔ ''بہن آپ کہاں جائیں گی؟''

وہ تو جیسے کھل اٹھیں اور خوش ہوتے ہوئے بولیں۔ ''بہن میں پاکستان سے آئی ہوں اور بھاگل پور جانا ہے۔ وہاں ایک قصبہ ہے سبور وہیں میرے بھائی کے بچے اور بہت سے رشتے دار رہتے ہیں۔''

''اچھا۔ اچھا بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔ میں بھی بھاگل پور جا رہی ہوں۔'' وہ نہایت گرم جوشی سے خالہ کا ہاتھ دباتی ہوئی بولی۔ ''یہ آپ کی بیٹی ہیں؟'' انہوں نے سلمٰی کی طرف اشارہ کیا۔

''نہیں، نہیں میری بہو ہے، لیکن میں اسے سگی بیٹیوں جیسا چاہتی ہوں۔'' انہوں نے پیار سے سلمٰی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

وہ پھر بولیں۔ ''آپ نے کچھ کھایا پیا یا یونہی بیٹھی ہیں۔''

تب خالہ نے بتایا ''دل تو چاہتا ہے کہ کچھ کھاؤں پر بہو کو اکیلے چھوڑ کر کیسے ہٹوں۔ یہ میرا بھانجا لندن سے آیا ہے۔ یہ بھی پہلی بار ہندوستان آیا ہے۔ انہیں تو ہندوستان کی تہذیب کا بھی پتا نہیں اسی لیے میں باہر نہیں بھیج رہی ہوں۔''

وہ ہنس پڑی۔ ''تمہارا یہ مسئلہ میں حل کر دیتی ہوں۔'' پھر انہوں نے لڑکے کو آواز دی۔ ''حمید اے حمید ادھر آؤ بیٹا۔''

وہ لڑکا قریب آ گیا۔ ''بیٹا ذرا انہیں کھانے پینے کا سامان تو لا دو۔''

میں نے اسے سو کا نوٹ دیتے ہوئے کہا۔ ''جو کچھ ملے لے آؤ ہاں! چائے ضرور لانا۔ سر دکھ رہا ہے۔''

لڑکے نے نوٹ میرے ہاتھ سے لیا اور دس منٹ کے اندر ہی پوری، کچوری اور مٹی کے کلڑھ میں چائے لے کر آ گیا اور نوے روپے میرے ہاتھ پر رکھ دیے۔ میں حیران رہ گیا۔ صرف دس روپے میں اتنی چیزیں؟

''لو بہو!'' خالہ چہکیں۔ ''دیکھا یہاں کتنی فراوانی ہے۔ ہر چیز سستی ہے۔ صرف دس روپے میں کئی بندے پیٹ بھر کر کھانا کھا لیں۔''

سلمٰی حیرت سے پندرہ پوریوں، کچوریوں اور چائے کو دیکھنے لگی۔

''لو کھاؤ!'' خالہ نے تمام چیزیں اس کی جانب کھسکائیں اور بصد اصرار ان کی دونوں بیٹیوں اور خاتون کو بھی شریک کر لیا۔

خاتون کا نام زلیخا تھا۔ ان کی بیٹیوں کا نام کلثوم اور انعم تھا۔ یہ لڑکا حمید ان کی بہن کا بیٹا تھا۔ ان کی بہن پٹنہ میں رہتی تھیں۔ حمید انہیں اسٹیشن چھوڑنے آیا تھا۔

ہم سب کھانے کے درمیان میں خوش گپیاں بھی کر رہے تھے۔ زلیخا بیگم ایک زندہ دل عورت تھیں۔ ان کے شوہر کا انتقال ہو چکا تھا۔ بڑی عسرت بھری زندگی گزار رہی تھیں۔ پاکستان سے بڑی عقیدت رکھتی تھیں۔ کرید کرید کر پاکستان کے بارے میں پوچھ رہی تھیں جب کہ میں ہندوستان کے بارے میں سننا چاہتا تھا۔ یہاں کی تبدیلیوں سے آگاہ ہونا چاہتا تھا۔ ان کی لڑکیاں بھی سلمٰی سے پاکستان کے بارے میں معلومات لے رہی تھیں۔ سلمٰی اکتا کر بولی۔ ''دور کے ڈھول سہانے۔ وہاں اتنی مہنگائی ہے کہ آپ اندازہ نہیں کر سکتیں۔''

''ہاں اور کیا۔'' خالہ نے بات اچک لی ''سو کا نوٹ موا ایک کے برابر ہے۔ جیسے نکالو فوراً خرچ۔ اتنے بداخلاق لوگ کہ توبہ! پڑوسی کو پڑوسی کی خبر نہیں بھلے ہی کوئی مار کر ڈال جائے لیکن وہ مدد کو نہ آئیں گے۔ ایسے متکبر اور بد دماغ لوگ ہیں کہ اللہ کی پناہ!'' انہوں نے کانوں کو ہاتھ لگایا۔

وہ سب انہیں حیرت سے دیکھنے لگیں۔ گویا ان کو خالہ کی بات کا یقین نہ آیا ہو۔

''بہن! اچھے برے لوگ ہر جگہ ہیں۔ یہاں خود ہندوستان میں مسلمانوں کو کون سا سکھ ہے؟ ہمارا تو جینا دوبھر ہے۔ اس قدر تعصب ہے کہ ہم اپنی جانوں سے بے زار ہیں۔ جوان لڑکیوں کا ساتھ ہے۔ رات رات بھر جاگتے گزرتی ہے۔'' وہ یاس بھرے لہجے میں بولیں۔ ''ہر علاقے، ہر گاؤں، قصبوں میں یہی حالت ہے۔ ہماری بد قسمتی کہ ہم پاکستان نہ جا سکے۔ کاش! ہمارے بزرگوں کو عقل ہوتی تو آج ہم بھی اسلامی ملک پاکستان میں جا بیٹھے ہوتے۔ مسلمانوں کو ڈھنگ کی نوکری ملتی ہے نہ کوئی عزت! تف ہے ایسی زندگی پر۔'' وہ سخت دل گرفتہ ہو گئی تھیں۔

خالہ اندر ہی اندر تپ گئیں۔ ''ناشکری نہ کریں۔ کم از کم اپنے رشتے داروں کے درمیان تو رہ رہی ہیں۔ ہمیں دیکھیں! ہم اپنوں کو دیکھنے کو بھی ترس گئے ہیں۔ بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ تک نہیں پڑھ سکتے۔''

اسی وقت حمید آ گیا۔ "خالہ! دانا پور فاسٹ پسنجر کا کچھ پتا نہیں کب آئے آپ کو انتظار کرنا پڑے گا۔"

"لو اور مصیبت!" زلیخا بڑبڑائی۔ میں بھی کوفت محسوس کرنے لگا تھا۔

ایک بجے گاڑی آئی۔ ہم لوگ جلدی جلدی سوار ہوئے۔ حمید ہمیں سوار کر کے اپنے گھر چلا گیا۔ زلیخا کی نظریں دور تک اس کی بلائیں لیتی رہیں۔

ہمیں بڑی اچھی جگہ ملی تھی۔ بالکل کھڑکی کے پاس، زلیخا کے سامنے خالہ بیٹھ گئیں اور اس کی دونوں بیٹیاں دوسری کھڑکی کے پاس۔ گاڑی پٹنہ اسٹیشن سے روانہ ہوئی۔ سلمٰی بولی۔ "خالہ کیا آپ پاکستان جانے سے پہلے اسی راستے آتی جاتی تھیں؟"

وہ خوش ہو کر بولیں۔ "ہاں بیٹی جیسے جیسے گاڑی چلے گی میں تمہیں یہاں کے علاقوں سے آگاہ کرتی جاؤں گی۔"

زلیخا ہنس کر بولی۔ "ارے اتنی پرانی باتیں کیا آپ کو اب بھی یاد ہیں؟"

خالہ افسردہ ہو گئیں۔ "لو بھلا، میری روح تو یہیں پر تھی۔ خالی جسم کا پنجر پاکستان میں تھا۔ جب دل ہی مر جائے تو خالی پنجر کس کام کا۔" گاڑی آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگی۔

میں نے زلیخا کی وجہ سے الٹی طرف کی سیٹ منتخب کی تھی۔ میرے ساتھ رابیل آ گیا تھا۔ ہم آمنے سامنے کی سیٹ پر بیٹھے کہ رابیل نے کہا "اس طرف بیٹھنے کا ایک فائدہ یہ ہے کہ خالہ کی بک بک سے نجات رہے گی۔"

اس کے انداز کلام پر میں مسکرا اٹھا اور بولا "ایسا کرو تم اپنی بک بک شروع کر دو۔"

رابیل بھی ہنس پڑا اس نے کہا "تو سنیں"

"ہم سب رات کے اندھیرے میں آصفہ کے کمرے میں میٹنگ کر رہے تھے۔ آصفہ نے سب کو اپنی طرف دیکھتے پا کر کہا "سہیل نے عہدہ واپس پانے کے لئے ہماری مدد مانگی ہے۔ میں عہدے کی واپسی کے لئے ایک منصوبہ بتاؤں گی۔ اس منصوبے کی ایک خوبی یہ ہوگی کہ اسے عہدہ بعد میں ملے گا پہلے ہمیں پتا چلے گا کہ شیر خان کون ہے۔"

"وہ منصوبہ بھی بتا دو۔" شگفتہ بولی۔

"صبح بتا دوں گی۔ اب تم لوگ جا کر سو جاؤ اور تم......" اس نے میری جانب اشارہ کیا۔ "واپسی کے وقت سہیل انکل کا دروازہ کھول دینا۔"

☆......☆

صبح فریج سے کھانے کی اشیا نکال کر سہیل نے دی تھیں۔ آصفہ اور شگفتہ نے مل کر جلدی جلدی ناشتہ تیار کر لیا۔ ناشتے کی ٹیبل پر ہم سب ساتھ بیٹھے تھے کہ سہیل نے پوچھا۔ "کیوں تم لوگوں نے کچھ سوچا؟"

"جی ہاں!" آصفہ نے کہا۔ "اپنی اسکیم بتانے سے پہلے میں چند سوال کروں گی۔"

"پوچھو۔"

"آپ اس بات سے باخبر ہیں کہ نجمہ آواز کی نقل میں سب سے آگے ہے کیا اس کے ذریعے آپ اپنے گروہ پر قبضہ نہیں کر سکتے؟"

"صرف شیر خان کی آواز سے کام نہیں چل سکتا۔ شیر خان کا میک اپ کر کے میں مائک کے سامنے کھڑا ہوتا

تھا۔ شیشے کی دوسری جانب بیٹھے تمام ممبران کی نگاہیں میرا احاطہ کیے رہتی ہیں۔ میں اگر نجمہ کے سر پر سفید بالوں کا وگ لگا دوں، سفید داڑھی مونچھیں بھی لگا دوں اور سفید سوٹ میں اسے مائک کے سامنے کھڑا کر دوں پھر بھی ممبران کو یقین نہیں آئے گا۔ اس لیے نہیں آئے گا کہ نجمہ کے قد کاٹھ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔"

آصفہ نے سر جھکا لیا اور سوچنے لگی۔ کچھ دیر بعد اس نے سوال کیا۔ "اشفاق کیسا آدمی ہے؟ یعنی وہ سنڈیکیٹ کا وفادار ہے یا شیر خان کا؟"

"سنڈیکیٹ کا۔"

"اتنی جلدی نہیں، اچھی طرح سوچ لیجئے۔ اسی سوال پر میرے منصوبے کی بنیاد ہے۔ آپ ہی کے مطابق وہ عثمانی کے کافی قریب ہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سنڈیکیٹ کے بجائے عثمانی کا وفادار ہو۔"

"میں اشفاق کو عثمانی سے بہتر جانتا ہوں۔" سہیل نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "وہ اس وقت عثمانی کے لئے جان دے سکتا ہے جب تک اسے یہ یقین ہے کہ عثمانی ہی شیر خان ہے۔ ٹھیک اسی طرح وہ عثمانی کی جان لے لے گا جس وقت یہ یقین ہو جائے گا کہ وہ شیر خان نہیں ہے۔"

"آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا عثمانی نے آپ کے خط کے بارے میں اشفاق سے بات کی ہوگی؟"

"اس بارے میں یقین سے کچھ نہیں کہہ سکتا۔"

"کیوں؟"

"عثمانی بہت چالاک ہے۔ وہ مقابل کو اتنا ہی بتاتا ہے جتنا بتانے میں اسے فائدہ ہے، اگر خط کے بارے میں اشفاق کو بتانے سے اسے اپنا کوئی فائدہ نظر آئے گا تو ضرور بتائے گا۔"

"آپ کے پاس اس کا فون نمبر ہے؟"

"ہے مگر فائدہ؟"

"میں چاہتی ہوں کہ اسے گڑبڑ کا احساس ہو جائے۔"

"لیکن یہ بھلا کیسے ممکن ہے؟"

"ناممکن کو ممکن میں بتاؤں گی آپ نمبر دیجئے۔" سہیل نے نمبر دے دیا۔

"نجمہ تم شیر خان کی ایسی بھاری آواز نکالو کہ سہیل انکل کو یقین آ جائے۔" آصفہ نے کہا۔

"میں شیر خان بول رہا ہوں۔" نجمہ نے بھاری آواز میں کہا۔

"کچھ اور بھاری آواز میں قبائلی لہجہ ہونا چاہیے۔" سہیل نے کہا۔

دو تین بار کے بعد سہیل نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ آصفہ نے پیغام لکھ کر اس کے سامنے بڑھا دیا۔ نجمہ نے نمبر ملایا پھر بولی۔ "اشفاق میں شیر خان بول رہا ہوں۔"

"آپ سر...... کوئی خاص بات ہے کیا؟"

"اسی وقت ہیڈ کوارٹر پہنچو، مجھے خیر خواہ کا خط ملا ہے۔"

"خیر خواہ کا خط!" اشفاق کی حیرت بھری آواز سنائی دی۔ "مگر اس خط کے بارے میں آپ بتا چکے ہیں سر!"

"میں پہلے نہیں دوسرے خط کی بات کر رہا ہوں فوراً ہیڈ کوارٹر پہنچو۔"

''میں پہنچ رہا ہوں سر!'' اس نے سلسلہ منقطع کر دیا۔
''وقت کم ہے' تم اس کے گھر پہنچ جاؤ۔ سہیل انکل پہنچا دیں گے۔'' آصفہ نے مجھ سے کہا۔
''لیکن پولیس میری تلاش میں ہوگی۔ جیل سے فرار کی خبر ہر تھانے میں پہنچا دی گئی ہوگی۔''
''ایک منٹ سے بھی کم وقت میں اپنے سر کو کمال سے منڈ والو۔'' پھر آصفہ نے سہیل کی جانب مڑ کر کہا۔
''انکل قینچی اور سیفٹی ریزر ہو تو دیجئے۔''
''ابھی لایا۔'' کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔ کچھ دیر بعد لوٹے تو ان کے ہاتھ میں کپڑے کاٹنے والی قینچی تھی اور ایک سیفٹی ریزر۔
''واش روم میں لے جا کر اپنا کام شروع کر دو۔'' آصفہ نے کمال کو حکم دیا اور پھر جب میں باہر نکلا تو میرا سر منڈا ہوا تھا۔
''انکل اپنی نقلی داڑھی اسے لگا دیں اور چشمہ دے دیں۔''
آصفہ کے کہنے پر انھوں نے میرے چہرے پر داڑھی چپکا دی۔ میں نے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھا۔ چشمہ لگانے کے بعد میرا حلیہ مکمل طور پر بدل گیا تھا۔ میرے دوست بھی دیکھ کر نہ پہچان پاتے۔ اتنی خوبصورتی سے داڑھی چپکائی گئی تھی کہ کسی رخ سے بھی نقلی نہیں لگ رہی تھی۔
''چلو بھئی دیر ہو رہی ہے۔'' سہیل انکل نے باہر کی جانب قدم بڑھا دیے۔
سہیل انکل کی ڈرائیونگ قابل تعریف تھی۔ کچھ ہی دیر میں ہم اشفاق کے گھر پہنچ گئے۔
''ابھی تک وہ نکلا نہیں ہے۔'' سہیل نے ایک بنگلے کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ اس کی کار کھڑی ہے۔''
سہیل کی کار سے نکل کر میں اشفاق کی کار کے نزدیک پہنچا۔ اتفاق تھا کہ کار لاک نہیں تھی۔ میں نے پچھلا دروازہ کھولا اور پائیدان پر لیٹ گیا۔ کچھ دیر بعد کار کا دروازہ پھر کھلا۔ اگنیشن میں چابی گھومی۔ انجن غرایا اور پھر کار چل پڑی کچھ دیر بعد میں اٹھ کر بیٹھ گیا پھر پستول کی نال کو اس کی گردن پر رکھ کر غرایا ''کار موڑ لو۔''
''کو...... کون ہو تم؟'' وہ ہکلایا۔
''تمہاری موت! جدھر میں کہہ رہا ہوں ادھر موڑو۔'' میرے کڑے لہجے نے اسے مرعوب کر دیا۔ وہ میرا حکم ماننے پر مجبور ہو گیا۔ اس نے میرے حکم پر کار موڑ لی۔ آہستہ آہستہ ہم شہر سے باہر نکل آئے۔ سنسان سڑک دیکھتے ہی میں نے کہا۔ ''کار روک لو۔''
کار رکتے ہی میں نے سرعت سے پستول کے دستے کو اس کی گدی پر مارا۔ وہ اوق کی آواز نکالتا ہوا لڑھک گیا۔ میں اچک کر اگلی سیٹ پر آ گیا اور ڈرائیونگ سیٹ سے اسے ہٹا کر کار کا رخ شہر کی جانب موڑ لیا۔
سہیل کے بنگلے پر پہنچا تو اس کی کار کھڑی تھی۔ میں اشفاق کو کندھے پر لاد کر اندر لے گیا وہ سب میرے منتظر تھے۔ میں نے اشفاق کو کرسی پر بٹھا کر رسی سے باندھ دیا۔ نجمہ دوڑ کر پانی سے بھرا جگ لے آئی۔ میں نے اشفاق کے چہرے پر پانی کے چھینٹے مارے وہ کچھ دیر کی کوشش کے بعد ہوش میں آیا۔ اس نے آنکھیں کھولتے ہی سوال کیا۔ ''تم لوگ کون ہو؟''
''ہم وہی ہیں جس کی خاطر سنڈیکیٹ نے جیل کی دیواریں توڑنا چاہی تھیں۔''

''تم لوگ غلط ہاتھوں میں پڑ گئے ہو۔ تمہارے لئے سنڈیکیٹ کے پاس ایک ایسا منصوبہ ہے جو تمہیں راتوں رات جرائم کی دنیا کی بلندی پر پہنچا دے گا۔ یاد رکھو سنڈیکیٹ اگر مدد نہ دیتی تو تم سب کبھی بھی جیل سے فرار نہ ہو سکتے۔''
آصفہ نے نزدیک پہنچ کر نرم لہجے میں پوچھا۔ ''سنڈیکیٹ نے ہمارے لیے کیسا منصوبہ سوچ رکھا ہے؟''
اشفاق نے افیون کی کھیتی سے شروع ہو کر مافیا کا صفایا کرنے تک کا منصوبہ سمجھا دیا۔
اس کی بات ختم ہوتے ہی آصفہ نے مڑ کر مجھ سے کہا۔ ''یہ تو وہی گا رہا ہے جو خیر خواہ گاتا رہا ہے۔ اس لیے ایکشن نمبر ٹو اپناؤ۔''
میں نے سرعت سے اپنا رخ سہیل کی جانب پھیرا اور بولا۔ ''انکل ہم اشفاق سے کچھ خفیہ بات پوچھنا چاہتے ہیں۔ پلیز آپ باہر چلے جائیں۔''
''آں!'' ان کے چہرے پر حیرت چھا گئی۔ تب تک کمال ان کی پشت پر پہنچ چکا تھا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ ''سوری انکل، ہم مجبور ہیں۔''
میرا اشارہ پاتے ہی کمال نے ان کی گردن پر کھڑی ہتھیلی کا وار کیا وہ چکرا کر گر پڑے۔
''ہاں اب تم بھی شروع ہو جاؤ۔''
''میں...... میں کیا بتاؤں۔'' اشفاق نے باری باری سب کا چہرہ دیکھا۔
سچ سچ بتاؤ تم کس کے آدمی ہو؟'' کمال نے کڑک کر پوچھا۔
اشفاق کی نگاہیں اِدھر سے اُدھر چکرا رہی تھیں وہ ایک ایک کا چہرہ دیکھ رہا تھا شاید وہ اندازہ لگانے کی کوشش کر رہا تھا کہ اس کا لائحہ عمل کیا ہونا چاہیے۔ تبھی صادقہ جنگلی بلی کی طرح اچھلی اور ایک پیر پر کھڑی ہو کر آدھا دائرہ بناتے ہوئے گھومی۔ دوسرا پیر خط مستقیم کی طرح سیدھا تھا جو پوری قوت سے اشفاق کے چہرے سے ٹکرایا تھا وہ ''ہا'' کی آواز نکالتا ہوا الٹ گیا تھا اور اس کے منہ سے ''ہائے'' بھی پورا نکل نہیں پایا تھا۔ کرسی بھی اس کے ساتھ گری تھی۔ یقیناً اس کے سر میں شدید چوٹ لگی تھی اور آنکھوں کے آگے اندھیرا بھی پھیل گیا ہوگا۔ میں نے آگے بڑھ کر اسے اٹھایا اور پھر بولا۔ ''بیٹے ہم بڑے خطرناک لوگ ہیں۔ فٹافٹ بتاتے چلے جاؤ ورنہ تمہاری خیر نہیں۔''
اس کا نچلا ہونٹ پھٹ گیا تھا' خون کی بوندیں ٹپکنے لگی تھیں۔ چہرے پر کرب کے آثار ابھر آئے تھے۔ وہ خونخوار نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں نے جو کچھ کیا ہے اسی حرامزادے کے کہنے پر کیا ہے۔'' اس کا اشارہ سہیل انکل کی طرف تھا جو ہنوز بے ہوش پڑے تھے۔
''یعنی تم قبول کرتے ہو کہ اس کے آدمی ہو؟'' آصفہ نے انگلی سے سہیل کی جانب اشارہ کیا۔
''ہاں! اس نے مجھے ٹیپ شدہ آواز سنائی تھی کہ اسی آواز میں فون آئے گا۔ فون کرنے والا ہیڈ کوارٹر پہنچنے کے لئے کہے گا۔ میں احترام بھرے لہجے میں پوچھوں کہ کیا کوئی خاص بات ہے سر۔ تب دوسری جانب والا کسی خط کے بارے میں ذکر کرے گا۔ اس طرح اس نے مجھے ایک ایک بات سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ کیا کہے گا۔ اور جواب میں مجھے کیا کہنا ہے۔''
''یعنی تم نے جو کیا اس کے حکم پر کیا؟'' نجمہ نے اس کی بات کاٹی۔
''جی ہاں اس نے پانچ ہزار روپے بطور معاوضہ ادا کرنے کی بات کی تھی۔'' اشفاق کے خون آلود ہونٹوں پر

مسکراہٹ دوڑ گئی۔
''یہ حکم اس نے تمہیں کب دیا تھا؟''
''کل رات۔''
اس کے جواب نے ہم سب کو چونکا دیا۔ ہم بھونچکا سارہ گئے تھے۔ صرف آصفہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔
''کمینے جھوٹ بولتا ہے۔'' صادقہ نے کرارا ہاتھ رسید کیا۔
''نہیں صادقہ' مار پیٹ کی ضرورت نہیں ہے۔' ہمارا پہلا تیر نشانے پر لگا ہے۔ شک بے بنیاد تھا اور یہ بھی ثابت ہو گیا ہے کہ یہ وہی ہے جو انکل نے اس کے بارے میں کہا ہے۔ عثمانی کا رازدار۔''
''نہیں!'' اشفاق چیخ پڑا۔ ''میں اس کا ساتھی ہوں۔'' اس نے سہیل کی جانب اشارہ کیا۔
''اگر اس کے ساتھی ہوتے تو یہ کبھی نہ کہتے کہ ہدایت تمہیں کل رات ملی ہے۔ اس بے چارے کو تو کل رات خود بھی نہیں پتا تھا کہ ہم اسے کیا ہدایت دینے والے ہیں۔'' آصفہ نے رک کر سب کی جانب دیکھا اور مڑ کر اشفاق سے بولی۔ ''ویسے تمہارے دماغ کی داد دینی پڑے گی اشفاق۔ ہمارے تیوروں سے تم نے بھانپ لیا کہ ابھی تک ہم نے انکل کی باتوں پر یقین نہیں کیا ہے۔ موقع کا فائدہ اٹھا کر تم نے فوراً اس کا ساتھی ہونا قبول کر لیا۔ اس کی وجہ بھی یہی ہوگی کہ ہمارا شک یقین میں بدل جائے۔''
''تب تو ہم نے انکل کے ساتھ بہت برا برتاؤ کیا ہے۔'' شگفتہ بولی۔
''ہم معافی مانگ لیں گے۔ تسلی بھی تو ضروری تھی۔'' آصفہ نے سمجھایا۔
''اب کیا کیا جائے؟'' کمال نے پوچھا۔
''انتظار!'' صادقہ نے مسکرا کر کہا۔
ہم سب انکل کے ہوش میں آنے کا انتظار کرنے لگے۔ شگفتہ پانی کے چھینٹے مار کر انکل کو ہوش میں لائی۔ پھر میں نے ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے حقیقت بتا دی۔ انکل نے اس حرکت کو برا نہیں مانا۔ ہم سب کے دل کی آواز آصفہ کی زبان سے ادا ہوئی۔ ''اب ہم بغیر شک و شبہ کے آپ کا ساتھ دیں گے۔''
انکل کے چہرے پر اطمینان کی جھلک نظر آئی۔ لیکن وہ کچھ بولے نہیں۔ آہستہ آہستہ اشفاق کے پاس پہنچے اور نرم لہجے میں بولے۔ ''حالات کی ڈور میں باندھ کر ہم تمہیں ضرور لائے ہیں اشفاق' مگر ہم تمہارے دشمن نہیں ہیں۔ تم تو میرے بچے ہو۔ ایسے بچے جن پر میں فخر کر سکتا ہوں۔''
''تمھاری آواز کا جادو مجھ پر نہیں چلے گا۔ مجھے چیف نے سب کچھ بتا دیا ہے۔'' اشفاق غرایا۔
''اس نے جو کچھ بھی بتایا ہے وہ جھوٹ ہے بیٹے۔''
اشفاق نے طنز کیا۔ ''اور جو تم کہہ رہے ہو وہ سچ ہے؟''
''ہاں یہ سچ ہے۔ ہم تمہیں سچائی سے آگاہ کرنے کے لئے ہی لائے ہیں۔ جسے تم شیر خان سمجھ رہے ہو وہ نقلی ہے۔''
''اوہ! تو اصلی شیر خان آپ ہیں؟'' اشفاق طنز کرنے سے باز نہ آیا۔
''سچ یہی ہے۔''

آگے کا احوال جاننے کے لیے
آئندہ شمارہ میں ملاحظہ فرمائیں

خلیل جبار

انجام یہی ہونا تھا

حمیرا راحت کا خیال

اذنِ کلام بخش کے گویائی چھین لی
کھڑکی کو کھول کر میری بینائی چھین لی

جیل کی سلاخوں کے پیچھے زندگی بھگتی ایک بدبخت عورت کی عبرت انگیز کہانی

میں کچن میں کھانا تیار کر رہی تھی کہ موبائل کی گھنٹی بج اٹھی۔ میں لپک کر کمرے میں گئی اور موبائل فون اٹھا کر دیکھا' اختر کی کال تھی۔ میں نے دھڑکتے دل سے بٹن دبایا۔

''کیا بات ہے شکیلہ صاحبہ' بہت مصروف ہو؟'' اس کی آواز سماعت سے ٹکرائی۔

''تمہیں کیسے معلوم کہ میں مصروف ہوں؟'' میں نے پوچھا۔

''کال دیر سے اٹینڈ کرنا ہی مصروفیت کو ظاہر کر دیتا ہے۔'' اختر نے ہنستے ہوئے کہا۔

''میں کچن میں کھانا بنا رہی تھی اور موبائل کمرے میں تھا اس لیے موبائل تک پہنچنے میں دیر ہوئی۔'' میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''ارے بھئی' تم اتنی سنجیدہ کیوں ہو جاتی ہو؟ ٹھیک ہے' ہوگئی دیر بات کرنے میں' اس میں وضاحت دینے کی ضرورت کیا ہے؟'' اختر نے زوردار قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''خیریت ہے نا' اس وقت کیسے یاد کر لیا؟'' میں نے کہا۔

''خیریت ہی نہیں ہے' جب سے تمہیں دیکھا ہے' میری راتوں کی نیند اڑ گئی ہے' دن کا چین چھن گیا ہے' ہر وقت تم سے ملنے کو دل تڑپتا ہے' دل چاہتا ہے میرے پر لگ جائیں اور اڑ کر تمہارے پاس آ جاؤں۔'' اختر نے کہا۔

''کہیں تم شاعری تو نہیں کرنے لگے؟'' میں نے اسے چھیڑا۔

''کیوں' کیا شاعر لوگ اچھے نہیں ہوتے؟''

''میں نے کب کہا' شاعر برے ہوتے ہیں؟ بس لاپروا قسم کے لوگ ہوتے ہیں' کام دھندے کی انہیں پروا نہیں ہوتی' ہر وقت اپنے محبوب کی تعریف میں غزل کہتے رہتے ہیں۔ بچے چاہے بھوک سے بلک رہے ہوں' گھر میں کھانے کو دانہ نہ ہو لیکن ان کے سر پر جوں نہیں رینگتی۔ ہر وقت شاعری میں ڈوبے رہتے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''کچھ میری طرح باذوق بھی ہوتے ہیں۔'' اختر چہکتے ہوئے بولا۔

''وہ کون ہوتے ہیں؟''

''وہی شاعر جو شراب میں ڈوبے ہوتے ہیں۔'' اختر نے کہا۔

''اچھا' کیا تم شراب بھی پیتے ہو؟'' میں حیرانی سے بولی۔

''شراب پینے میں کیا برائی ہے؟ آج کل تو اس کا فیشن ہے' تھوڑی بہت پی لی جائے تو اس میں کوئی برائی نہیں......''

''مجھے شرابی پسند نہیں ہے۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''میری توبہ' آج کے بعد پھر کبھی شراب کو ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا۔'' اختر نے گھبراتے ہوئے کہا۔

''کیا واقعی تم میرے کہنے پر شراب چھوڑ دو گے؟'' میں نے پوچھا۔

''ہاں' ہاں' تمہاری خاطر میں وہ سب کچھ چھوڑ سکتا ہوں جو تمہیں پسند نہ ہو۔'' اختر نے کہا۔

''اختر' مجھے تم سے یہی امید تھی۔ مجھے شرابیوں سے سخت نفرت ہے' تم شراب نوشی ترک کر دو گے تو ہماری یہ دوستی چلتی رہے گی۔'' میں نے کہا۔

''ویسے ایک بات بتاؤں کہ میں شراب نہیں پیتا' تم سے مذاق کر رہا تھا۔''

''ہاں' مجھے بھی پتا ہے' تمہاری مذاق کرنے کی عادت ہے۔'' میں مسکرائی۔

''شکر ہے' تمہیں یہ بات پتا ہے ورنہ میں سمجھ رہا تھا کہ موصوفہ مجھ سے ناراض ہو کر بات چیت بند کر دیں گی۔'' اختر نے کہا۔

''اچھا بتاؤ' تم نے اس وقت کیسے فون کیا ہے؟ مجھے کھانا بھی تیار کرنا ہے۔''

''میں نے سوچا تھا' یہ بات تمہیں ابھی نہیں بتاؤں گا لیکن اتنی اچھی خبر ہے کہ مجھ سے برداشت نہیں ہو سکا اور تمہیں بتانے کو بے چین ہو گیا۔'' اختر نے کہا۔

''کیا کوئی خاص خبر ہے؟''

''ہاں' میں کراچی آ رہا ہوں کام کرنے' ابا جان مان گئے ہیں۔ اب ہماری ملاقات میں کوئی رکاوٹ نہیں رہے گی۔'' اختر نے کہا۔

''کراچی میں تم کیا کام کرو گے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ وہ واقعی کراچی آ رہا ہے۔

''بھئی' پہلے میں نے سوچا تھا کہ چاہے کیسی بھی مزدوری مل جائے' میں بغیر شرم کیے کر لوں گا لیکن دیکھو قسمت کہ میرے بچپن کا دوست جواد مل گیا' وہ کراچی کی ایک کمپنی میں سیلز مین کی حیثیت سے کام کر رہا ہے۔ اسے جب میری کراچی میں کام کرنے کی خواہش کا علم ہوا تو کمپنی میں میری نوکری کی بات کر لی اور تمہارے علاقے میں ہی سیلز مین کی حیثیت سے میری ڈیوٹی لگی ہے۔ اب میں جب چاہوں گا' تم سے ملنے چلا آؤں گا۔'' اختر نے چہکتے ہوئے بتایا۔

''جب چاہے نہیں' جب میں بلاؤں کیونکہ گھر میں میرا شوہر کلیم بھی ہوتا ہے۔'' میں نے کہا۔

''اوہ سوری' واقعی میں تو بھول ہی گیا تھا کہ تمہارا ایک عدد شوہر بھی ہے؟'' اختر نے جھینپتے ہوئے کہا۔

اختر سے میری موبائل دوستی کو ایک سال ہو گیا تھا۔ شروع میں ہم دونوں بڑے محتاط انداز میں بات کیا کرتے تھے کیونکہ ہم ایک دوسرے کے لیے اجنبی تھے۔ ہم دونوں مختلف موضوعات پر طویل گفتگو کرتے تھے۔ یہ ٹیلی فونک دوستی کی وجہ بھی میرے شوہر کی مصروفیت تھی۔ میرا شوہر کلیم موٹر سائیکل کا مستری تھا۔ وہ صبح 9 بجے گھر سے نکلتا تھا اور رات گئے ہی لوٹتا تھا۔ میری شادی کو پانچ سال ہو گئے تھے اور میں اولاد جیسی نعمت سے محروم تھی۔ گھر میں اکیلا رہنے کی عادت نہیں تھی۔ شوہر کے جانے پر گھر کاٹ کھانے کو دوڑتا تھا۔ کتابوں اور ٹی وی سے دل لگانے کی کوشش بہت کرتی تھی لیکن میں کامیاب نہیں ہوتی تھی۔ ایسے میں ایک دن اختر کی کال میرے موبائل پر آ گئی۔ نا چاہتے ہوئے بھی اس سے دوستی کر بیٹھی۔ اختر سے چھ ماہ تک باتوں کا سلسلہ چلتا رہا لیکن کبھی ملاقات نہیں کی۔ ایک دن اختر کا فون آیا تو اس نے ملاقات کی خواہش کا اظہار کر دیا۔

''شکیلہ' ہماری دوستی کو چھ ماہ ہو چکے ہیں لیکن ہم نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہم ایک بار مل لیں؟''

''ارے ہاں' کبھی ہمارا دھیان اس طرف گیا ہی نہیں' بن دیکھے ہی دوستی چل رہی ہے۔'' میں نے کہا۔

''پھر تمہارا کیا خیال ہے ملاقات کے بارے میں؟'' اس نے پوچھا۔

''تم جب بھی کراچی آؤ' مجھ سے موبائل پر بات کر لینا پھر ملاقات کا وقت طے کر لیں گے۔'' میں نے کہا تھا۔

''اس اتوار کو میرے دوست اسماعیل کی شادی ہے اور برات کراچی آئے گی۔ میں شادی سے فارغ ہو کر تم سے رابطہ کر لوں گا۔''

''ٹھیک ہے' تم......''

اتوار کے دن میں تیار تھی اور میں نے سوچ لیا تھا کہ اختر سے اپنی سہیلی رضوانہ کے گھر پر ملاقات کر لوں گی۔ رضوانہ نے ہماری ملاقات کرانے کی غرض سے اپنے بچوں کو صبح ہی صبح نانا کے گھر بھیج دیا تھا' یوں

ہم دونوں کی ملاقات کا منصوبہ تیار تھا۔ اتوار کی صبح اختر کی کال آ گئی اور میں نے رضوانہ کے گھر کا پتا بتا دیا۔ میں وقت مقررہ پر گھر کو تالا لگا کر رضوانہ کے گھر پہنچ گئی۔ کچھ دیر میں اختر کی کال آ گئی۔

''میں گھر کے باہر کھڑا ہوں۔''

''باہر کیوں کھڑے ہو' اندر آ جاؤ۔'' میں نے کہا۔

''کہیں جوتے نہ پڑوا دینا کہ بغیر اجازت کیسے گھر میں داخل ہو گئے؟'' اختر نے کہا۔

''ارے' ایسی کوئی بات نہیں۔ اچھا' میں خود دروازے پر آتی ہوں۔'' میں دروازے پر گئی جہاں ایک خوبرو نوجوان کھڑا تھا شکل و صورت بھی ایسی تھی کہ دیکھتے ہی دل آ جائے۔ مجھے دیکھ کر وہ مسکرایا۔

''باہر کیوں کھڑے ہو' اندر آ جاؤ۔'' میں نے شرماتے ہوئے کہا۔

''اندر آنے کو راستہ ملے گا تو ضرور آؤں گا۔'' وہ مسکرایا۔

''اوہ سوری......'' میں ایک طرف ہٹ گئی اور وہ گھر میں داخل ہو گیا۔ منصوبے کے تحت رضوانہ نے ایک کمرے میں ہمیں بٹھا کر باہر سے کنڈی لگا دی۔ دروازے پر کنڈی لگنے سے اختر گھبراتے ہوئے بولا۔

''خ...... خ...... خیریت ہے نا' کوئی خطرناک ارادہ تو نہیں؟''

''تمہارا کیا خیال ہے' اس وقت تمہارے ساتھ کیا ہو سکتا ہے؟'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اگر یہ گاؤں ہوتا تو ہمیں کاروکاری کیا جا سکتا تھا لیکن یہ شہر ہے لہٰذا کچھ اور گڑبڑ ہو سکتی ہے۔ پولیس کے حوالے کیا جا سکتا ہے' کوئی جھوٹا مقدمہ بھی ہو سکتا ہے۔'' اختر نے کہا۔

''فی الحال میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ ہمیں تنہائی میں ملاقات کا موقع فراہم کیا گیا ہے اور بس......'' میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

''پھر ٹھیک ہے۔'' اختر بھی جواباً ہنس دیا۔

اختر اور میں ایک گھنٹے تک باتیں کرتے رہے۔ اختر نے مجھ سے کسی قسم کی کوئی بدتمیزی نہیں کی تھی اور نہ تنہائی کا کوئی فائدہ اٹھایا۔ وہ تہذیب کے دائرے میں باتیں کرتا رہا۔

اچانک اس کی نظر گھڑی پر پڑی تو وہ چونکا۔

''اوہ...... مجھے یہاں آئے ہوئے ایک گھنٹہ ہو گیا' میں اب چلتا ہوں' شادی میں میرا دوست انتظار کر رہا ہوگا۔'' اختر نے کہا۔

''بس اتنی دیر کے لیے آئے تھے؟''

''ہم پھر ملتے رہیں گے۔'' اختر نے کہا۔

''ٹھیک ہے جیسے تمہاری مرضی۔'' میں نے کہا۔

میرے دروازہ بجانے پر رضوانہ نے کنڈی کھول دی اور ہم کمرے سے باہر آ گئے۔ رضوانہ بھی حیران تھی کہ بہت جلدی ہماری ملاقات ختم ہو گئی۔ اختر کے جانے پر اس سے نہ رہا گیا اور وہ پوچھ بیٹھی۔

''کیا ہوا' اتنی جلدی اختر چلا گیا؟''

''وہ دراصل شادی میں آیا ہے' وہاں سے کچھ وقت کے لیے آیا تھا۔'' میں نے کہا۔

''اچھا' اچھا' چلو پھر کبھی فرصت میں جی بھر کر ملاقات کر لینا۔'' رضوانہ نے معنی خیز انداز میں کہا اور میں جھینپ گئی۔

اس ملاقات کے بعد اختر کی باتوں سے سنجیدگی رخصت ہو گئی اور وہ تکلف ایک طرف رکھ کر بات کرنے لگا تھا۔ وہ ہر طرح کی بات مجھ سے کر لیتا تھا۔ میں حیرانی سے اس کی باتیں سنتی رہ جاتی تھی۔ کراچی میں کام کرنے کی بات پر میں حیران تھی کہ وہ میری خاطر اپنا گاؤں' گھر بار چھوڑ کر کراچی آ رہا تھا۔ کبھی کبھی مجھے خود پر بھی حیرت ہوتی تھی کہ میں شادی شدہ ہو کر بھی ایک غیر محرم سے دوستی کر بیٹھی ہوں جو کہ گناہ ہے لیکن نا جانے مجھے کیا ہو گیا تھا' میں

جانتے بوجھتے یہ گناہ کر رہی تھی اور انجام سے بے خبر میں برائی کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔

اختر نے کراچی میں کام کرنا شروع کر دیا تھا اور میرے شوہر کی غیر موجودگی میں گھر آنے لگا تھا۔ اسے میرے شوہر کے گھر آنے جانے کے اوقات معلوم ہو گئے تھے۔ وہ بہت محتاط تھا۔ شوہر کی غیر موجودگی میں اسے بلانے کے لیے ہم نے کچھ اشارے مخصوص کر لیے تھے مثلاً اگر وہ گلی میں ہوتا تو گیلری میں بنیان لٹکا دیتی تھی' اس کا مطلب ہوتا تھا' راستہ صاف ہے۔ اگر گیلری میں قمیص ہوتی تو اس کا مطلب تھا کہ شوہر گھر میں موجود ہے اور گیلری میں کچھ بھی نہیں ہونے کا مطلب تھا کہ موبائل پر کال کر کے ملاقات کا وقت طے کرنا ہے۔ یہ اشارے اختر نے بتائے تھے جو مجھے پسند آئے تھے۔ ان اشاروں کی مدد سے میں مطمئن تھی کہ میرا یہ راز راز ہی رہے گا۔

کچھ عرصہ یہ سلسلہ چلتا رہا پھر اختر نے بھی اپنا رنگ دکھانا شروع کر دیا۔ تنہائی میں اس کی چھیڑ خانیاں بڑھنے لگی تھیں۔ اس کا یہ عمل میرے نزدیک اچھا نہیں تھا۔ میرے دل میں کئی بار آئی کہ اسے بری طرح جھڑک دوں کہ آئندہ ایسی حرکتیں نہ کرے لیکن نا جانے مجھے اس پر ترس آ جاتا کہ وہ میری خاطر اپنا گھر بار چھوڑ کر کراچی آ گیا تھا اس لیے نہ چاہتے ہوئے بھی اسے یہ حرکتیں کرنے سے روک نہ سکی۔ دن بدن اختر گستاخ ہوتا جا رہا تھا۔ اب وہ ایسی حرکتیں کرنے لگا تھا جس کا حق صرف ایک شوہر کو حاصل ہوتا ہے۔ ایک دن جب اس نے مجھے اپنی بانہوں میں جکڑا تو میں نے ایک جھٹکے سے خود کو اس سے آزاد کرا لیا۔

''اختر...... یہ کیا حرکت ہے؟'' میں نے غصے سے اسے دیکھا۔ ''ہم دوست ضرور ہیں' اس کا مطلب یہ نہیں کہ تم ہر حد کراس کر جاؤ۔'' میرے اس طرح جھڑکنے پر اس کا چہرہ اتر گیا' شاید اس کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ میں اسے اس طرح سے جھڑک دوں گی پھر وہ چند منٹ بیٹھ کر چلا گیا۔ میں بھی اس وقت شدید غصے میں تھی اس لیے میں نے اسے روکنے کی کوشش نہیں کی تھی پھر ایک ہفتے تک وہ نہیں آیا اور نہ ہی مجھ سے موبائل پر رابطہ کیا۔ میرا غصہ بھی ٹھنڈا ہو چکا تھا اور مجھے اختر کی یاد بھی آ رہی تھی اس لیے میں نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اختر کو کال کر دی۔

''ہیلو......'' اختر نے کال ریسیو کرتے ہوئے کہا۔

''کیا بات ہے اختر' تم کیوں نہیں آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''تم نے اس دن مجھے اس بری طرح سے جھڑکا کہ ہمت نہیں ہو رہی ہے تمہارا سامنا کرنے کی۔'' اختر نے کہا۔

''ہاں' مجھے بہت غصہ آ گیا تھا۔ اس طرح سے تمہیں نہیں جھڑکنا چاہیے تھا۔'' میں نے نرم لہجے میں کہا۔

''غلطی میری تھی' مجھے اس طرح نہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں دوستی میں بہت آگے نکل گیا تھا۔ میں کوشش کروں گا کہ تم سے زیادہ ملاقات نہ کروں تا کہ پھر ایسا نہ ہو۔'' اختر نے کہا۔

''ارے بھئی' میں یہ کب کہہ رہی ہوں کہ تم مجھ سے نہ ملا کرو' بس ذرا خود پر قابو رکھا کرو پھر تم کب آ رہے ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''دیکھتا ہوں......'' اختر نے کہا۔

''تم ابھی تک ناراض ہو؟ دیکھو' میں نے بات کرنے میں پہل کی ہے' کیا اب بھی ناراضگی ختم نہیں کرو گے؟'' میں نے کہا۔

میں سمجھ گئی تھی' اس دن کی بات کو اختر نے دل پر لے لیا تھا اس لیے وہ ملنے سے کترا رہا ہے۔ دو دن اور گزر گئے' وہ نہیں آیا۔ اس کے گھر نہ آنے سے

مجھے سخت تشویش ہو رہی تھی۔ مجھے اختر سے محبت ہو گئی تھی اور میں کسی قیمت پر اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی' وہ میری تنہائی کا ساتھی تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے اختر کو کال ملائی۔

''کیسی ہو شکیلہ' خیریت ہے نا؟'' اختر نے کہا۔

''ہاں' میں خیریت سے ہوں' تم اپنی سناؤ؟'' میں نے پوچھا۔

''میں بالکل ٹھیک ہوں' مجھے کیا ہونا ہے۔'' اختر کی افسردہ سی آواز آئی۔

''اختر' غصہ ختم کر دو اور فوراً میرے پاس چلے آؤ۔ میں تمہارا انتظار کر رہی ہوں۔'' میں نے کہا۔

''میں اس وقت نہیں آ سکتا۔ اس وقت فیلڈ میں ہوں' کل آؤں گا۔'' اختر نے کہا۔

''ٹھیک ہے' یاد سے آ جانا' میں تمہارا انتظار کروں گی۔'' میں نے کہا۔

''ہاں' ہاں' تم فکر نہ کرو۔''

دوسرے دن مجھے شدت سے اختر کا انتظار تھا اور وہ وعدے کے مطابق آ گیا۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل کھل اٹھا لیکن اس کا چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔

''اختر' کیا ابھی تک مجھ سے ناراض ہو؟'' میں نے کہا۔

''نہیں' نہیں' میں کیوں ناراض ہوں گا' بس ایسے ہی میں سوچ رہا ہوں کہ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔'' اختر نے کہا۔

''میں نے اس واقعہ کو بھلا دیا ہے' تم بھی بھلا دو' آؤ ہم پھر ایک نئے جذبے سے دوستی کا آغاز کرتے ہیں۔'' میں نے اپنا ہاتھ اختر کی طرف بڑھایا۔ اس نے جھجکتے ہوئے میرا ہاتھ تھام لیا اور ہم مسکرانے لگے' یوں اختر کی آمد دوبارہ شروع ہو گئی تھی۔ چند دن تک وہ محتاط رہا لیکن پھر اس نے اپنی بری حرکتیں شروع کر دیں۔ میں اسے ڈانٹنا چاہتی تھی لیکن ڈانٹ نہیں سکی کیونکہ مجھے ڈر تھا کہ کہیں وہ دوبارہ ناراض ہو کر آنا بند نہ کر دے۔ میری ڈھیل کا نتیجہ یہ نکلا کہ میں حرام و حلال کی تمیز کھو بیٹھی اور خود کو اختر کے حوالے کر دیا۔ وہ میری کمزوری کا بھرپور فائدہ اٹھا رہا تھا اور کیوں نہ اٹھاتا' جب دو نامحرم تنہائی میں ملتے ہیں تو ان پر شیطان غالب آ جاتا ہے' یہی کچھ ہمارے ساتھ بھی ہو رہا تھا۔ میں انجام سے بے پروا برائی کی دلدل میں دھنستی جا رہی تھی۔

اس روز بھی ہمارا شیطانی کھیل جاری تھا کہ خلاف توقع میرا شوہر کلیم اچانک گھر آ گیا۔ اب یہ اتفاق ہی تھا کہ اس روز میں دروازے کی کنڈی بھی بند کرنا بھول گئی تھی۔ دوپہر کا وقت تھا' وہ جیسے ہی کمرے میں داخل ہوا' ہمیں قابل اعتراض حالت میں دیکھ کر شدید اشتعال میں آ گیا اور اس نے شیشہ کا گلدان اٹھا کر اختر کے سر پر مارنا چاہا۔ مجھ سے یہ برداشت نہ ہو سکا کہ وہ اختر کو نقصان پہنچائے۔ میں نے پیچھے سے بیلن اس کے سر پر دے مارا۔ اس شدید ضرب کے پڑتے ہی وہ چکرا کر گر پڑا۔ اختر نے زمین پر گرا بیلن اٹھا کر میرے شوہر کے دل پر مارا اور پے در پے بیلن کے وار سے کلیم کو لہولہان کر دیا۔ وہ زمین پر پڑا بری طرح تڑپ رہا تھا اور ہم دونوں دروازے کے پاس کھڑے اس کے تڑپنے کا نظارہ کر رہے تھے۔ جب کلیم اپنی جان کی بازی ہار گیا' تب ہمیں ہوش آیا کہ اب کیا کریں؟ میں سخت گھبرائی ہوئی تھی' میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ ایک طرف شوہر مر گیا تھا' دوسری طرف اختر تھا جو میرے ایک بیان پر جیل کی سلاخوں کے پیچھے جا سکتا تھا لیکن میں اس کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔

''ہوش میں آؤ شکیلہ' ہمیں فوری طور پر اس مسئلے کا حل نکالنا ہے ورنہ ہم جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں گے۔'' اختر نے کہا۔

''مم......مم......میں کیا کروں؟'' میں نے سٹپٹاتے ہوئے کہا۔

''میں گھر کا سارا سامان اِدھر اُدھر بکھیر دیتا ہوں' میرے جانے کے بعد تم شور مچانا شروع کر دینا کہ ڈاکو آئے تھے' مزاحمت کرنے پر کلیم کو ہلاک کر کے چلے گئے۔ میں زیورات لے جاتا ہوں تاکہ ڈکیتی حقیقی لگے پھر جب بات ٹھنڈی ہو جائے گی تو ہم دونوں شادی کر کے نئی زندگی کی شروعات کریں گے۔'' اختر کا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ اختر نے گھر کا سارا سامان اِدھر اُدھر بکھیر دیا اور زیورات لے کر چلا گیا۔ اس کے جانے پر مجھے ہوش آیا اور میں نے وہی کیا جو اختر نے کہا تھا۔ میرے شور مچانے پر مختلف فلیٹوں سے لوگ جمع ہو گئے۔ پولیس بھی آ گئی۔ اس وقت گھر واقعی ڈکیتی کا منظر پیش کر رہا تھا۔ سب کو میری بات پر یقین آ گیا۔ نامعلوم ملزمان کے خلاف قتل اور ڈکیتی کا مقدمہ درج ہو گیا تھا۔ اس طرح ایک مہینہ گزر گیا مگر اختر نے مجھ سے رابطہ نہیں کیا۔ مجھے اختر پر بہت غصہ آ رہا تھا۔ وہ میرے سارے زیورات بھی لے گیا تھا اور رابطہ بھی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے جب موبائل پر رابطہ کیا تو اس نے اجنبیوں کی طرح بات کی جس پر مجھے غصہ آ گیا۔

''اختر' میں شکیلہ بات کر رہی ہوں' تم مجھ سے کس لہجے میں بات کر رہے ہو؟'' میں نے کہا۔

''کون شکیلہ' میں کسی شکیلہ کو نہیں جانتا' میرا کیا تعلق تم سے؟'' اختر نے کہا۔

''تم زیادہ ہوشیار نہیں بنو' تم سے میری موبائل پر بات چیت رہی ہے اور موبائل کمپنی کے پاس بھی اس کا ریکارڈ موجود ہوگا۔ میرا ایک بیان تمہیں جیل کی سلاخوں کے پیچھے لے جا سکتا ہے۔ پولیس تم سے خود جرم قبول کرا لے گی۔'' میں نے اسے دھمکی دی۔

''تم اور مجھے جیل بھجواؤ گی؟ محترمہ' میں جس سم سے تم سے بات کرتا تھا' وہ ایک ایسے شخص کے نام رجسٹرڈ ہے جسے دنیا سے گزرے چار برس ہو چکے ہیں۔ تمہیں یہی مشورہ ہے کہ مجھے ایک خواب سمجھ کر بھول جاؤ اور وہ زیورات میں نے تمہیں جو وقت دیا' اس کی قیمت ہیں۔'' اختر نے کہا۔

''میں تمہیں دیکھ لوں گی۔'' میں نے غصے سے کہا۔

''ہاں' ہاں' دیکھ لینا' تمہارے پاس میرا پتا بھی اس طرح فرضی ہے جس طرح سے یہ سم ہے۔ میں اس سم کو ہی پھینک دوں گا۔'' اختر نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کروں؟ جذبات میں آ کر میں نے پولیس کو بیان دیتے ہوئے سب کچھ بتا دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ پولیس فوری طور پر حرکت میں آئے گی اور اختر کو کسی بھی طرح ڈھونڈ کر گرفتار کر لے گی لیکن پولیس نے سب سے پہلے اس قتل میں مجھے ہی جیل میں ڈال دیا پھر بعد میں پولیس کی زبانی یہی سننے کو ملتا کہ وہ ملزم کو تلاش کرنے کی بھرپور کوشش کر رہی ہے لیکن مجھے پتا ہے' اختر کو تلاش کرنا ایسا ہی ہے جیسے اندھیرے کمرے میں کالی بلی کو تلاش کرنا......

میرے پاس اختر کی کوئی تصویر نہیں ہے' سم اس کی بند ہے اور نہ ہی میرے پاس اس کا اصل پتا ہے' میں کچھ بھی نہیں کر سکتی اختر کو تلاش کرنے میں کیونکہ میں جیل کی سلاخوں کے پیچھے ہوں۔ مجھے معلوم ہے' پولیس اختر کو تلاش نہ کرنے پر قتل کا سارا الزام میرے سر تھوپ دے گی تاکہ اس کیس کی فائل بند ہو جائے۔ میں آج اس کال کوٹھری میں ہر پل خود کو کوستی ہوں کہ میں وہ بدبخت عورت ہوں جس نے اپنے گھر کو خود اپنے ہاتھوں تباہ کیا اور جس کی خاطر یہ سب کچھ کیا' وہ بھی مال و عزت کا لٹیرا نکلا......

❄

ثمینہ یاسمین

سیڑھی اَن گلی

حزیں صدیقی کا خیال

تیری سمجھ میں کہاں آئیں گی میری باتیں
کہ تیرا علم لدنی نہیں کتابی ہے

ایک ایسے ضدی جن کا قصہ، جو ایک معصوم بچی کے پیچھے پڑا تھا

۷ ادسمبر کی تاریخ میری لوحِ ذہن پر نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ یہ میری تاریخ پیدائش ہے نہ شادی کی سالگرہ کا دن۔ برسوں پہلے جب میں ایک کھلنڈرا سا لڑکا تھا کہ اس تاریخ کو ایک عجیب واقعہ رونما ہوا تھا اور پھر یہ تاریخ وقفے وقفے سے میری اور میرے عزیزوں کی شاہراہِ زیست پر تلخ و شیریں واقعات کے سنگِ میل نصب کرتی چلی گئی۔

یہ انیس سال پہلے کی بات ہے' تب ہم لوگ جہلم کے ایک گاؤں میں رہتے تھے۔ ایک روز میں اپنی پھوپی کے گھر میں بیٹھا تھا کہ میری دس سالہ پھوپی زاد قدسیہ باہر سے آئی اور صحن میں بنی چھت والی سیڑھیوں کی طرف دیکھ کر نہ صرف ٹھٹکی بلکہ ''جن......وہ دیکھو' جن......'' کے الفاظ کہہ کر بری طرح خوف زدہ ہوگئی۔

اُس وقت پھوپی' میں اور میرے دونوں پھوپی زاد صحن میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب نے سیڑھیوں کی طرف دیکھا مگر سیڑھیوں پر کوئی جن تو کیا' چڑیا کا بچہ تک نہیں تھا۔ پھوپی نے قدسیہ سے پوچھا۔ ''کہاں ہے جن؟ وہاں تو کوئی بھی نہیں ہے۔''

''ہے اماں! وہ دیکھو' سب سے اوپر والی سیڑھی پر کھڑا مجھے گھور رہا ہے۔''

''اچھا' کیسا ہے وہ جن؟'' میں نے اشتیاق سے مگر مزاحیہ انداز میں پوچھا۔ ''مجھ ایسا خوبصورت یا شہزاد کی طرح بدشکل......''

''کالا سیاہ اور موٹا ہے۔'' قدسیہ اسی طرح سیڑھیوں پر نگاہ جمائے بولی۔ اس کے دو دانت باہر کو نکلے ہوئے ہیں جن سے خون ٹپک رہا ہے۔ ارے اماں' جب خون کے قطرے سیڑھی پر گرتے ہیں تو پھول بن جاتے ہیں۔ دیکھو' کتنے سرخ سرخ پھول پڑے ہیں اس کے قدموں میں۔''

''ای' تو پاگل تو نہیں ہوگئی؟'' پھوپی نے اسے ڈانٹا۔ ''وہاں کچھ بھی نہیں۔''

''ہے اماں' جن ہے' وہ مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں تجھے نہیں بخشوں گا' سخت سزا دوں گا۔''

یہ سن کر قدسیہ کا بڑا بھائی شہزاد اٹھا اور سیڑھیاں چڑھ کر چھت کے پردے سے جھانکتے ہوئے بولا۔ ''اب بتاؤ' کہاں ہے وہ جن؟''

''وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر رہا ہے' میری طرف آرہا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ پھوپی سے لپٹ گئی۔ چند ہی لمحوں بعد وہ پھوپی کو چھوڑ کر ''بچاؤ' بچاؤ' مجھے بچاؤ'' چلاتے ہوئے اِدھر اُدھر دوڑنے لگی۔ ہم سب پریشان ہوگئے۔ پھوپی نے لپک کر اسے اپنی بانہوں میں بھر لیا مگر دیکھتے ہی دیکھتے وہ بے ہوش ہو کر اس طرح اکڑ گئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔

گھر میں رونا پیٹنا مچ گیا۔ پھوپی نے مجھے مسجد کی طرف دوڑایا کہ پیش امام کو بلا لاؤں' وہ آئے اور انہوں نے کچھ پڑھ کر قدسیہ پر پھونکا۔ وہ ہوش میں تو آ گئی لیکن مردانہ آواز میں چیخنے لگی کہ ملاجی کو نکالو' فوراً نکالو اسے ورنہ اچھا نہیں ہوگا۔

ملاجی نے کہا۔ ''تو ہے کون؟''

قدسیہ نے مردانہ آواز میں جواب دیا۔ ''نہیں بتاتا' چلا جا یہاں سے ورنہ برا حشر کروں گا تیرا۔''

ملاجی بھی طیش میں آ گئے۔ انہوں نے آگے بڑھ کر قدسیہ کے بال پکڑ لیے اور بولے۔ ''تو جاتا ہے یا نہیں؟''

ملاجی کا اتنا کہنا تھا کہ قدسیہ ان پر ٹوٹ پڑی۔ میں' پھوپی اور میرے پھوپی زاد اسے پکڑتے مگر اس میں نہ جانے اتنی طاقت کہاں سے آ گئی تھی کہ ہماری گرفت سے چھوٹ کر ملاجی کو مارنے لگتی' ساتھ ہی یہ بھی کہتی جاتی۔ ''چلا جا ورنہ تیری ہڈیاں توڑ دوں گا۔''

آخر ملاجی یہ کہہ کر چل دیئے کہ یہ جن میرے بس کا نہیں ہے' کسی عامل کو لے آئیں۔

قدسیہ بولی۔ "کوئی عامل میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا' جو بھی آئے گا' میں اس کا خانہ خراب کردوں گا۔"

ملاجی کے جانے کے بعد قدسیہ کچھ دیر ہانپتی رہی پھر بے سدھ سی ہوگئی مگر اب پہلے کی طرح اس کے ہاتھ پاؤں نہیں اینٹھے تھے۔

ان دنوں میرے پھوپا لاہور ایئر پورٹ پر کام کرتے تھے۔ پھوپی نے میرے بڑے پھوپی زاد شہزاد کو فوراً لاہور بھیج دیا کہ وہ اپنے ابو کو بلا لائے۔ شام تک سارے گاؤں میں یہ خبر پھیل گئی کہ قدسیہ سے جن چمٹ گیا ہے۔ لوگ طرح طرح کے قصے سنانے لگے کہ فلاں عورت کو بھی جن چمٹ گیا تھا' آخر وہ بے چاری مرگئی۔ فلاں لڑکی پر بھی آسیب کا سایہ تھا' بڑے بڑے عامل بلائے گئے مگر کوئی بھی اسے آسیب سے نجات نہ دلا سکا۔ آخر بری امام کے ایک قلندر نے اس آسیب کو بھگایا ورنہ وہ اس لڑکی کی جان لے کر ہی رہتا۔ گویا جتنے منہ' اتنی باتیں۔ ہم سب یہ باتیں سن سن کر دہل گئے۔

رات کو بھی قدسیہ کئی بار چیخ کر اٹھ بیٹھی۔ اب اس نے نیا انکشاف کیا کہ وہ جن اپنی بیوی اور دو بچوں کو بھی لے آیا ہے۔ سب کے کان بڑے بڑے اور ناک توتے کی چونچ ایسی ہے۔ جن اپنی بیوی اور بچوں سے کہہ رہا ہے۔ "یہ ہے وہ لڑکی' سب مل کر مارنا اسے۔"

میری امی اور پھوپی رات بھر تلاوت کرتی رہیں۔ قدسیہ وقفے وقفے سے سوتی جاگتی رہی۔ صبح کی اذان کے ساتھ ہی وہ اٹھ بیٹھی اور بولی۔ "ابو جی آرہے ہیں۔ جن کہتا ہے کہ اگر انہوں نے کسی عامل کو بلایا تو میں ان کی ٹانگ توڑ دوں گا۔"

دوپہر سے پہلے پھوپا اور شہزاد پہنچ گئے۔ پھوپا نے قدسیہ کی حالت دیکھی تو بولے۔ "جن چاہے میرے ساتھ جو بھی سلوک کرے' میں اپنی بیٹی کو اس کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑ سکتا۔"

یہ کہہ کر وہ الٹے قدموں گاؤں سے روانہ ہو گئے۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا' قدسیہ کا چہرہ زرد ہوتا جا رہا تھا۔ کبھی وہ چیختی کہ جن اور اس کی بیوی بچے اسے مار رہے ہیں اور کبھی وہ مردانہ آواز میں حکم دیتی۔ "سب کمرے سے نکل جاؤ اور پڑھنا بند کردو۔" مگر جب ہم لوگ کمرے سے نہ نکلتے تو اٹھ کر توڑ پھوڑ شروع کردیتی اور اس پر قابو پانا مشکل ہوجاتا۔

آدھی رات کو قدسیہ سوتے سے اٹھ بیٹھی اور اس نے قہقہے لگانے شروع کردیئے پھر مردانہ آواز میں بولی۔ وہ آرہا ہے' اپنے ساتھ جسے لا رہا ہے' وہ میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتا۔ میں اسے ایسا سبق دوں گا کہ زندگی بھر یاد رکھے گا۔"

صبح پھوپا آئے تو ان کے ساتھ ایک عامل بھی تھا۔ یہ عامل بھی قدسیہ کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق کسی جن سے کم نہیں تھا' سیاہ فام' لحیم شحیم' گلے میں بڑے بڑے منکوں کی مالا' بغل میں جھولی اور کشکول اور دائیں ہاتھ میں موٹا سا ڈنڈا۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس نے نعرہ لگایا۔ "کہاں ہے وہ لڑکی جس پر جن سوار ہے؟"

پھوپا نے قدسیہ کی طرف اشارہ کیا جو عامل کی طرف دیکھتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ عامل نے پھوپا سے کہا۔ "تم کہتے تھے کہ لڑکی کی حالت خراب ہے۔ دیکھو میرے آتے ہی کیسے ٹھیک ہوگئی۔"

"ہاں۔" پھوپا مرعوب ہوتے ہوئے بولے۔

"اب تو یہ بھلی چنگی ہے مگر......"

"مگر وگر کچھ نہیں' میں دم کیے ہوئے کچے سوت کی ڈوری دیتا ہوں' اسے لڑکی کے بازو پر باندھ دو۔ یہ ڈوری اس جن کے لیے تو کیا' اس کے بڑوں کے لیے بھی زنجیر ثابت ہوگی۔ یہ لو ڈوری۔" اس نے

جھولے سے ڈوری نکال کر پھوپا کی طرف بڑھائی۔

"ٹھہرو۔" اس وقت قدسیہ نے مردانہ آواز میں کہا۔ "تو خود کیوں نہیں باندھتا ڈوری؟"

"ہاں' ہاں' میں باندھتا ہوں۔" عامل بولا۔ "کیا میں ڈرتا ہوں تجھ سے؟"

"تو قریب آ تاں۔" قدسیہ نے کہا۔ "دیکھوں تو کتنے پانی میں ہے تو؟"

"ایسا لگتا ہے کہ چوکی والے شاہ جی کے کسی مرید سے تیرا پالا نہیں پڑا اب تک؟" عامل غرایا۔ "میرے ڈنڈے کی ایک ہی ضرب سے تیرے چودہ طبق روشن ہوجائیں گے۔" یہ کہتے ہوئے عامل ڈنڈا لیے قدسیہ کی طرف بڑھا تو ہم سب دہل کر رہ گئے۔

پھوپا' عامل کو روکنا چاہتے تھے مگر عامل نے ایک ہاتھ سے انہیں دھکا دیا تو وہ دیوار سے جا ٹکرائے۔ عامل نے قدسیہ کو مارنے کے لیے ڈنڈا تولا ہی تھا کہ قدسیہ نے ایک ہاتھ سے اس کا ڈنڈا چھین کر اتنے زور سے اسے لات رسید کی کہ عامل پیٹھ کے بل جا گرا۔ قدسیہ اچھل کر اس کے سر پر پہنچ گئی اور اسے ٹھوکریں مارتے ہوئے بولی۔ "تو میرے چودہ طبق کیا روشن کرے گا بگلا بھگت' میں تیرا حلیہ ہی بگاڑ دوں گا۔"

ہم سب قدسیہ کو پکڑنے کی کوشش کررہے تھے مگر وہ ہمیں دھکا دے کر ہٹاتی اور عامل کو مارنے لگتی۔ وہ تو غنیمت ہے کہ پھوپا اور شہزاد نے ڈنڈا پکڑ لیا تھا ورنہ شاید وہ عامل کا سر توڑ دیتی۔ عامل کچھ دیر پٹنے کے بعد بولا۔ "اچھا' میں جاتا ہوں' جانے دے مجھے۔"

قدسیہ نے اس کی پٹائی بند کردی اور بولی۔ "خبردار' اب کبھی ادھر کا رخ نہ کرنا ورنہ گردن توڑ دوں گا۔"

عامل اٹھ کر ایسا بھاگا جیسے کوئی درندہ اسے پھاڑ کھانے کے لیے اس کا پیچھا کررہا ہو۔ ہم سب نے قدسیہ کو پکڑ کر چارپائی پر بٹھادیا تو پھوپا عاجزی سے بولے۔ "تم جو کوئی بھی ہو' اتنا تو بتادو کہ میری بچی کو کس قصور کی سزا دے رہے ہو؟"

قدسیہ' پھوپا کو گھورتے ہوئے بولی۔ "قصور پوچھتے ہو اس کا۔ اس نے میرے معصوم بچے کو روند ڈالا۔ جب تک وہ زندہ ہے' میں اسے اسی طرح سزا دیتا رہوں گا اور اگر وہ مرگیا تو میں اسے بھی مار ڈالوں گا۔"

"تمہارا بچہ اسے نظر نہیں آیا ہوگا۔ اس میں میری بیٹی کا کیا قصور؟"

"میں کچھ نہیں جانتا' میرا بچہ تڑپے گا تو میں اسے بھی تڑپاؤں گا۔ وہ مرا تو یہ بھی زندہ نہیں رہے گی۔ یہ میرا اٹل فیصلہ ہے اس لیے اب کسی عامل وغیرہ کو نہ لانا۔" یہ بتا کر قدسیہ ہانپتے ہوئے بے ہوش ہوگئی۔

اس انکشاف کے بعد کچھ لوگوں نے مشورہ دیا کہ قدسیہ کا معاملہ خدا پر چھوڑ دیا جائے مگر جب جن' اس کی بیوی اور بچے' قدسیہ کو مارتے تو اسے تڑپتا دیکھ کر ہم سب بھی تڑپ اٹھتے۔

وقت گزرتا رہا' اس دوران میں ابو اور پھوپا کئی عاملوں کو لے آئے مگر وہ ظالم جن اپنی ضد پر اڑا رہا بلکہ جب کبھی کوئی عالم یا عامل آتا' وہ قدسیہ کی سزا میں اضافہ کردیتا' اس کی پیٹھ اور چہرے پر نیل پڑ جاتے۔ کبھی اسے اپنے سینے پر اتنا وزنی پتھر رکھا محسوس ہوتا کہ اس کی سانس رکنے لگتی۔

ٹھیک ایک سال بعد سترہ دسمبر کو پھوپا کو ڈھاکہ جانے کا ٹرانسفر آرڈر مل گیا۔ وہ سخت شش و پنج میں تھے کہ کیا کریں؟ بال بچوں کو ساتھ لے جانا بھی ان کے لیے بے حد مشکل تھا اور چھوڑنا بھی۔ بالآخر انہوں نے یہ طے کیا کہ پہلے اکیلے ڈھاکہ جائیں اور پھر بال بچوں کو بلوالیں۔

دو ماہ بعد انہوں نے پوری فیملی کو بلوایا اور سب

سے پہلا کام یہ کیا کہ سارے افراد خاندان کو سلہٹ والے شاہ جلال باباؒ کے مزارِ اقدس پر لے گئے جہاں رو رو کر انہوں نے دعا مانگی کہ یہ پردیس ہے اور وہ ان کی پناہ میں رہنا چاہتے ہیں۔ حبیبِ خداؐ کے صدقے انہیں پناہ دی جائے اور قدسیہ کو اس جن کے شر سے محفوظ رکھا جائے۔

اللہ تعالیٰ اپنے نیک بندوں کی لاج رکھتا ہے۔ سو ان کی دعا قبول ہوئی اور اس جن اور اس کی بیوی بچوں نے قدسیہ کو نہ ستایا۔ ان دنوں نفرت کی وہ فصل پک کر تیار ہو چکی تھی جو پاکستان کے دشمنوں نے بوئی تھی۔ پورے مشرقی پاکستان میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک شدید نفرت کی آندھیاں چل رہی تھیں۔ بھائی اپنے ہی بھائیوں کے خون کے پیاسے ہو چکے تھے چنانچہ دشمن کی سازش رنگ لائی اور ۱۶ دسمبر ۱۹۷۱ء کو پاکستان کا ایک بازو کٹ گیا۔ مغربی پاکستان کے بھی لوگ جنگی اسیر بنا کر بھارت کے مختلف کیمپوں میں بھیج دیئے گئے۔ ان میں میرے پھوپا کا خاندان بھی شامل تھا۔

خدا کا شکر ہے کہ جنگی اسیروں کے بھارتی کیمپ میں بھی قدسیہ اس جن کے شر سے محفوظ رہی۔ یہ بھی غالباً اسی دعا کا نتیجہ تھا جو شاہ جلالؒ بابا کے مزارِ اقدس پر مانگی گئی تھی۔ بھارت بھی پھوپا اور ان کے اہلِ خاندان کے لیے پردیس ہی تھا۔

جب جنگی اسیر قید و بند کے عذاب سے نکل کر پاکستان پہنچے تو پھوپا اور ان کے گھر والے بھی اپنے وطن واپس آ گئے۔ اب قدسیہ جوان ہو چکی تھی۔ وہ اور اس کے گھر والے ہی کیا، ہم سب بھی یہی سمجھ رہے تھے کہ اسے جن کے ظلم و ستم سے ہمیشہ کے لیے نجات مل چکی ہے لیکن جہلم پہنچتے ہی وہ سلسلہ پھر سے شروع ہو گیا بلکہ جن کے مظالم میں شدت آ گئی۔

قدسیہ چیختی چلاتی اور فریاد کرتی کہ اسے یوں پیٹا جا رہا ہے جیسے اوکھلی میں دھان کو کوٹا جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں، پیروں کی انگلیاں پتھر کی طرح سخت اور ٹیڑھی میڑھی ہو جاتیں، جسم پر نیل پڑ جاتے، کبھی ناک اور کبھی منہ سے خون رسنے لگتا۔ ہم سے اس کی یہ حالت نہ دیکھی جاتی۔ وہ روز بہ روز کمزور اور زرد پڑتی جا رہی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے قطرہ قطرہ کر کے اس کا خون نچوڑا جا رہا ہو۔

پھوپا کسی عامل کو بلاتے یا کوئی تعویذ لاتے تو جن مزید چراغ پا ہو جاتا۔ قدسیہ کی حالت مزید خراب ہو جاتی، چنانچہ تعویذ اور عامل لانے کا سلسلہ بند کر دیا گیا لیکن یہ صورتِ حال ایسی تھی جیسے قدسیہ قدم قدم موت کی طرف بڑھ رہی ہو۔ آخر ایک روز پھوپا نے یہ اعلان کر دیا کہ ایک عامل کی بڑی تعریف سنی ہے، اسے لے آتا ہوں، اگر وہ بھی قدسیہ کو اس جن سے نجات نہ دلا سکا تو ہم یہ گاؤں چھوڑ دیں گے۔

پھوپا نہ جانے کس عامل کو لینے گئے تھے کہ قدسیہ بیٹھے بیٹھے عالمِ جلال میں آ گئی اور مردانہ آواز میں بولی۔ ''میں انہیں یہاں تک نہیں آنے دوں گا، راستے میں ہی ان کا ایکسیڈنٹ ہو جائے گا۔''

اور ایسا ہی ہوا، راستے میں پھوپا کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہو گیا۔ پھوپا کی ٹانگ ٹوٹ گئی۔ عامل صاحب کو معمولی چوٹیں آئیں۔ انہوں نے پھوپا سے کہا۔ ''مصلحتِ خداوندی یہی تھی۔ تم اپنے گھر والوں کو لاہور بلا لینا۔''

ایکسیڈنٹ کے بعد پھوپا کو سیدھا لاہور لے جایا گیا۔ ایکسیڈنٹ کی اطلاع ملنے سے پہلے ہی قدسیہ نے بتا دیا۔ ''عامل کو لانے والا لاہور کے اسپتال پہنچ گیا۔''

یہ بات سن کر ہم سب پریشان ہو گئے۔ شام کو اس بات کی تصدیق ہو گئی تو دوسرے دن میں بھی پھوپی کے گھر والوں کے ساتھ لاہور روانہ ہو گیا۔ قدسیہ ہمارے ہمراہ تھی۔ جب ہم لاہور پہنچے تو

اچانک پھوپی نے کہا۔ ''پہلے داتا دربار چلو۔ وہاں حاضری دے کر اور دعا مانگ کر اسپتال جائیں گے۔''

یہ سن کر قدسیہ بے چین ہو گئی۔ بولی۔ ''میں وہاں نہیں جاؤں گا۔''

پھوپی نے کہا۔ ''تم داتا کی نگری میں ہو۔ قدسیہ کو ان کے دربار میں حاضری کی اجازت نہ دی تو اپنا حشر سوچ لو۔''

قدسیہ نے کچھ نہ کہا، بس بے بسی سے ہم سب کو دیکھتی رہ گئی۔

ہم داتا دربار پہنچے تو پھوپی، شہزاد اور اشفاق نے رو رو کر دعا مانگی۔ میں نے قدسیہ کی طرف دیکھا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔

داتا صاحب کے مزارِ اقدس سے باہر نکلے تو قدسیہ نے حسبِ معمول مردانہ آواز میں کہا۔ ''میں جا تو رہا ہوں مگر جاتے جاتے ایک نشانی ضرور دے جاؤں گا۔ یہ جب بھی اپنا ہاتھ دیکھے گی یا کسی کو دکھائے گی تو اس کی ایک انگلی اسے اور سب کو میری یاد دلاتی رہے گی۔''

یہ کہہ کر قدسیہ نے آنکھیں موند لیں اور بڑے اطمینان سے گاڑی میں سو گئی۔ جب اسپتال پہنچ کر ہم گاڑی سے اترنے لگے تو قدسیہ کو جگایا گیا۔ پھوپی نے اس سے کہا۔ ''ذرا اپنے ہاتھ تو دکھاؤ قدسیہ!''

قدسیہ نے اپنے ہاتھ پھوپی کے سامنے کر دیئے۔ اس کے دائیں ہاتھ کی ایک انگلی میں خم نمایاں دکھائی دے رہا تھا۔

پھوپا شفایاب ہو کر گھر آ گئے پھر دو سال بعد قدسیہ کی شادی ہو گئی۔ اب وہ ایک بچے کی ماں بن چکی ہے۔ اس جن نے پھر کبھی قدسیہ کو ظلم کا نشانہ نہیں بنایا البتہ اس کے دائیں ہاتھ کی انگلی اب تک ٹیڑھی ہے۔

آدمی

آدمی کا جسم کیا ہے جس پہ شیدا ہے جہاں
ایک مٹی کی عمارت، ایک مٹی کا مکاں

خون کا گارا بنا ہے، اینٹ اس میں ہڈیاں
چند سانسوں پہ کھڑا ہے یہ خیالی آسماں

موت کی پرزور آندھی جب اس سے ٹکرائے گی
یہ عمارت ٹوٹ کر پھر خاک میں مل جائے گی

جو کچھ دیکھتا ہے تو فریبِ خواب ہستی ہے
تخیل کے کرشمے ہیں، بلندی ہے نہ پستی ہے

عجب دنیائے حیرت عالمِ گورِ غریباں ہے
یہ ویرانے کا ویرانہ ہے اور بستی کی بستی ہے

وہی ہم ہیں کبھی جو رات دن پھولوں میں تلتے تھے
وہی ہم ہیں کہ تربت چار پھولوں کو ترستی ہے

استاد قمر جلالی

پسند۔ نفیسہ فضل، کراچی



ارم زہرا

یہ زندگی کے راستے

شاداب صدیقی کا خیال

بے ربط زندگی کو گزارے چلے گئے
سینے زہرِ ہجر پکارے چلے گئے

ایدھی سینٹر کراچی میں پروان چڑھنے والی ایک حرماں نصیب کا قصہ رنج والم



''میں پورے پندرہ سال بعد ٹرین میں بیٹھی ہوں' وہ سفر آج بھی مجھے یاد آتا ہے تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔'' مہربانو نے کرب سے لب کاٹتے ہوئے وارث کو دیکھا پھر ایک مضمحل سی سانس بھر کر رہ گئی۔

''اچھا لیکن ایسا کیا ہوا تھا؟'' وارث نے حیران نظروں سے مہربانو کو دیکھا۔

''وارث' میں ٹرین کی کھڑکی سے گزرتے ہوئے اسٹیشنوں کو دیکھ رہی تھی۔ خوف مجھ پر سوار تھا اور میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں کسی طرح کھڑکی سے چھلانگ لگا دوں۔ مخصوص شکل کی چوٹیاں' بل کھاتی ہوئی ندیاں اور جنگل سب ہی کچھ تو میرے راستے میں آرہا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہیں تھی کہ میں کھڑکی سے باہر گھپ اندھیرے میں چھلانگ لگا سکوں۔'' خوف مہربانو کے لہجے میں نمایاں تھا۔

''مگر اب تم میری شریکِ حیات ہو' تمہیں اپنے دل سے اس طرح کے خوف کو نکال دینا چاہیے۔'' وارث نے آہستگی سے مہربانو کا ہاتھ تھاما۔

''نہیں وارث' میں اپنی زندگی کے وہ پل کبھی نہیں بھول سکتی جس نے مجھے میرے اپنوں سے دور کردیا۔ مجھ سے میرے ماں باپ' بھائی کا پیار چھین لیا۔ آپ جانتے ہیں وارث' وہ شخص مجھے اغوا کر کے لے جارہا تھا اور میں کھڑکی سے چپکی اس کی لال بھبوکا آنکھوں کو تو کبھی کھڑکی سے باہر چاروں طرف پھیلے اندھیرے کو تک رہی تھی۔ سسکیاں مجھ میں ٹوٹ رہی تھی اور میرے آنسو رورو کر خشک ہوچکے تھے۔'' باقاعدہ ہچکیوں سے روتے ہوئے مہربانو نے اپنا سر جھکالیا۔

''پھر تم ایدھی ہوم کیسے پہنچیں؟'' وارث کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''میری کیفیت اور اس شخص کی مشکوک حالت دیکھ کر ڈبے میں بیٹھے لوگوں کو شک ہوگیا اس پر۔ لوگوں نے اس سے پوچھ گچھ شروع کی تو وہ خوف زدہ ہوکر بھاگ گیا' یوں وارثوں کے ہوتے ہوئے ایدھی ہوم کے لاوارث بچوں کے درمیان آ گئی میں۔'' مہربانو اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔

''تم نے کبھی اپنے ماں باپ کو ڈھونڈنے کی کوشش نہیں کی یا اُن کی طرف سے کوئی پیش قدی؟'' وارث نے مہربانو کے چہرے پر رحم طلب نظریں دوڑائیں۔

''نہیں وارث' میں اتنی چھوٹی تھی کہ نہ مجھے اپنے گھر کا پتا معلوم تھا اور نہ ہی اپنے گاؤں کا نام' مجھے تو اپنا نام بھی یاد نہیں' بس گھر والے مجھے پیار سے رجو کہتے تھے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔'' مہربانو نے ایک طویل گہرا سانس لیا۔

''ہوں......'' وارث نے اسی پر اکتفا کیا۔

''میرا نام مہربانو' بلقیس آنٹی نے رکھا ہے اور آپ کو پتا ہے وارث' اُن کی بیٹی کبریٰ ایدھی جو ہیں' انہوں نے مجھے ایک ماں کا پیار دیا ہے' یہ اُن کی محبت کا اعجاز ہے کہ میں آج پڑھ لکھ کر اس قابل ہوگئی ہوں کہ ہر طرح کے حالات کا مقابلہ کرسکوں۔''

''یہ تو واقعی ایک نیکی کا کام ہے جو انہوں نے انجام دیا ہے۔'' وارث نے تھوڑی سہلاتے ہوئے مہربانو کی جانب دیکھا۔

''لیکن یہ بھی تو ایک نیکی ہے وارث' کہ آپ نے ایدھی ہوم میں رہنے والی ایک لاوارث لڑکی کو اپنا شریکِ سفر بنالیا؟''

''مجھے بابا نے جب تمہارے بارے میں بتایا تو میں تمہیں دیکھنے کا متمنی تھا۔ میں نے بابا سے کہہ دیا تھا کہ اگر لڑکی مجھے پسند آئی تو ہی شادی ہوگی اور تمہیں دیکھتے ہی میں اپنا دل ہار بیٹھا۔'' وارث نے قدرے شوخ ہوتے ہوئے مہربانو کے قریب خود کو کیا تو وہ سمٹ سی گئی۔

''اف' آپ بھی لیکن یہ میری خوش نصیبی ہے کہ

آپ کی صورت مجھے ایک بہترین شریکِ حیات مل گیا۔'' مہربانو کے چہرے پر انوکھی خوشی کے آثار نمایاں تھے۔

''اچھا مہرو! میرپور بس کچھ ہی گھنٹے کے فاصلے پر رہ گیا ہے' آزاد کشمیر کا شہر میرپور تمہارے کراچی سے زیادہ خوبصورت ہے۔'' وارث کے لہجے میں زعم تھا۔

''تو ڈھونڈلی ہوتی کوئی میرپور والی' کراچی آنے کی کیا ضرورت تھی؟'' مہربانو نے منہ بنایا۔

''بھئی' میری مہرو ہی خوبصورت پورے میرپور میں نہیں تھی اسی لیے تو کراچی آنا پڑا۔''

''اوہ ہو مہرو!'' مہربانو نے شوخی سے کہا۔

''پیار سے پکارا تھا یار' کیا برا لگا؟'' وارث نے بھی شوخی سے اسے دیکھا۔

''پیار سے پکارنا ہے تو رجو ہی پکار لیں۔ مجھے میرے ماں باپ اسی نام سے پکارتے تھے۔'' اداسی اگلے ہی پل مہربانو کے لہجے میں ہچکولے لینے لگی۔

''رجو بھی پیارا ہے اور بات سنو' آنکھوں کی تازگی اور ہونٹوں کی مسکراہٹ جلدی سے واپس لے آؤ' ہمارا اسٹیشن قریب آنے والا ہے۔ اماں اور ابا کے سامنے ایسے جاؤ گی کیا؟ ابا تو میرے کان موڑ دے گا' کہے گا' نئی نویلی دلہن بیاہ کر لا رہا ہے یا اغوا کر کے؟'' وارث نے انجانے میں اس کی دکھتی رگ پر ہاتھ رکھ دیا تھا۔

''اغوا؟'' مہربانو نے ایک طویل سانس لی اور آہستگی سے بولی۔

''بھئی' اس بار اغوا کرنے والا بیچ راستے میں تمہیں چھوڑ کر نہیں بھاگے گا۔ اب تو تم عمر بھر میری تابع رہو گی۔'' وارث کا لہجہ محبت میں ڈوبا اور جذباتی ہو گیا تھا۔

''مجھے بھی منظور ہے۔'' مہربانو اُسے بے حد عقیدت اور محبت سے دیکھتے ہوئے بولی۔

''رجو' اپنے چہرے کی اس رونق کو ہمیشہ برقرار رکھنا میرے لیے۔ میں تمہارا ہم سفر تو ہوں ہی لیکن بہترین دوست بھی ثابت ہوں گا۔'' وارث کے لہجے میں محبت ہی محبت تھی۔

''جب وقت حسین' دلکش اور دلربا لگنے لگتا ہے تو جانے کیوں جلدی گزرنے لگتا ہے؟'' مہربانو کھڑکی سے بل کھاتی ہوئی ندیوں کو دیکھتے ہوئے خود سے مخاطب تھی جبکہ وارث برتھ سے سفری سامان اتارنے میں مصروف ہو چکا تھا۔

•......•......•

''واہ' واہ' میری بہو تو بڑی سلیقہ شعار ہے۔'' ناز بی بی نے مہربانو کو سلیقے سے دسترخوان لگاتے دیکھا تو بے اختیار اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔

''بھئی' میری بڑی خواہش تھی کہ میں اپنی بہو شہر سے لے کر آؤں۔ جب بھی وارث کراچی جاتا تو یہ خواہش اور زور پکڑنے لگتی۔ اب کراچی میں تو اپنا کوئی ہے نہیں لیکن پھر مجھے خیال آیا' کیوں نہ ایدھی ہوم......'' اکبر علی ابھی آگے کچھ کہتے کہ ناز بی بی نے انہیں اشارے سے خاموش کرایا۔

''بس' بس' اس سے آگے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ بچی کا دل دکھتا ہوگا' بس اب یہ اس گھر کی بیٹی ہے اور ہمارے وارث کی بیوی۔ اب اس کی پہچان یہی ہے۔'' ناز بی بی نے معصوم سے چہرے والی مہربانو کو بغور دیکھا۔

''نہیں میری بچی! اداس نہیں ہوتے۔ چلو جا کر اب وارث کو بلا لاؤ۔ جب تک آواز نہیں دو' ہلتا نہیں ہے اپنی جگہ سے۔'' ناز بی بی نے ماتھے کا بوسہ لیتے ہوئے مہربانو کو خفت سے آزاد کرانے کی کوشش کی۔

''جی امی! بس ابھی بلا کر لاتی ہوں۔''

''لو بھئی' بہو کیا آ گئی اس گھر میں' اب ہمارے بولنے پر بھی پابندی لگ گئی۔'' اکبر علی نے برا سا منہ بنا کر ناز بی بی کو دیکھا۔

''اب آپ بھی بہو کے سامنے بار بار ایدھی ہوم کا ذکر نہیں کیا کریں۔''

''جانتا ہوں' بس یونہی' خیر' یہ تو بتاؤ' اس کے کاغذات اصلی تو ہیں ناں؟''

''مطلب کیا ہے آپ کا؟'' ناز بی بی کے لہجے میں حیرت تھی۔

''ارے' شہر کی پڑھی لکھی لڑکی ہے۔ کچھ خبر نہیں ناں' کہیں جعلی ڈگری لائی ہو۔ آج کل شہروں میں یہ بات عام ہے ناں۔''

''اب اس کا مجھے پتا نہیں لیکن عادت واطوار سے واقعی نفیس طبیعت کی مالک ہے۔''

''تم بہو کے کان میں یہ بات ڈال دینا کہ ہم لندن کے لیے اپلائی کرنا چاہتے ہیں تو اپنی ساری ڈگریاں نکال لے۔'' اکبر علی بڑے ہی محتاط انداز میں گفتگو کر رہے تھے۔

''اب اتنی جلدی کیا ہے؟ ذرا رک کر یہ کام کر لینا۔'' ناز بی بی نے مہربانو کے کمرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ارے پاگل' یہ کاغذی پروسس کتنا طویل ہوتا ہے' تمہیں کیا پتا؟ یہ کام تو جتنی جلدی ہو جائے' اتنا ہی اچھا ہے۔ سجاد بار بار لندن سے کال کر رہا ہے۔ ابھی وقت اپنے ہاتھ سے نکل گیا تو جا چکا تیرا وارث لندن۔'' اکبر علی کے لہجے میں جیسے غصے کی چنگاریاں تھیں۔

''ایک تو تم اور تمہارا بھائی دونوں ہوا کے گھوڑے پر سوار رہتے ہو۔ کرتی ہوں بات میں بہو سے۔'' ناز بی بی ہولے سے بولیں۔

''لو آ گئے دونوں۔'' اکبر علی نے وارث اور مہربانو کو آتے دیکھا تو خود بھی جلدی سے دسترخوان کی جانب بڑھ گئے۔

''چلو بیٹا' بسم اللہ کرو۔ دسترخوان لگتے ہی فوراً آتے ہیں۔''

''ارے' میری ماں' سفر کی تھکان جو ابھی نہیں اتری' کیا کروں؟'' ایک بڑی سی جمائی لیتے ہوئے وارث گویا ہوا۔

''چلو بہو' تم نکالو' یہ سدا کا سست ہے۔'' ناز بی بی نے مہربانو کو مخاطب کیا تو وہ شریں سی مسکراہٹ لبوں پر سجائے وارث کو دیکھنے لگی جو چھوٹے سے بچے کی طرح ماں کے گلے لگ چکا تھا۔

•......•......•

''میں یقیناً قسمت کا دھنی ہوں جبھی اتنی پڑھی لکھی اور ساتھ ہی خوبصورت بیوی مجھے ملی ہے۔'' وارث نے مہربانو کے کاغذات فائل کرتے ہوئے کہا۔

''اور مجھے اس بات پر فخر ہے کہ مجھے اتنا سمجھنے والا' پیار کرنے والا شوہر ملا ہے۔'' مہربانو کھوئے کھوئے لہجے میں بولی۔

''تو پھر تیار ہو ہمارے ساتھ لندن جانے کے لیے؟'' وارث ترچھی نظر سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔

''آپ جہاں چاہے' لے جائیں' جس حال میں چاہے رکھیں' میں تو بس آپ کی رفاقت چاہتی ہوں۔'' مہربانو کے لہجے کی شگفتگی اور سادگی وارث کے کانوں میں رَس گھول رہی تھی۔

''سچ' تمہیں پا کر میں بہت خوش ہوں' مجھے یقین ہے' تمہارا ساتھ میری زندگی کو حسین بنا دے گا۔''

''وارث' آپ جانتے ہیں' آپ سے ملنے سے پہلے میں اکثر سہانے خواب دیکھا کرتی تھی مگر ڈرتی تھی جو خواب پورے نہیں ہو سکتے بھئی' انہیں آنکھوں میں سجانے کا کیا فائدہ؟''

''پھر؟'' وارث کے ہونٹوں پر بڑی دلفریب مسکراہٹ جاگی۔

''لیکن اب بہت خوش ہوں۔ اللہ نے میری دعائیں قبول کیں' میرے خوابوں کو حقیقت کا روپ دے دیا اور مجھے آپ سے ملا دیا۔''

''مہرو! تم ہمیشہ میری رہو گی ناں' میرے دوست کہتے ہیں' لڑکیاں بے وفا ہوتی ہیں۔ کبھی اُن پر اعتبار نہیں کرنا چاہیے۔'' وارث اپنی رو میں بولتا چلا جا رہا تھا۔

''نہیں وارث' میں ہمیشہ آپ کا ساتھ دوں گی' میں آپ کی شریکِ حیات تو ہوں ہی لیکن ساتھ ہی آپ کا یہ مجھ پر احسانِ عظیم ہے کہ آپ مجھے اُس جگہ سے نکال کر لے آئے جہاں میری کوئی پہچان نہیں تھی' مجھے لگتا تھا' وہ چار دیواری تا عمر میرا مقدر بنی رہے گی لیکن پھر یہ سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ ایک بھیڑیے کے پنجے سے تو نکل آئی۔'' مہربانو رشک کی نگاہ سے وارث کو دیکھنے لگی۔

''ہاں بھئی' ایک بات اور' وہ یہ کہ میں پوری کوشش کروں گا کہ تمہیں تمہارے والدین سے ملوا سکوں' تم مجھے اُن کی نشانیاں بتاؤ' شاید میں ڈھونڈوانے میں کچھ تمہاری مدد کر سکوں۔'' وارث نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔

''اے کاش' مجھے کچھ یاد آ جائے' میں اُس وقت بہت چھوٹی تھی جب مجھے اغوا کیا گیا تھا' صرف تین سال کی۔ وارث' میں نے اپنی زندگی کے بیس سال اس آس میں گزارے ہیں کہ ایک دن میں اپنے گھر والوں سے مل سکوں گی مگر دل کی سرزمین پر وہم اور خدشات کی جو جھاڑیاں اُگ آتی ہیں' وہ میرے کومل جذبوں کو بھی برباد کر دیتی ہیں۔'' مہربانو کے لہجے میں کرب اُمڈ آیا تھا۔

''یار' میں سمجھ سکتا ہوں تمہارے جذبات لیکن یہ بھی تو سوچو' میرے ماں اور بابا بھی تو تمہارے اپنے ہیں' جب تمہیں اپنی امی یا ابو کی یاد ستائے' تم اُن کے ساتھ بیٹھ کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیا کرو۔'' وارث نے اسے سمجھاتے ہوئے کہا۔

''جی وارث' ضرور' اچھا وارث' میں نے سنا ہے' لندن جانا تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ اگر آپ ملک سے باہر ہی جانا چاہتے ہیں تو کہیں اور کے لیے کیوں نہیں اپلائی کرتے جہاں سے ویزہ آپ کو آسانی سے مل جائے؟'' مہربانو خود کو سنبھالتے ہوئے بولی۔

''ارے نہیں' میرے چچا لندن میں کافی عرصے سے مقیم ہیں' مجھے کوئی مشکل درپیش نہیں ہو گی' بس لندن جانے کے لیے ایک شرط تھی کہ میں اپنی بیوی کے ساتھ جاؤں۔''

''کیا مطلب' یہ شرط کس نے لگائی ہے؟'' مہربانو نے چونک کر وارث کو دیکھا۔

''مم......مم......میرا مطلب ہے' یہ شرط میرے دل نے لگائی ہے کہ جاؤں گا تو اپنے ساتھی کے ساتھ۔ کیوں' کیا تمہارا دل نہیں چاہ رہا کہ ہم اپنا ہنی مون لندن میں منائیں؟'' وارث نے بات کا رخ اچانک ہی موڑا تھا۔

''ہاں' کیوں نہیں۔'' مہربانو کے چہرے پر حیا انگیز مسکراہٹ کا ہالہ نمایاں تھا۔

''تو بس پھر دُعا کر دیار' خدا ہماری راہ میں آنے والی ہر ہر رکاوٹ کو دور کر دے۔'' وارث نے جذباتی انداز میں کہا اور لیٹ گیا جبکہ مہربانو کے چہرے پر سکون اور طمانیت بھری مسکراہٹ تھی۔

•......•......•......•

مہربانو اور وارث کی شادی کو ابھی چھ ماہ ہی ہوئے تھے کہ قسمت کی دیوی نے انہیں لندن پہنچا دیا۔ وارث کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا جبکہ مہربانو کی خوشی بھی قابلِ دید تھی' اُسے لندن آنے سے زیادہ اس بات کی خوشی تھی کہ اُس کا شریکِ حیات خوش ہے مگر اب مہربانو کی زندگی میں ایک بڑا چیلنج آ گیا تھا' جب تک وہ پاکستان میں تھی' باہر نکلا کرتی تھی' گھوما پھرا کرتی تھی' گھر میں وارث کے والدین تھے جن کے ساتھ وہ خوب باتیں کیا کرتی' اُن کی خدمت کرنا وہ اپنا فرض سمجھتی تھی مگر یہاں لندن آنے

کے بعد وہ ایک کمرے میں بند ہو کر رہ گئی تھی۔ دیارِ غیر میں نہ تو کوئی اُس کا رشتہ دار تھا اور نہ ہی دوست احباب' بس پورا دن ایک کمرے میں بند اپنی تنہائیوں سے وہ مخاطب رہتی۔ وارث جاب کے حصول کے لیے زیادہ تر گھر سے باہر ہی رہا کرتا' یوں پانچ چھ ماہ کی قلیل خوشی کے بعد ایک بار پھر اسے تنہائی نے آ گھیرا تھا' اسے شدت سے ایدھی ہوم کا وہ کمپارٹمنٹ یاد آ رہا تھا جہاں وہ ننھے ننھے بچوں کو تعلیم دیا کرتی پھر شام سلائی کڑھائی کی کلاسز لیا کرتی تھی۔ وقت یقیناً بہت اچھا گزر رہا تھا مگر یہاں آنے کے بعد وہ بالکل اندر سے بجھ گئی تھی اور شاید کام کی زیادتی کی وجہ سے وارث بھی الجھا الجھا سا رہنے لگا تھا اور اسے بہت کم ٹائم دینے لگا تھا۔

''یہ تقدیر کے فیصلے بھی کتنے اٹل ہوتے ہیں' ہماری سوچوں سے جدا' میری بھی کیا قسمت ہے' جھنگ جو چھوٹا سا ایک گاؤں ہے' وہاں سے مجھے میری قسمت کراچی لے آئی' کراچی سے آزاد کشمیر کے شہر میرپور اور اب لندن مگر شہر اور ملک بدلنے سے اداسی نے اپنی جگہ نہیں بدلی' وہ آج بھی میرے ہی دل کو اپنی آماجگاہ سمجھتی ہے۔'' مہربانو اداسی کے جال گسل میں ڈوبی بے ارادہ کمرے میں ٹہلنے لگی۔

''وارث کو تو اب تک آ جانا چاہیے تھا؟'' بے خیالی میں وہ دیوار پر لگی وال کلاک کو دیکھتے ہوئے بولی تھی۔

•......•......•......•

''لو بھئی' دیکھ لیا تم نے' وارث اپنے قول و فعل کا پکا ہے۔'' وارث نے سامنے بیٹھی ہوئی نیہا کو مخاطب کیا تھا۔

''سچ وارث' مجھے خوف اور اندیشے پریشان کر رہے تھے۔ یہ مجھے قطرہ قطرہ اندر سے کھوکھلا کر رہے تھے۔ اگر تم لندن نہیں آتے تو میرا کیا ہوتا؟'' نیہا جذباتی انداز میں گفتگو کر رہی تھی۔

''تم بچپن کی محبت ہو' ایسے کیسے تمہیں چھوڑ دیتا؟ سچ' تمہاری محبت کی خاطر کیا کیا پاپڑ بیلنے پڑے ہیں مجھے۔ خیر' چھوڑ اب ان سب باتوں کو' اتنے دنوں بعد ملے ہیں' میرے دل پر چھائی رنگین فضا' ساری رومانیت تمہارے واہموں کی نذر ہو رہی ہے۔'' وارث اُس کی باتوں سے خفا نظر آ رہا تھا۔

''اچھا بھئی' اپنی خفگی دور کرو اب' مجھے پہلے یہ بتاؤ' پاکستان میں سب کیسے ہیں؟ تمہاری امی' بابا اور میرے گھر والوں سے تو مل کر آئے ہو ناں؟''

''ہاں بھئی' وہاں سب خیریت ہے' سب ٹھیک ہیں' تمہارے گھر والے تمہیں بہت یاد کرتے ہیں' ویسے تمہیں نہ جانے کس کیڑے نے کاٹا تھا کہ یہاں پڑھنے چلی آؤ؟'' وارث منہ پھلاتے ہوئے بولا تھا۔

''لیکن وارث' یہ تو سوچو' اب ہم دونوں مل کر اپنی زندگی سنواریں گے' ہم اب اپنی زندگی اپنے طریقے سے گزاریں گے لیکن......'' نیہا کے چہرے پر خوف اور وہم ایک بار پھر رقصاں تھے۔

''لو بھئی' اب کیا ہو گیا؟'' وارث نے بے ساختہ پوچھا۔

''تمہاری بیوی جس کی بدولت تم یہاں تک پہنچے ہو' اسے کیا بتاؤ گے؟''

''ارے یار' چھوڑو' مجھے اس کی پروا نہیں اسی لیے تو اسے ایدھی ہوم سے پسند کر کے لایا تا کہ بعد میں اسے چھوڑنے میں آسانی ہو۔ سچ' اس کا کوئی پرسانِ حال نہیں۔''

''کیا......؟'' نیہا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔

''تم اتنی ڈپریس اور ٹینس مت ہو۔ اسے میں سنبھال لوں گا۔ تم بس اب مجھ سے ملن کی تیاری کرو۔ قسم سے' تمہیں پانے کے لیے میں نے بڑے جتن کیے ہیں۔'' وارث ایک گہری سانس بھر کر

مسکرایا تھا۔

''لیکن وارث' یہ سب اتنا آسان نہیں ہے۔ کیا تم حقیقت میں اپنی بیوی کو چھوڑ دو گے؟'' نیہا مسلسل اندیشوں کے حصار میں تھی۔

''یہ میرا مسئلہ ہے' میں اسے سنبھال لوں گا مگر مجھے تم سے اس طرح کے جملوں اور باتوں کی توقع نہیں تھی۔ مجھے لگا تھا' تم مجھے دیکھتے ہی خوشی سے جھوم اٹھوگی اور کہوگی' بس اب اور انتظار نہیں کرسکتی' ہمیں کورٹ میرج کرلینی چاہیے۔'' وارث کے لہجے میں تناؤ آ گیا تھا۔

''ارے نہیں وارث' میں سچ' بہت خوش ہوں' مجھے خوشی ہے کہ تم نے ہماری محبت کا مان رکھا اور جو وعدے ہم نے کیے تھے' تم اسے نبھانے کے لیے آ گئے ہو۔'' نیہا کا لہجہ محبت سے معمور تھا۔

''شکر خدا کا' مجھے اپنی نیہا پہلے والے موڈ میں تو نظر آئی۔ چلو ٹھیک ہے' تم ہاسٹل کی راہ لو پھر کل لندن ٹاور پر ملتے ہیں۔'' وارث کھڑے ہوتے ہوئے بولا تھا۔

''ٹائم پر آ جانا۔'' نیہا کے لبوں کی تراش میں مسکراہٹ زندہ ہوئی۔

''میں مطلوبہ ٹائم سے پہلے آ جاؤں گا۔'' وارث اپنے مخصوص انداز میں مسکرایا اور پھر دونوں مخالف سمت اپنی اپنی راہ لے چکے تھے۔

•......•......•......•

''آپ کہاں رہ گئے تھے وارث؟ سچ' میں بہت پریشان ہوگئی تھی۔'' مہربانو کے لہجے میں سخت بے چارگی تھی۔

''کام ڈھونڈنے نکلا تھا' کوئی عیش کرنے نہیں گیا تھا۔ پتا ہے' لندن میں رہنا اتنا آسان نہیں اور تم میرے لیے پریشان مت ہوا کرو۔'' وارث سخت چڑے ہوئے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''آپ کے جو چچا یہاں مقیم ہیں' اُن سے کہیں کہ وہ کوئی کام دلوا دیں اور......'' مہربانو نے جملہ ادھورا چھوڑا تھا۔

''ارے' اُن کا یہی احسان ہے کہ انہوں نے ہمیں یہاں بلا لیا۔ خیر' مل جائے گی نوکری' تم پریشان مت ہو۔'' وارث اُس سے نظریں چراتے ہوئے اپنی جرابیں اتار کر جوتے میں رکھنے لگا۔

''وارث' جیسا آپ بہتر سمجھیں' آپ کو پتا ہے' آج دن میں میری طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی مگر چاہنے کے باوجود بھی آپ سے رابطہ نہیں ہوسکا۔ شاید آپ کہیں بزی تھے جبھی میرا فون ریسیو نہیں کیا؟'' مہربانو مجرمانہ انداز میں سر جھکاتے بولی۔

''خیر' میں ڈاکٹر کے پاس گئی تھی۔''

''کیا' ڈاکٹر کے پاس؟ مگر کیسے اور کس کے ساتھ؟ کہیں اکیلی تو نکل نہیں گئیں؟''

''نہیں وارث' ہماری پڑوسن ایک بہت اچھی خاتون ہیں' اُردو اسپیکنگ بھی ہیں' اُن کے ساتھ میں گئی تھی۔'' وہ شکوہ کناں لہجے میں بتا رہی تھی۔

''چلو پھر ٹھیک ہے' اب تم بھی آرام کرو اور مجھے بھی سونا ہے۔'' وارث بستر پر لیٹتے ہوئے بولا تھا۔

''وارث' مجھے آپ کو اور بھی کچھ بتانا ہے؟'' مہربانو کے چہرے پر معصومیت تھی اور آواز میں اشتیاق۔

''اب کیا ہے یار' سکون سے سونے دو۔'' وارث نے منہ بسورا اور کروٹ لے لی۔

''وارث' ایک خوش خبری ہے ہمارے لیے۔''

''خوشخبری' کیسی خوش خبری؟'' وارث بے ساختہ اٹھ کر بیٹھ گیا تو مہربانو جھینپ کر ہنس دی مگر شرم مانع رہی۔

''تم پہیلیاں کیوں بجھوا رہی ہو؟''

''خداوند تعالیٰ چاہتا ہے کہ ہمیں بہت جلد اولاد کا سکھ بھی مل جائے۔'' مہربانو کے لہجے میں شرم عیاں تھی۔

''اوہ نو...... کیا کہہ رہی ہو؟'' وارث کو شدید حیرت کا دھچکہ لگا تھا۔

''کیوں' کیا آپ خوش نہیں ہیں اس خبر سے؟''

''نہیں یار' یہ بات نہیں ہے' بس نئی جگہ آ کے بے ہیں اس لیے سو جھمیلے ہیں۔ اس میں ایک یہ نئی نئی آفت۔'' دونوں ہاتھوں سے سر تھامے وارث اب اٹھ کر بیٹھ چکا تھا۔

''آفت؟'' چھناکے سے کہیں اندر کچھ ٹوٹا تھا۔ مہربانو کو یقین نہیں ہو رہا تھا کہ اتنی اچھی خبر کے جواب میں اُسے اتنا براری ایکشن ملے گا۔

''ارے' میرا مطلب ہے' میں اس بات کے لیے ابھی ذہنی طور پر تیار نہیں تھا۔'' قدرے الجھتے ہوئے لہجے میں وہ مہربانو سے مخاطب تھا۔

''تو کوئی بات نہیں وارث' ابھی تو ٹائم ہے ناں' ہم نئے مہمان کے آنے تک یقیناً سیٹ ہو جائیں گے۔'' اُس کا لہجہ یقین سے آباد تھا۔

''ٹھیک ہے' اب تم آرام کرو' ہم اس ٹاپک پر صبح بات کرتے ہیں۔'' وارث تیزی سے کروٹ لیتے ہوئے بولا تھا۔

''وارث' آپ میں دن بدن کتنا بدلاؤ آتا جا رہا ہے۔'' وہ اب دکھی دل سے وارث کے برابر لیٹی آنسو بہا رہی تھی۔ نیند اُس سے کوسوں دور تھی۔ دوسری جانب وارث اس خوفناک حقیقت کے بارے میں سوچ رہا تھا جو آنے والے وقت میں اس کے پیر کی زنجیر بن سکتی تھی۔

•......•......•......•

''نیہا' میں چاہتا ہوں' جتنی جلدی ممکن ہو سکے' ہمیں کورٹ میرج کرلینی چاہیے۔'' وارث کے لہجے میں شدت تھی۔

''نہیں وارث' میں کورٹ میرج کے خلاف ہوں۔ میں پاکستان جا کر شادی کرنا چاہتی ہوں۔ اپنے گھر والوں کو اپنی خوشی میں شریک کرنا چاہتی ہوں۔'' نیہا جذباتی لہجے میں بولی تھی۔

''ارے یار' تم سمجھا کرو' مجھے جلدی ہے۔''

''ہاں تو پھر میرے ساتھ پاکستان چلیں' بس ایک مہینے کی تو بات ہے' وہاں سب سے ملاقات بھی ہو جائے گی اور شادی بھی۔'' نیہا کے لہجے میں حقیقی خوشی کے آثار تھے۔

''ہاں' بات تو صحیح ہے' اس بہانے مجھے اس مشکل سے چھٹکارا بھی مل جائے گا۔'' وارث بڑبڑایا۔

''بتائیں وارث' کیا آپ پاکستان چلنے کے لیے تیار ہیں؟ اپنی بیوی کو یہاں اکیلا چھوڑ سکتے ہیں ناں آپ؟'' نیہا بڑی خوش اسلوبی سے پوچھ رہی تھی۔

''ہاں یار' وہ بہت بولڈ لڑکی ہے' رہ لے گی تو پھر ٹھیک ہے' تم تیاری شروع کرو چلنے کی' ہم جتنی جلدی ہوسکا' یہاں سے نکل جائیں گے۔'' وہ یکدم کسی خیال سے خود کو آزاد کراتے ہوئے بولا تھا۔

''واہ وارث' سچ' آپ نے مجھے آج جو خوشی دی ہے' میں اسے کبھی فراموش نہیں کرسکتی۔''

''اچھا نیہا' مجھے کچھ ضروری کام ہیں اس لیے اب میں چلتا ہوں۔'' وارث آہستگی سے کہتا پلٹا تھا مگر دل پر ایک نادیدہ بوجھ تھا' ایک چور جذبہ تھا جو اسے بار بار الجھا رہا تھا مگر وہ بڑی سفاکی سے اسے روندتے ہوئے آگے بڑھ رہا تھا۔

•......•......•......•

وارث کو گئے ایک مہینہ ہونے کو آیا تھا۔ مہربانو امید سے تو تھی ہی' ساتھ ہی اُس کی نظریں دہلیز کا پیچھا نہیں چھوڑتی تھیں۔ وہ اس آس پر دن گزار رہی تھی کہ شاید کوئی آہٹ اسے وارث کی خبر دے۔

''میں تو سوچتی تھی' محبت زندگی میں بہار لے آتی ہے' سوکھی ٹہنیوں پر بھی نکھار لے آتی ہے۔

وارث' میں نے تم سے محبت کی ہے' کوئی گناہ تو نہیں جو تم محبت کی اس نشانی سے لاتعلقی برتتے ہوئے ہم دونوں کو اکیلا چھوڑ گئے ہو؟ یہ کیسی بہار لائے تھے تم میری زندگی میں جسے خود اپنے ہاتھوں سے خزاں کے سپرد کر گئے ہو؟ میں نے تو سنا تھا کہ محبت آباد کرتی ہے لیکن پھر میں کیوں ویران ہوگئی ہوں؟ وارث' میں تمہیں کہاں ڈھونڈوں؟ کس سے تمہارے بارے میں پوچھوں؟ عجیب امتحان میں تم نے مجھے ڈال دیا ہے۔ میری کچھ بھی سمجھ میں نہیں آرہا۔'' وہ اضطرابی انداز میں اپنے لب کاٹتی ہوئی خود سے مخاطب تھی۔

حقیقت کی خوفناکیاں اور بدصورتیاں یقیناً اس کے تعاقب میں تھیں۔ جس راستے کو وہ حسین اور اپنی منزل سمجھ کر نکلی تھی' وہ اسے اندھی کھائی میں لے آیا تھا مگر وہ اکیلی تو نہیں تھی جو حالات کے تھپیڑوں کا مقابلہ کرتی۔ اس کے ساتھ ایک دل اور دھڑک رہا تھا جو اس کے لیے قیمتی متاع سے کم نہیں تھا مگر اسے اس بات کا یقین ہوگیا تھا کہ وارث اسے دھوکہ دے کر جاچکا ہے مگر اس کا دل اسے تسلی دیتا رہتا کہ شاید ایک دن وارث لوٹ آئے۔ وارث نے اس کے ساتھ کیوں کیا ایسا' یہ تو سمجھنے سے وہ قاصر تھی مگر وارث کی دی ہوئی نشانی اس کے اندر جینے کی تمنا کو سیراب کررہی تھی۔

.......•.......•.......•

''کیسی طبیعت ہے اب تمہاری؟'' اس کی پڑوسن رمیزہ' مہربانو سے مخاطب تھی۔

''جی آنٹی' بس ٹھیک ہی ہوں۔'' وہ بمشکل اپنی سانس بحال کرتے ہوئے بولی۔

''خیریت ہے؟ کہاں رہتی ہو آج کل؟ میں فکرمند ہوں تمہارے لیے۔'' وہ شکل سے پریشان نظر آرہی تھیں۔

''آنٹی' ایک اسٹور میں سیلزگرل کی ملازمت مل گئی ہے مجھے' بس اسی لیے گھر لیٹ آتی ہوں۔'' ایک افسردہ سی آہ اس کے منہ سے نکلی تھی۔

''بچی......! تم اس حالت میں کام کررہی ہو؟ یہ کوئی اچھی بات نہیں۔ تمہارا شوہر پاکستان سے کیوں نہیں آرہا؟ سچ' بڑا ظالم ہے وہ' اپنی بیوی کو کوئی اس حال میں چھوڑ کر جاتا ہے؟'' رمیزہ کا انداز خفگی بھرا تھا۔

''کہہ تو آپ بالکل ٹھیک رہی ہیں لیکن شاید وہ اب کبھی نہیں آئے گا' وہ مجھے چھوڑ گیا ہے۔'' اس جملے کے ادا کرنے کے ساتھ ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔

''کیا کہہ رہی ہو تم؟'' رمیزہ کے تو اوسان خطا ہوگئے تھے۔

''آنٹی' جس دن میں نے انہیں یہ خوشخبری سنائی' اُسی دن سے وہ ناراض ہوکر چلے گئے ہیں۔''

''ارے' بڑا ہی بدبخت ہے وہ۔ اتنی پھول سی پیاری بچی کو اس حال میں چھوڑ کر چلا گیا۔ ایسا بھی کوئی کرتا ہے؟ تم مجھے اس کا نام اور مکمل ایڈریس دو اور ہاں' اس کی ایک عدد تصویر بھی دو' میں ذرا اس کے بارے میں معلومات کرتی ہوں۔'' رمیزہ کا لہجہ اَن دیکھی آگ کی مانند دہک رہا تھا۔

''جی آنٹی' شاید اُن کی محبت جاگ جائے' انہیں میرا خیال آجائے اور وہ مجھے دوبارہ اپنے ساتھ رکھ لیں؟'' مہربانو کے چہرے کا تناؤ اور لہجے کا کھنچاؤ اس بات کا ثبوت دے رہا تھا کہ وہ سخت تکلیف میں ہے۔

.......•.......•.......•

اُس روز پورے ایک ہفتے بعد رمیزہ' مہربانو سے ملنے آئی تھیں۔ ان کا چہرہ اترا ہوا تھا اور آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

''آنٹی' سب خیریت تو ہے ناں؟'' مہربانو کا دل خوف سے بھر گیا تھا۔

''وارث کی خبر لائی ہوں۔'' وہ آہستگی سے بولی تھیں۔

''کیسے ہیں وہ' ٹھیک تو ہیں ناں؟'' مہربانو کو اپنا دل ایک عجیب سی کیفیت میں ڈوبتا ابھرتا محسوس ہوا تھا۔

''بٹیا......! اب تم سے کیا چھپانا۔ ماشاء اللہ' تم بہت بہادر ہو۔''

''کیا بات ہے آنٹی' کیا نہیں چھپانا؟'' مہربانو کو اپنے بدن پر چیونٹیاں سی رینگتی محسوس ہونے لگیں۔

''اُس نے نیہا نامی لڑکی سے شادی کرلی ہے اور ان دنوں امریکہ میں مقیم ہے۔ نیہا نامی لڑکی یہیں لندن میں رہتی تھی۔ یہاں کی کسی یونیورسٹی کی طالبہ تھی وہ۔'' وہ شکستہ لہجے میں بتارہی تھیں۔

''اوہ......'' مہربانو اپنا دل تھام کر بیٹھ گئی۔ اس سے زیادہ اُس سے کچھ نہیں کہا گیا۔

''بٹیا! وہ تمہیں سیڑھی بنا کر یہاں تک پہنچا ہے۔ تمہاری علمی قابلیت سے اس نے فائدہ اٹھایا ہے' بس۔''

''اچھا......'' وہ پھر اتنا ہی کہہ کر خاموش ہوگئی۔

''میں نے تو بھئی' یہاں جو ایدھی کا دفتر ہے' وہاں تمہارے نام سے کمپلینٹ نوٹ کروادی ہے۔ دیکھنا تم' وہ اسے ڈھونڈ کر کتنی کڑی سزا دیں گے۔'' رمیزہ کے لہجے میں دکھ آباد تھا۔

''شکریہ آنٹی' آپ نے میرے لیے اتنا کیا مگر میرے پاس آپ کو دینے کے لیے کچھ نہیں ہے سوائے دُعاؤں کے۔'' مہربانو کا چہرہ اس بات کا غماز لگ رہا تھا کہ وہ بہت سارا رونے کے لیے بے قرار ہے۔''

.......•.......•.......•

وقت تیزی سے گزرتا جارہا تھا' مہربانو نے حالات سے سمجھوتہ کرلیا تھا مگر جب آج ایک ننھی سی کرن اس کی اندھیر زندگی میں روشنی کی کرن بن کر نمودار ہوئی تو وہ بے اختیار ہوگئی۔ اپنی گود میں ایک خوبصورت سی پری کو دیکھ کر وہ بہت روئی' خزاں کی زد میں آئی خشک ٹہنی اس ننھی کونپل کو پاکر ہری بھری ہونے کے لیے تیار تھی۔

بیٹی کی پیدائش کے بعد اس کے اندر ایک نیا عزم جنم لے رہا تھا۔ اسے اپنی بیٹی کی خاطر وارث کا بوجھ اپنے اوپر سے ہٹانا تھا۔ وہ اب اس شخص کا نام' چہرہ' خیال تک بھول جانا چاہتی تھی جس نے محض اپنی طلب کی خاطر اسے بے آسرا کردیا۔ حیرت ہے' لوگ اتنے ڈھونگی بھی ہوسکتے ہیں۔ بے ساختہ اس کی نگاہوں میں وارث کے ماں اور باپ کے چہرے آ گئے جن میں وہ اپنی حقیقی ماں اور باپ کو تلاش کیا کرتی تھی...... بچی کے رونے کی آواز نے اُس کے حصار کو توڑ دیا۔ مہربانو فرطِ محبت سے اُس کا ننھا سا ہاتھ تھپکنے لگی۔

''ارے مہربانو' میری بات غور سے سنو۔'' رمیزہ ہانپتی کانپتی اس کے قریب آئی تھیں۔

''ماشاء اللہ' تمہاری بیٹی بالکل تم پر گئی ہے۔'' وہ مسکراتے ہوئے گہرا سانس لے رہی تھیں۔

''سب خیریت تو ہے ناں؟ آپ نے تو میری جان نکال دی۔'' مہربانو نے حیرت سے انہیں دیکھا۔

''کیا تمہیں رجو کہہ کر کوئی پکارتا تھا؟'' اُن کا سوال غیر متوقع تھا۔

''جی' میری ماں اور باپ۔'' سارے جہاں کا درد مہربانو کے لہجے میں سمٹ آیا۔

''اور تمہارا کوئی بھائی بھی تھا؟''

''جی ہاں بالکل' میرا ایک بھائی تھا مگر آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟ آپ کیسے جانتی ہیں میرے ماضی کے بارے میں؟'' مہربانو کے لہجے میں حیرت ہی حیرت تھی۔

''کیا تمہیں اپنی ماں کا نام یاد ہے؟'' رمیزہ کا

لہجہ جلد بازی کا غماز تھا۔

''جہاں تک مجھے یاد ہے' ان کا نام حفیظ بیگم تھا اور محرم خان بھائی کا نام۔'' وہ دماغ پر زور دیتے ہوئے بولی تھی۔

''اوہ مبارک ہو مہر' تمہارے ماں باپ' بھائی مل گئے ہیں۔''

''کیا......؟ سچ......؟ کب اور کہاں ہیں وہ؟''

مہر بانو کا خوشی سے برا حال تھا۔ اُس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کیسے وہ اپنی خوشی کا اظہار کرے۔ ایک خوش رنگ کیفیت اُس کے چہرے پر پھیلی ہوئی تھی۔

''ارے بٹیا! میں نے ایدھی سینٹر والوں کو تمہاری اغوا ہوجانے والی کہانی سنائی تھی اور پھر تم کس طرح یہاں لائی گئیں اور اب جبکہ تمہارا شوہر تمہیں چھوڑ کر چلا گیا ہے تو میں نے ان سے اپیل کی کہ وہ تمہارے بارے میں کچھ کریں اور دیکھو' آج کا دن کتنی بڑی خوشی ہمارے لیے لایا ہے۔ یہاں ایدھی سینٹر میں ایک خاتون کام کرتی ہیں جو تمہاری فیملی کو بہت قریب سے جانتی ہیں۔ انہوں نے ہی تو مجھے بتایا کہ کس طرح ایک فیملی نے اپنی چار سالہ بیٹی کو کھودیا۔'' وہ تیز تیز لہجے میں بولے چلی جارہی تھیں۔

''مجھے ملنا ہے اپنے گھر والوں سے۔'' مہر بانو کے چہرے پر آئی خوشی دیدنی تھی۔

''تم اب پہلی فرصت میں پاکستان واپس جاؤ' یہاں کے آفس والے تمہیں وہاں کا ایڈریس دے دیں گے اور تم وہاں جاکر اُن سے مل لینا' یقیناً ان کی تو خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہے گا۔ انہوں نے اپنی ایک بیٹی کھوئی تھی اور اب انہیں بونس بھی ملے گا یعنی بیٹی اور نواسی دونوں۔'' رمیزہ بولے چلی جارہی تھیں مگر مہر کو ایسے لگا تھا جیسے کسی نے اس کے دل کی زمین کو ہلا دیا ہو۔

•......•......•......•

کہتے ہیں' دنیا گول ہے' مہر بانو بھی اپنی قسمت کے چکروں میں الجھی بڑی مشکلوں سے پاکستان واپس لوٹی۔ لانڈھی' مظفر آباد کالونی میں اُس کے والدین اُس کے منتظر تھے۔ وہ جب اُن سے ملی تو ایک خوشی کا سماں تھا۔ ماں باپ' بھائی کے نقش جوان مٹ ہوچکے تھے' وہ تصور کے پردے سے نکل کر سب اُس کے سامنے جیتے جاگتے کھڑے تھے۔

1993ء میں ایدھی ہوم کلفٹن میں لاوارث بچوں کے ہوم میں لائی گئی مہر بانو جس کا اصلی نام رضیہ ہے' وہ سترہ' اٹھارہ سال بعد اپنے والدین سے معجزانہ طور پر مل گئی ہے مگر قسمت کا ستم دیکھیے کہ آج مہر بانو اپنی بچی کو اُس کی باپ سے محروم دیکھ رہی ہے۔

مہر بانو ایدھی ہوم واپس آچکی ہے۔ اُس کا کہنا ہے کہ اُس کا اصل ننھیال یہی ہے۔ بلقیس ایدھی اُس کی نانی ہیں اور کبریٰ ایدھی اُس کی ماں۔ اُسے یہاں بچوں کو تعلیم دے کر سکون ملتا ہے اور ایک آس' امید' انتظار کا موسم بھی اُس کے اندر اپنی کیفیات بدلتا رہتا ہے کہ شاید ایک دن وارث اپنی اولاد کو دیکھنے' اسے اپنانے واپس لوٹ آئے۔

شہر کراچی میں جہاں قتل و غارت گری' اغوا' مار پیٹ' ٹارگٹ کلنگ جیسے واقعات ہوتے ہیں' وہیں اس شہر کے دامن میں درد دل رکھنے والوں کی بھی کمی نہیں۔ قارئین......! میرپور کے پہاڑوں سے اغوا کا سفر کرنے والی ایک معصوم بچی کو کراچی کے اُس شخص نے اپنی منزل پر پہنچا دیا جس نے اُس بچی کا ہاتھ پکڑ کر اُسے ایدھی سینٹر پہنچایا تھا اور اس شہر کی شان ستار ایدھی' بلقیس ایدھی' کبریٰ ایدھی اور فیصل ایدھی بھی ہیں جنہوں نے انسانی ہمدردی کے وہ چراغ روشن کیے جو ہمارے شہر کو روز اندھیروں میں تبدیل کرنے والوں کی خواہشوں کا خون کرنے کے لیے کافی ہیں اور تاریک اندھیرے میں روشنی وامید کی کرن ہیں۔





اقبال زمان



قاتل کون؟

رضا کا خیال

خود اپنے خوں میں نہائی ہوئی آنکھیں
قاتل کا اپنے پتہ پوچھ رہی ہیں

ایک بوڑھی عورت کے قتل کا معمہ جواب تک حل طلب ہے

یہ دنیا اب بہت تیزی سے انسانوں کا جنگل بنتی جارہی ہے اور اپنے مطلب' مفاد' غرض کی خاطر دولت کی ہوس کا شکار انسان اپنے جیسے دوسرے انسان کو بہت سفاکی اور درندگی سے شکار کررہا ہے۔ قاتل اور مقتول سے جڑی بے شمار کہانیاں سننے اور پڑھنے کے بعد یوں لگتا ہے جیسے انسان اب انسان نہیں رہا۔ ہر آتی صبح اور جاتی رات کے درمیان قتل کی بہیمانہ وارداتیں ہوتی ہیں اور جو قاتل پکڑے جاتے ہیں' ان کے اعترافات سن کر انسانیت اور رشتوں سے اعتبار ختم ہونے لگتا ہے لیکن دوسری طرف وہ قتل کی وارداتیں جن میں مقتول کی لاش تو ملتی ہے مگر قاتل کا کوئی پتہ نہیں ہوتا' اپنی جگہ ایک معمہ اور سوال ہیں جن کے پیچھے نجانے کیسے کیسے راز چھپے ہوئے ہیں!!

ابراہیم حیدری میں ساٹھ سالہ خاتون عالمی بی بی کا پراسرار قتل ایک معمہ بن گیا ہے۔ پولیس نے اس کو ڈکیتی کا واقعہ قرار دے دیا ہے۔ وقوعہ والے روز اُس خاتون نے ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ جانا تھا۔

اس قتل کے بارے میں لوگوں کو اُس وقت علم ہوا تھا جب صبح مقتولہ کا داماد ناشتہ لے کر اُس کے گھر آیا تھا۔

مقتولہ عالمی بی بی کا تعلق سندھ کے شہر لاڑکانہ سے تھا۔ پولیس کا کہنا ہے کہ یہ قتل ڈکیتی میں مزاحمت



مقتولہ عالمی بی بی

پر کی جانے والی کارروائی ہے۔ ابراہیم حیدری تھانے کی حدود میں گلہ دبا کر قتل ہونے والی ساٹھ سالہ عالمی خاتون زوجہ نبی بخش کو اُس دن کورٹ میں جانا تھا مگر اُس کے گھر کے تمام افراد اپنے ایک عزیز کی شادی

میں شرکت کے لیے لاڑکانہ گئے ہوئے تھے۔ مقتولہ سات بچوں کی ماں تھی جن میں پانچ بیٹیاں اور دو بیٹے شامل ہیں۔ مقتولہ کی بڑی بیٹی ماں کے گھر سے کچھ فاصلے پر رہائش پذیر ہے، جس کی شادی مقتولہ نے کچھ ماہ قبل ہی کی تھی اور اب وہ دوسری بیٹی کی شادی کی تیاریوں میں مصروف تھی۔ مقتولہ گزشتہ دس سال سے کراچی کے علاقے ابراہیم حیدری میں رہائش پذیر تھی۔ اس کے شوہر کا کچھ عرصے قبل انتقال ہوگیا تھا۔

مقتولہ کے داماد فیصل نے پولیس کو بتایا کہ میری شادی مقتولہ کی بیٹی سے کچھ ماہ قبل ہوئی ہے۔ میں اپنے کام کی مصروفیت کے باعث ساس کے گھر زیادہ آتا نہیں تھا۔ چند روز قبل میری سالیاں اور دیگر افرادِ خانہ ایک شادی میں شرکت کے لیے لاڑکانہ گئی ہوئی تھیں، اس وجہ سے میری اہلیہ روزانہ صبح ناشتہ بنا کر اپنی ماں کو بھیجا کرتی تھیں۔ یہ ناشتہ روز صبح میں اُس وقت لے کر جاتا تھا جب میری ساس صبح بیدار ہونے کے بعد ناشتے کے لیے فون کرتی تھی۔

اس واقعے والے روز میری ساس کی طرف سے کوئی فون نہیں آیا تھا تو میں نے ایک بچے کو بھیج کر پتہ کرایا تھا کہ کیا بات ہے، آج ناشتے کے لیے فون کیوں نہیں آیا؟ تو بچے نے واپس آ کر بتایا تھا کہ اُس نے دروازہ بجایا تھا مگر کسی نے دروازہ کھولا نہیں تو پھر میں نے خود جب جا کر دیکھا تو میری ساس کے گھر کا دروازہ اندر سے بند تھا۔ کچھ دیر مزید کھٹکھٹانے اور دروازہ نہ کھلنے کے بعد میں نے دروازہ توڑ دیا تھا اور پھر جب اوپری منزل کے کمرے کا دروازہ کھول کر دیکھا تھا تو بیڈ پر میری ساس کی لاش پڑی ہوئی تھی جبکہ گھر کا سب سامان بکھرا ہوا تھا۔ اس پر میں نے فوراً اپنی بیوی کو اطلاع دی تھی کہ اماں کے ساتھ یہ واقعہ ہوگیا ہے۔ اس



تفتیشی افسر راؤ ذوالفقار

دوران شور شرابے سے محلے کے لوگ بھی اپنے اپنے گھروں سے باہر نکل آئے تھے اور پھر پولیس کو بھی اطلاع دی گئی تھی جس پر پولیس نے آ کر لاش کا معائنہ اور دیگر کارروائی وغیرہ کرنے کے بعد اُسے پوسٹ مارٹم کے لیے اسپتال روانہ کیا تھا۔

پولیس نے جائے وقوعہ کا معائنہ کیا تو معلوم ہوا کہ مذکورہ خاتون دومنزلہ عمارت کی دوسری منزل پر مقیم تھی جبکہ نیچے مذکورہ خاتون کے بچے رہائش پذیر ہیں۔

اُس صبح مذکورہ خاتون کو ایک کیس کے سلسلے میں کورٹ جانا تھا لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ معلوم نہ ہو سکا کہ کورٹ میں کیس کس نوعیت کا ہے؟ امکان غالب ہے کہ خاتون کا قتل اس کیس سے ہی جڑا ہوا ہو اور واقعے کو ڈکیتی کا رنگ دیا جا رہا ہو تاکہ کسی کو شک بھی نہ ہو۔ خاتون کے اہلِ خانہ کے مطابق، مقتولہ کی کسی سے کوئی دشمنی بھی نہیں تھی تو پھر کوئی اُن کو کیوں مارے گا؟ اور پھر جس جگہ پر مقتولہ کا گھر واقع ہے، اس جگہ کوئی باہر کا شخص نہیں آ سکتا ہے

کیونکہ زیادہ تر گھر آپس میں ملے ہوئے ہیں۔ مزید یہ کہ اُس ایک دروازے کے علاوہ اور کوئی دوسرا راستہ بھی نہیں ہے جو کہ اندر سے بند تھا، یوں اگر کوئی اندر آیا تو وہ برابر والے گھر سے ہمارے گھر میں آ سکتا ہے۔ اس قتل میں پڑوس کے لوگ بھی شریک ہو سکتے ہیں لہٰذا اس کیس کی نوعیت اور مخالفین جن کے متعلق اسے اس روز کورٹ میں بیان دینے جانا تھا، اُن کو بھی زیرِ تفتیش لایا جائے۔

پولیس نے اس واقعہ کا مقدمہ نمبر 57/12 درج کرلیا ہے۔ مذکورہ کیس کے تفتیشی افسر راؤ ذوالفقار کا کہنا ہے کہ ''یہ قتل ڈکیتی کا شاخسانہ ہے اور ہو سکتا ہے کہ نامعلوم افراد کے علم میں ہو کہ مقتولہ گھر میں اکیلی ہے اور ملزمان نے گھر میں گھس کر جب واردات کرنا چاہی تو مزاحمت کرنے پر مقتولہ کو قتل کرنے کے بعد گھر سے رقم اور سونا لوٹ کر فرار ہو گئے۔'' انویسٹی گیشن آفیسر کے مطابق ابھی مزید تفتیش جاری ہے، بہت جلد ملزمان کا سراغ لگا لیا جائے گا۔

....

جس طرح قتل کی معمہ بن جانے والی ان وارداتوں کا سلسلہ بہت پرانا ہے، اسی طرح پولیس کا یہ بیان بھی کہ ملزمان کا بہت جلد سراغ لگا لیا جائے گا، قاتل بہت جلد گرفتار کر لیے جائیں گے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ ساٹھ سالہ مقتولہ عالمی بی بی کے قاتل کب گرفتار ہوتے ہیں؟ ہوتے بھی ہیں یا پھر ایسی بے شمار وارداتوں کی طرح اس قتل کی فائل بھی مصطفیٰ زیدی مرحوم کے اس شعر کی تصویر بن جائے گی؟

میں کس کے ہاتھ پہ اپنا لہو تلاش کروں؟
تمام شہر نے پہنے ہوئے ہیں دستانے

......☆☆......

سفر کہانی جیتے جاگتے دوڑتے بھاگتے، سچے مناظر کی آنکھوں دیکھی روداد

ارم زہرا

سفرِ زیارات

آتش کا خیال

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے
ہزارہا شجرِ سایہ دار راہ میں ہیں

ایران و عراق سے جڑے ایک روح پرور سفر کا دلکش احوال

آج کے تہذیبی انتشار اور اخلاقی بحران کے باعث انسان دین اور دینی اندازِ فکر سے جدا ہو کر رُوحانیت سے دور، مادیت کے جال میں الجھتا جا رہا ہے۔ رُوحانی انحطاط اور اخلاقی زوال کی ذمہ داری مذہبی معاملات اور عقائد سے لاعلمی پر ہے۔ آج کی نوجوان نسل الہام، وجدان اور معجزات کو تصوراتی اور فکری امیج قرار دیتی ہے۔ وہ علم کو علم نہیں بلکہ ذریعۂ حصولِ دولت اور حصولِ دولت ہی کو پرسکون زندگی اور دلی مسرت کا ماحصل سمجھتی ہے حالانکہ جو رُوحانی اور قلبی سکون، مذہبی مقامات پر جا کر ملتا ہے، وہ کسی دولت سے کم نہیں۔ یہ اُسی رُوحانی اور قلبی سکون کا ہی نتیجہ تھا کہ عمرہ اور شام کی زیارات کے بعد میرے دل میں امنگ جاگی کہ اب مجھے عراق اور ایران بھی جانا چاہیے اور پھر میری اس چھوٹی سی خواہش کی جڑیں آہستہ آہستہ اتنی پھیلیں کہ میرا دل ان کی گرفت میں آتا چلا گیا، لگن سچی تھی، سو شدید مشکلات اور دشواریوں کے باوجود سارے معاملات کیسے طے ہوتے چلے گئے، یہ خود مجھے بھی نہیں پتا چلا لیکن اب میرے گھر والوں کے پیشِ نظر سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ وہ مجھے اکیلے کیسے بھیجیں؟ اس مشکل کو حل کرنے کے لیے میں نے اپنی کولیگ مسز نصرت قمر زیدی کی خدمات حاصل کرنا چاہیں۔ یہ میری بہت پیاری اماں جانی بھی ہیں۔ مسلسل ایک ہفتے کی کوششوں اور رو رو کر میری جان ہلکان ہونے کے بعد بالآخر اماں جانی راضی ہو گئیں اور ساتھ ہی سفری اسباب بھی طے پا گئے۔

وہ دن میری زندگی کے یادگار دن تھے، خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا اور پھر اپنی اماں جانی کے ساتھ اتنے خوبصورت سفر پر جانا کیونکہ میری اماں میری بہترین دوست بھی ہیں۔ اُن کی کوئی بیٹی نہیں ہے

اس لیے انہوں نے مجھے اپنی بیٹی بنایا ہوا ہے، سو سفر کا لطف تو دوبالا ہونا تھا۔ ہمارے پاسپورٹ اور ویزا کے تمام مراحل سید حسن رضا قمر نے بخوبی اور احسن طریقے سے انجام دیئے اسی لیے کسی قسم کی بھاگ دوڑ نہیں کرنی پڑی۔ ابھی سامانِ سفر کی تیاری اپنے عروج پر تھی کہ روانگی سے دو روز قبل میرے موبائل پر کال آئی اور مجھے یہ بتایا گیا کہ عراقی ایمبیسی نے نصرت قمر زیدی کا ویزا جاری نہیں کیا جبکہ انہیں ایران کا ویزا مل چکا تھا۔ یہ بات ہم دونوں کے لیے ناقابلِ یقین تھی کہ چالیس افراد کے اس قافلے میں صرف اُن کا ہی نام کیوں رہ گیا؟ اس مرحلے پر قومی اخبار کے ایگزیکٹیو ایڈیٹر سید شاہد حسن صاحب کی کوششیں بھی بے سود ثابت ہوئیں، شاید اس لیے کہ اُن دنوں عراق کے حالات بہت خراب تھے اور پاکستان سے بائی روڈ عراق کے سفر پر پابندی لگی ہوئی تھی۔

دو دن بعد ہماری روانگی تھی۔ اماں اپنے نہ جانے کے دکھ پر آنسو بہا رہی تھیں اور میں یہ سوچ سوچ کر پریشان ہو رہی تھی کہ اتنا لمبا سفر میں اکیلے کیسے کر پاؤں گی؟ کہیں بابا مجھے نہ روک لیں؟ مگر میں آخر تک ڈٹی رہی کہ

سفر ہے شرط مسافر نواز بہتیرے

اور پھر جناب، 28 نومبر کی رات ڈیڑھ بجے میں اپنوں سے رخصت ہوئی۔ سب سے زیادہ اداس میرے پاپا (مرزا احمد لطیف) تھے۔ (ہمیشہ ناراض ہوتے ہیں پاپا کہہ دیتی ہو، پاپا کا کوئی نام نہیں ہے کیا؟) اور میری تینوں بہنیں انعم، بشریٰ اور صنوبر، بہنوئی وسیم سب ایئرپورٹ پر موجود تھے۔ اپنوں سے پہلی دفعہ دور ہو رہی تھی اس لیے میری اپنی حالت کچھ ٹھیک نہ تھی۔

کراچی ایئرپورٹ سے بورڈنگ اور امیگریشن پروسس کے بعد میں قطر ایئرلائن کے ذریعے دوہا پہنچی۔ دوہا ایئرپورٹ بہت ہی خوبصورت اور وسیع رقبے پر پھیلا ہے۔ یہاں اتنی کثیر تعداد میں جہاز ہیں کہ ایک جہاز ابھی fly کرتا ہی ہے کہ دوسرا Run way پر نظر آنے لگتا ہے۔ سادہ لفظوں میں اگر میں یہ کہوں کہ کراچی کی W-11 ایک جانے بھی نہیں پاتی کہ دوسری نظر آنے لگتی ہے۔ دوہا ٹائم پاکستانی ٹائم سے دو گھنٹے پیچھے ہے۔ یہاں چار گھنٹے stay کے بعد مجھے تہران پہنچنا ہے اور پورے چار گھنٹے میں نے ایئرپورٹ کا سروے ایسے کیا جیسے مجھے اسی مشن پر بھیجا گیا ہو اور پھر بالآخر ہم تہران کی جانب محوِ پرواز ہوئے۔ بادلوں کے جھنڈ کو چیرتا ہمارا جہاز اپنی منزل کی جانب رواں تھا۔ یہ نظارہ قدرت کا حسین شاہکار تھا۔ اس وقت مجھے اپنی دونوں بہنیں اور اماں جانی بہت یاد آ رہی تھیں۔ خوشی میں دکھ کی آمیزش نے میری آنکھیں نم کر دی تھیں مگر ایئر ہوسٹس کے بہت پیار سے سوئیٹ پیش کرنے پر میں بھی مسکرا دی تھی۔

تہران انٹرنیشنل ایئرپورٹ ایران کا سب سے بڑا ہوائی اڈہ ہے۔ یہ ایک اہم سیاحتی مرکز بھی ہے۔ ایران کا سب سے بڑا تعلیمی اور تجارتی مرکز تہران ہے۔ تہران سے بائی روڈ میں قم پہنچی جہاں Nagin Hotel میں میرا قیام تھا۔

قم ایک علمی، مذہبی اور رُوحانی شہر ہے۔ اگر اسے مذہبی مدارس کا مرکز کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ یہاں مختلف علماء کے قائم کردہ دینی ادارے، تعلیم و تدریس، تحقیق و تصنیف اور نشر و اشاعت میں مصروف ہیں۔ قم میں ہزاروں ملکی اور غیر ملکی طلباء دینی علوم کی تحصیل کر رہے ہیں۔ دنیا کا سب سے

زیادہ وزنی قرآن مجید بھی ''قم'' میں ہے۔ سب سے اہم اور مرکزی جگہ بی بی معصومہؑ قم کا روضہ ہے۔ آپؑ امام رضاؑ کی ہمشیرہ ہیں۔ آپؑ کے روضے کے دو مینار سونے کے ہیں اور باقی روضے پر چاندی چڑھائی گئی ہے۔ روضے کا رُوح پرور منظر دل بے اختیار کردیتا ہے۔ دخول سے لے کر خروج تک آپ اس کی خوبصورتی میں کھو جائیں گے۔ میں تین دن کے قیام میں یہاں جتنی دفعہ آئی' آبدیدہ سی' کھوئی کھوئی' بس دُعاؤں اور عبادات میں مشغول رہی۔ قم میں حضرت معصومہؑ' امام زادہ ابراہیمؑ' امام زادہ جعفرؑ کے مزارات کے علاوہ جامع مسجد' مدرسہ فیض' اعظم مسجد اور آستان عجائب گھر ہیں۔ ''کتاب خانہ علامہ اقبالؒ'' کے نام سے یہاں ایک لائبریری بھی موجود ہے۔

اب قم سے ہماری منزل عراق تھی۔ صالح آباد میں علی صالح کے روضۂ مبارک پر فجر کی نماز ادا کرتے ہی ہم عراق کے لیے روانہ ہوئے۔ عراق کے حالات خراب ہونے کے پیشِ نظر عراقی بارڈر پر بڑے ہی مسائل کا سامنا کرنا پڑا۔ بارڈر پر مظاہرے اور شیلنگ سے بھی نبرد آزما ہونا پڑا۔ یہ پانچ محرم جمعرات کا دن تھا۔ دنیا بھر سے یوم عاشورہ کے لیے لوگ جوق در جوق یہاں پہنچ رہے تھے جس کی وجہ سے بہت زیادہ مشکلات درپیش آئیں اور پھر مسلسل چار گھنٹوں کے صبر آزما امتحان کے بعد بالآخر ہم عراقی بارڈر کراس کر پائے۔ میرے لیے سب سے بڑا مشکل امر تھا اپنا سفری بیگ لے کر چلنا۔ ایک تو شدید سردی کے پیشِ نظر سوٹ کیس گرم کپڑوں سے بھرا تھا اس لیے اُس کا وزن بھی بہت بڑھ گیا تھا' ساتھ ہی اب یہ ذہنی کوفت بھی شروع ہو چکی تھی کہ اپنے پاسپورٹ کی حفاظت بھی کرنی ہے کیونکہ قافلۂ سالار حسن بھائی نے پاسپورٹ ہمارے حوالے کر دیئے تھے۔ گھر والوں نے پہلے ہی اتنا ڈرا کر روانہ کیا تھا کہ پاسپورٹ ہاتھ میں آتے ہی جسم پر فضول لرزہ طاری ہو گیا۔

عراق میں ہمارا قیام ہوٹل التمش میں تھا۔ یہ کربلا کی شارع السدرۃ پر واقع ہے۔ کربلا' عراق کے مشہور ترین مقامات میں سے ہے جس کی آبادی تقریباً ڈیڑھ لاکھ ہے۔ آداب معاشرت عربی ہے لیکن ایرانیوں اور ہندوستان و پاکستان کے باشندوں کی آمد و رفت کی کثرت سے فارسی پہلو بہ پہلو نمایاں ہے۔ اُردو بھی خاصی تعداد میں لوگ سمجھتے اور بولتے ہیں۔ یہاں مجھے مشہور پیشے صنعت و حرفت اور تجارت کے علاوہ خدائی نظر آئے جو اُن کا پشتی پیشہ ہے۔ تسبیح' جائے نماز اور کفن کی فروخت پر زیادہ توجہ دی جاتی ہے۔ بازار پُررونق اور دکانیں جدید طرز کی ہیں۔ قدم قدم پر پانی کے کولرز' ٹنکیاں' ہوٹل اور قہوہ خانے ملتے ہیں لیکن ہر گلی کے کارنر پر سیکورٹی کے پیشِ نظر چیکنگ کڑی ہے۔ کتاب' قلم' ادویات لے جانا ممنوع ہے۔ حرم میں داخل ہوتے وقت یہ ساری چیزیں اور موبائل و کیمرہ یا تو آپ اپنے ہوٹل میں رکھ کر نکلیں یا پھر ''امانت داری'' میں رکھوائیں۔ کربلا کی زمین ریگستانی ہے اور یہاں کا خرد رو پودا کھجور ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زائرین و سیاح اسے بطور تحفہ لے جاتے ہیں۔

کربلا پہنچ کر سب سے پہلے ہم روضۂ حضرت امام حسینؑ پر گئے۔ واقعۂ کربلا کے چند سال گزرنے کے بعد محمد بن ابراہیم بن مالک اشتر نے روضۂ اقدس کی بنیاد رکھی۔ روضۂ اقدس کے چاروں طرف پختہ اور بلند احاطہ ہے جس میں شمال و مغرب کی جانب دو عالیشان ''باب الساعت'' ہیں۔ ضریح

اقدس کی جالی نقرئی اور چھت طلائی ہے اور پورے روضے کے اندر آئینہ بندی کی وجہ سے سفید برقی روشنی انتہائی جاذبِ نظر ہے۔ حرم میں اتنا مجمع ہوتا ہے کہ نماز کی جگہ بمشکل ہی مل پاتی ہے اور اگر مل جائے تو کوئی چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ یہاں گنج شہیداں قبر حبیب ابنِ مظاہر' قتل گاہ' قبر ابراہیم کی زیارتیں ہیں۔ امام حسینؑ کے حرمِ اقدس کے چاروں طرف پختہ کمروں اور دالانوں کا سلسلہ ہے اور اس کے باہر صاف ستھری اور کشادہ سڑکیں ہیں۔ عمارت کے باہری حصے پر جلی حروف میں ''قرآنی آیات'' درج ہیں۔ یہاں سے کچھ فاصلے پر ''تلہ زینبیہ'' (یہ وہ مقام ہے جہاں بہن زینبؑ نے اپنے بھائی حضرت حسینؑ کو ذبح ہوتے دیکھا تھا۔) خیمہ گاہ یا خیام حسینی حرم سے تقریباً ڈیڑھ سو گز کے فاصلے پر ایک عمارت ہے جس میں ایک وسیع دروازہ ہے اور داخل ہوتے ہی دو رویہ نشاناتِ خیام نظر آتے ہیں۔ روضۂ حضرت عباسؑ' مقامِ قطع دستہائے حضرت عباسؑ (یہ وہ مقامات ہیں جہاں حضرت عباسؑ کے دائیں اور بائیں بازو شہید کیے گئے۔) مقامِ اسیرانِ کربلا' مقامِ شہر نضہ' مقامِ زعفر جن واقع ہیں۔ روضۂ حسینؑ میں ''باب الشہداء'' کے سامنے والی گلی میں مقامِ حضرت علیؑ ہے۔ ''باب السدرۃ'' کے سامنے مقامِ علی اصغر ہے اور یہیں مقامِ علی اکبر بھی ہے۔ ''باب السدرۃ'' کے سامنے والی سڑک جس نہر پر ختم ہوتی ہے' یہ مقامِ امام عصر ہے' یہیں نہر علقمہ بھی موجود ہے۔ اسے نہرِ حسینی یا نہر فرات بھی کہتے ہیں۔ نہرِ فرات کے دوسری جانب باغ امام جعفر صادقؑ ہے۔ روضۂ امام حسینؑ سے تقریباً چار میل دور روضۂ حضرت حر واقع ہے اور کربلا سے کاظمین جاتے ہوئے روضۂ حضرت عونؑ' جناب حمزہؑ' مقامِ جناب جون حبشی کے روضۂ مبارک ہیں۔ اسی طرح کربلا سے نجف جاتے ہوئے ''مقامِ امام علی یا رجعت شمس'' ہے۔ (یہ وہ مقام ہے جہاں حضرت علیؑ نے سورج پلٹایا تھا۔)

اب ہمارا رخ سامرہ کی جانب تھا۔ سامرہ شریف کا پرانا نام ''سرمن رائے'' ہے جو کاظمین سے تقریباً اسی میل دور ایک چھوٹا سا قصبہ ہے اور اسے اب سامرہ ہی کہا جاتا ہے۔ سامرہ میں اہم ترین روضۂ مبارک ہے جہاں ایک ہی ضریح میں امام علی نقیؑ' امام حسن عسکریؑ اور جناب نرجس خاتونؑ (والدۂ گرامی امام عصر) دفن ہیں جبکہ ان کی قبور سے متصل دوسری ضریح میں اسی روضۂ مبارک میں جناب حکیمہ خاتون دختر امام علی نقی بھی دفن ہیں۔ اسی روضۂ مطہرہ سے قریب صحن کے اندر سرداب (تہ خانہ) موجود ہے جس میں امام عصر عبادت فرماتے تھے۔

سامرہ اور کاظمین سے واپسی پر بغداد دیکھنے کا شوق بھی اپنے عروج پر تھا۔ بغداد' عراق کا دارالسلطنت ہے۔ یہ انتہائی خوبصورت اور قابلِ دید شہر ہے۔ بصرہ اور موصل یہاں کے دو بڑے شہر ہیں' باقی سب چھوٹے شہر ہیں۔ پُرشکوہ عمارات اور خوبصورت مساجد مسلمان بادشاہوں کی یادگار ہیں۔ مشہور مسلم حکمران خلیفہ ہارون رشید اور مامون رشید کے زمانے میں بغداد ایک ہزار ایک راتوں کا شہر مشہور تھا۔ یہاں مسلمانوں کی علمی و تہذیبی ترقی کے مجسمے اب بھی نظر آتے ہیں۔ بغداد کے وسط میں شیخ عبدالقادر جیلانیؒ جو سلسلۂ قادریہ کے بزرگ ہیں اور غوث پاکؒ کے نام سے مشہور ہیں' اُن کا مزار واقع ہے۔ امام ابوحنیفہؒ کے مزار کے ساتھ بہت بڑی مسجد ہے۔ بغداد کے چوک کا نام جہاں یہ مسجد واقع ہے

امامِ اعظمؒ کے نام سے منسوب ہے۔

اب ہماری روانگی نجفِ اشرف کی جانب تھی۔ یہ سفر بھی بائی روڈ تھا۔ نجف' عراق کے دوسرے شہروں میں سے ایک ہے۔ یہاں بھی عربی اور فارسی زبان بولی جاتی ہے۔ کھانے میں مرغ کی بہتات ہے۔ گوشت کے کباب ہر وقت ملتے ہیں۔ عام طور پر اسنیکس سپلائی سے قدرے موٹے سموسے مل جاتے ہیں۔ یہ ایک قسم کی ڈبل روٹی ہے۔ قہوہ تو ہر جگہ شوق و ذوق سے پیا جاتا ہے اور کیونکہ میں شدید سردیوں میں وہاں پہنچی تھی اس لیے یہاں بھی قہوہ ہر جگہ ملا مگر مجھے چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ ہمارا فندق (ہوٹل) حرم شریف سے کافی قریب تھا۔ روضۂ حضرت علیؑ کی خوبصورتی میں لفظوں میں بیان کرنے سے قاصر ہوں۔ یہ قابلِ دید ہے۔ یہاں صدقِ دل سے صرف ایک دُعا مانگی۔

''اے بابِ علم! میرے علم میں اضافہ فرما۔''

حرم سے تقریباً تین فرلانگ دور ''وادیٔ اسلام'' ہے۔ آج بھی یہاں لوگ ''دُرِ نجف'' تلاش کرتے ہیں اور اکثر خوش قسمتوں کو وہ مل بھی جاتا ہے۔ مسجد حنانہ اور دیگر قبور کی زیارتیں بھی یہاں موجود ہیں۔

نجفِ اشرف سے چھ میل دور کوفہ ہے۔ مسجدِ کوفہ اور مسجدِ سہلہ کی زیارت کے بعد اب ہماری روانگی تہران کے لیے تھی۔ تہران میں زیرِ زمین ریل بھی چلتی ہے جسے میٹرو کہتے ہیں اور اسی ٹرین کے ذریعے ہمارا قافلہ تہران پہنچ گیا۔ تہران سے 924 کلومیٹر کی مسافت پر مشہد واقع ہے۔ یہاں کی آبادی 40 لاکھ بتائی جاتی ہے۔ لفظ ''مشہد'' کا مطلب ہے ''شہیدوں کا مدفن'' یہ امام رضاؑ کے روضے کی نسبت سے ہے جو یہیں واقع ہے۔ یہ روضہ ایک وسیع علاقے میں واقع ہے اور اس کی عمارت حسن و جمال میں لاثانی ہے۔ اس کا خوبصورت گنبد میلوں دور سے نظر آتا ہے۔ دو خوبصورت مینار اور کئی بلند و بالا دروازے ہیں۔ ہر طرف کاشی کاری' مینا کاری اور رنگین نقش و نگار کے حیرت انگیز نمونے نظر آتے ہیں جن میں مختلف آیاتِ قرآنی اور قصائد نہایت پاکیزہ' خوشنما و عمدہ خطوط میں لکھے ہوئے ہیں۔ اس عمارت کے قریب ایک عظیم ''کتب خانہ'' ہے جس میں فقط نادر و نایاب قرآن مجید کے نسخوں ہی کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ اس کے علاوہ اس کتب خانے میں ایسی نادر کتابیں ہیں جن سے استفادہ کرنے کے لیے دنیا کے گوشے گوشے سے کتاب شناسی کے ماہرین آیا کرتے ہیں۔

مشہد میں ایک بزرگ شیخ محمد عارف مشہور بنام پیر پالان دوز (اونٹ کی پالان سینے والا بوڑھا) کا مقبرہ ہے۔ اس کے علاوہ روضے سے چار میل دور خواجہ ربیع (صحابی حضرت علی علیہ السلام) کی قبر کے علاوہ قبور علماء صالحین شیخ طوسیؒ' شیخ بہاءالدین عاملیؒ اور مولانا سید محمد علیہ الرحمہ بھی ہیں۔ شاہ قاچار' نادر شاہ کا مقبرہ' خیابانِ ناصری پر بہت خوبصورت ہے جس کی سیڑھیوں پر نادر شاہ کا مجسمہ گھوڑے پر سوار حملہ کرتے ہوئے دکھایا گیا ہے۔ مشہد سے بارہ میل دور ایک جدید قبرستان (بہشتِ رضا) کے نام سے ہے۔ تہران سے مشہد آتے ہوئے حرم امام خمینی واقع ہے۔ بہت بڑے رقبے پر پھیلا یہ حرم بہت خوبصورت منظر کشی پیش کرتا ہے اور اس بات کی بھی یاد دلاتا ہے کہ رہبر انقلاب امام خمینی نے 1961ء میں اسلامی تحریک کا آغاز کیا۔ یہاں سے ہم بی بی شہر بانو' شاہ عظیم اور پھر اس کے بعد نیشاپور پہنچے جہاں سب سے مقدس جگہ قدم گاہِ امام رضا ہے۔ یہاں سے ایک چشمہ جاری ہوا تھا جو آج تک ویسے ہی رواں ہے۔ چشمے کا پانی صاف اور ٹھنڈا ہے۔

مشہد کا مشہور بازار ''بازارِ بزرگ'' کے نام سے ہے۔ اسے بازارِ رضا بھی کہتے ہیں۔ یہ بازار کراچی کے طارق روڈ جیسا ہی ہے۔ یہاں ہر طرح کا سامان ملتا ہے۔ یہاں فوارہ چوک پر میں راستہ بھٹک گئی تھی اور خدا معلوم کہاں سے کہاں نکل گئی۔ سخت سردی کے پیشِ نظر ہاتھ اور پاؤں شل ہو رہے تھے پھر ٹیکسی کی خدمات حاصل کر کے اپنے ہوٹل پہنچی تو اندازہ ہوا کہ ایک جیسی طرز کی دکانوں اور گلیوں کے باعث میں ایک ہی جگہ پہ گھوم رہی تھی۔ یہاں ہر طرح کے کھانے پینے کا سامان باآسانی ملتا ہے۔ ایران کے تمام مقامات پر چلو کباب روٹی اور چائے گلستان کا شہرہ اور چرچا ہے۔ یہ چلو کباب یا چلو مرغ ہمارے یہاں کے ذائقہ سے مختلف ہے۔ زعفران کا استعمال بھی یہاں بہت زیادہ ہوتا ہے اور ان کھانوں کے ساتھ بھنا ٹماٹر اور کھیرا' سرکے میں ڈوبی ہری مرچ وغیرہ ایرانی رغبت سے کھاتے ہیں۔ یہاں کے ڈرائی فروٹ ہوں یا فریش فروٹ' اُن کو دیکھ کر آپ کی طبیعت ضرور للچائے گی اور ہاں' ایک بات اور اگر آپ ایران آئیں اور یہاں کی آئس کریم نہ کھائیں تو زیادتی ہوگی۔ ایرانی سکہ ریال ہے۔ لین دین تومان میں ہوتا ہے۔ ایک تومان میں دس ریال ہوتے ہیں۔ پاکستانی کرنسی جب ایرانی کرنسی میں تبدیل ہوتی ہے تو آپ خود کو بہت امیر سمجھنے لگتے ہیں۔ ایسا میں نے بھی سنا تھا لیکن واقعی میں وہاں جا کر امیر ہو گئی تھی مگر جب آپ شاپنگ کے لیے نکلیں اور چھوٹی سی چیز کے بھی ہزاروں میں دام دیکھیں تو اندازہ ہوگا کہ کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ ایرانی سوغات میں سوہن حلوہ دوستوں کے لیے بہترین تحفہ ہے۔

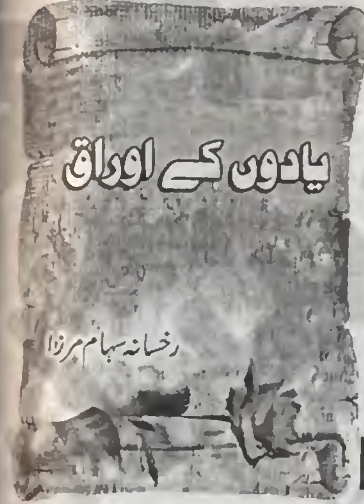
مجھے وقت گزرنے کا احساس ہی نہیں ہوا اور ایک بار پھر ہمارا قافلہ ''قم'' میں روضہ بی بی معصومہ قم اور جمکران میں مسجد جمکران کی زیارت سے فیض یاب ہوتا ہوا تہران ایئرپورٹ تک پہنچا۔ یہاں سے دوہا اور دوہا سے کراچی ہماری کنیکٹنگ فلائٹ تھی۔ واپسی پر پورے راستے میں یہی سوچتی رہی کہ 1965ء اور 1971ء کی جنگوں میں ایران نے پاکستان کا ساتھ دیا جس کو پاکستان ہمیشہ قدر کی نگاہ سے دیکھتا رہا ہے۔ 2000ء میں پاکستان کے سابق صدر پرویز مشرف نے ایران کا دورہ کیا اور ایران سے پاکستان کے ذریعے بھارت تک گیس پائپ لائن کے پروگرام میں بھرپور تعاون کی یقین دہانی کرائی۔ غرض پاکستان اور ایران کے تعلقات بہت ہی دوستانہ و قدیم ہیں اور یہ دونوں اسلامی اور اتحادی ملک اپنے دشمنوں' خاص طور پر اسلام دشمنوں سے کبھی مرعوب نہیں ہوتے۔ کاش کہ پاکستان' ترکی' ایران اور افغانستان متحدہ بلاک بن جائیں تو ہم اپنی مخالف قوتوں کا مقابلہ باآسانی کر سکتے ہیں۔

کراچی ایئرپورٹ پر پہنچتے ہی خیال آیا کہ واقعی اپنی زمین' اپنی دھرتی ماں کا درجہ رکھتی ہے جہاں آ کر خوشی محسوس ہوتی ہے۔ ایئرپورٹ پر پاپا' تینوں بہنیں انعم' بشریٰ اور صنوبر کے ساتھ استادِ محترم سید شاہد حسن کو دیکھ کر دہری خوشی ہوئی اور سفر کی ساری تھکان منٹوں میں اتر گئی۔ اس سفر سے مجھے جو رُوحانی خوشی و قلبی سکون ملا اور زیاراتِ مقاماتِ مقدسہ کی جو سعادت حاصل ہوئی' وہ میرے لیے باعثِ افتخار ہے۔



رخسانہ سہام مرزا

یادوں کے اوراق



حجاب عباسی کا خیال

گزرتا وقت بدلتا ہے خال و خد سب کے
یہ ساری عمر کا سامان تھوڑی ہوتا ہے

ماضی کی خوش رنگ یادوں سے جڑی رخسانہ سہام مرزا کی ہفت رنگ آپ بیتی

اپنے پیروں پر گھر سے جانے والے میرے پیارے ابا ایمبولینس میں دوسروں کے سہارے گھر واپس آگئے تھے‘ بس آگے کیا ذکر کروں‘ کس طرح دل غم و ملال کا گھر بن گیا‘ میرے آنسو تو سب نے دیکھ لیے تھے لیکن اندر کا حال تو بس رب ہی جانتا تھا۔ سب نے بہت تسلی دی‘ سمجھایا کہ ہم جن کو اپنا بنائے بیٹھے تھے‘ وہ تو اللہ کی امانت تھی‘ اس نے اپنی امانت واپس لے لی...... اللہ‘ ابا کو ہمیشہ اپنی ٹھنڈی چھاؤں میں رکھے‘ اُن کو گرمی بہت لگتی تھی۔

ابا کے کمرے میں ٹنگا کوٹ ہماری بے بسی کا تماشہ دیکھ رہا تھا‘ ایش ٹرے میں موجود ٹھنڈی راکھ اور بجھے ہوئے سگریٹ کے دو ٹکڑے پڑے تھے۔ میں جانتی تھی‘ اب ابا اس کمرے میں کبھی نہیں آئیں گے‘ یہ کوٹ یونہی ٹنگا رہے گا۔

جانے والے چلے جاتے ہیں‘ زندگی نہیں رکتی‘ چلتی رہتی ہے۔ ابا کے زندگی سے دور جانے والے اُن دو دنوں میں مجھے سہام نظر نہیں آئے تھے یا انہوں نے میرے سامنے آنا نہیں چاہا تھا؟ مجھے نہیں معلوم۔ خیر‘ تیسرے دن شام میں سہام‘ اماں کے ساتھ میرے پاس آئے تھے تو پھوپی نے مجھے کہا تھا۔ ”بٹیا......! اب اپنے گھر جاؤ۔“

اُن کا یہ کہنا ٹھیک تھا مگر جواباً اماں نے کہا تھا۔ ”دلہن......! تم رکنا چاہو تو رکو۔“ (وہ مجھے دلہن کہتی تھیں۔) مگر میں نے سوچا تھا‘ اَب یہاں کیا ہے؟ اور میں سہام کے ساتھ اپنے گھر آ گئی تھی۔ گھر آ کر میں کمرے میں خالی ذہن کے ساتھ بیٹھی تھی‘ اماں میرے پاس آ کر بیٹھ گئی تھیں۔ وہ بھی چپ تھیں اور میں بھی...... بس ہمارے درمیان خاموشی بول رہی تھی۔ اماں تھوڑی دیر بیٹھ کر چلی گئی تھیں پھر سہام اندر آئے تھے تو وہ بھی خاموش بیٹھ گئے تھے۔ بس مجھے ایک دم ہی رونا آ گیا تھا اور میں نے ٹپکتے آنسوؤں کے ساتھ کہا تھا۔

”دیکھا آپ نے‘ میں کہہ رہی تھی ناں‘ کچھ ہونے والا ہے؟“

سہام نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا تھا۔ ”رخسانہ......! میں تمہارا شوہر ہوں‘ دوست ہوں‘ میں باپ کی کمی تو پوری نہیں کر سکتا مگر کوشش کروں گا‘ تمہارے اس دکھ کو بٹا سکوں۔“

میں روتے ہوئے ہی بولی تھی۔ ”سہام......! تم نے میری اُس بات ”ابا نے گلے لگا کر پیار کیا۔“ کا بہت مذاق اڑایا تھا ناں! لیکن وہ ایسے پیار نہیں کرتے تھے جیسے اُس دن انہوں نے کرسی سے کھڑے ہو کر‘ مجھے اپنے گلے‘ سینے سے لگایا تھا‘ یہ اُن کا آخری والہانہ پیار تھا‘ شاید اُن کے دل کو اس بات کی خبر ہو گئی تھی کہ میں بہت جلد اُن کے پیار سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محروم ہونے والی ہوں۔“ سہام میری یہ بات سننے کے بعد ناصرف مجھے تسلی دیتے رہے تھے‘ ساتھ ہی میرے ابا کے اخلاق اور کردار کی تعریف بھی کرتے رہے تھے۔

جانے والے کبھی لوٹ کر نہیں آتے مگر وہ جوانی اچھائیوں کا ورثہ چھوڑ جاتے ہیں‘ وہ ہمارے دل کو ہمیشہ اُن کی یادوں سے شاد و آباد رکھتا ہے۔ میرے ابا لینڈ کسٹمز میں بہت اچھی پوسٹ پر تھے لیکن انہوں نے ایمان داری کا دامن کبھی ہاتھ سے نہ چھوڑا تھا۔ اُن کے دامنِ رزق پر کبھی حرام کا کوئی معمولی سا بھی دھبہ نہیں لگا تھا۔ حلال کی کمائی سے بنائی گئیں میری امی کے ہاتھ میں صرف سونے کی چھ چوڑیاں تھیں جو اُن کی وصیت کے مطابق ہم تینوں بچوں میں تقسیم ہو گئیں۔ وہ میرے ہاتھ میں آج بھی موجود ہیں جو مجھے امی اور ابا کی یاد کے ساتھ یہ بھی یقین دلاتی ہیں کہ میرے رزقِ حلال کمانے والے ابا وہاں اچھے درجے پر فائز ہوں گے۔

میرے ابا سگریٹ پیتے تھے‘ اُن کے اُس اکلوتے کوٹ میں سگریٹ کی خوشبو بسی ہوتی تھی اور میں اُس کوٹ سے لپٹ کر ابا کی غیر موجودگی میں بھی اُن کی قربت محسوس کیا کرتی تھی۔ سہام بھی ابا کی طرح سگریٹ پیتے تھے اور مجھے سہام کی الماری میں اُن کے سوٹوں میں سے بھی وہی خوشبو آتی تھی...... جب سہام مجھ سے کہتے تھے کہ میرا سوٹ نکال کر مشتاق کو استری کے لیے دے دو تو میں الماری کھولتے ہی اُن کے سوٹ سے چند لمحے لپٹ کر وہی مخصوص خوشبو اپنے دل اور ذہن میں اتارتی تھی۔ ایک روز میں سہام کی الماری کھولے اُن کے سوٹ سے آنے والی وہی مخصوص خوشبو محسوس کر رہی تھی کہ میں نے دیکھا تھا کہ اماں اور سہام کمرے کے دروازے پر کھڑے ہیں۔ میں گھبرا گئی تھی‘ سہام‘ اماں سے کہہ رہے تھے۔

”دیکھا اماں......! یہ مجھ سے کتنی محبت کرتی ہے۔“ ...... میں چپ رہی تھی‘ میرے پاس وہ الفاظ ہی نہیں تھے جن کے ذریعے میں اپنا یہ سگریٹ کی خوشبو سونگھنے والا مسئلہ انہیں سمجھا سکتی لیکن یہ سچ ہے کہ سہام سے مجھے دہری محبت تھی مگر یہ بات میں انہیں کبھی بتا نہ سکی۔

اماں کو تو زیادہ بات کرنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ چائے بہت شوق سے پیتی تھیں۔ دن بھر میں میری اُن سے صرف اتنی بات ہوتی تھی۔

”دلہن......! چائے پیو گی؟“ حالانکہ میں چائے کی شوقین نہیں تھی مگر اُن کے پوچھنے پر میرے منہ سے نہ کبھی نہیں نکلا تھا‘ سو میں دن میں دو تین دفعہ اُن کے ساتھ بیٹھ کر چائے پی لیتی تھی۔ اماں چائے ہمیشہ خود بناتی تھیں‘ شاید اس لیے بھی کہ میں بہت کاہل تھی۔ میں نے اور بے شمار نئی نویلی بیویوں کی طرح تیار ہو کر کبھی سہام کا انتظار نہیں کیا تھا بلکہ اُن کے

آنے کے اوقات میں' میں اکثر سو رہی ہوتی تھی۔ اماں کو اپنے بیٹے کی آمد کا بہت انتظار رہتا تھا۔ اُن کو کھڑکی سے سہام کی گاڑی نظر آ جاتی تھی۔ وہ جلدی سے کمرے میں آ کر مجھے جگا دیتی تھیں اور میں چھلانگ مار کر باتھ روم میں گھس جاتی تھی اور سہام سمجھتے تھے کہ میں اُن کے لیے تیار ہو رہی ہوں کہ یہ اُن کی محبت تھی۔

ایک دن مجھے کاہلی چھوڑ کر گھر کے کام کرنے' گھریلو بننے کا شوق چرایا تھا۔ میں نے کچھ روز پہلے کسی کتاب میں مرچوں کا اچار بنانے کی ترکیب پڑھی تھی' سو اچار بنانے کے خیال سے میں نے مشتاق سے آدھا کلو ہری مرچیں اور سرکہ منگوایا تھا اور پھر میں مرچیں کاٹنے بیٹھ گئی تھی۔ اب اماں بار بار کہتیں۔ ''دلہن......! تمہارے ہاتھوں میں مرچیں لگ جائیں گی۔'' مگر مجھے تو کسی کی بات نہ سننے کی پرانی عادت تھی' بڑی لاپروائی سے کہہ دیا تھا۔

''اماں......! کچھ نہیں ہوتا۔'' لیکن ہوا وہی تھا جو وہ کہہ رہی تھیں' میرے ہاتھوں میں ایسی مرچیں لگی تھیں کہ میں برف کے پانی میں ہاتھ ڈال کر بیٹھ گئی تھی۔ اَب ایک طرف اماں بار بار کہتیں۔ ''میں نے منع کیا تھا ناں!'' دوسری طرف مشتاق مجھے دیکھ کر ہنسے جا رہا تھا...... اور پھر اللہ کا کرنا یہ ہوا تھا کہ سہام جلدی آ گئے تھے' انہوں نے میرا یہ حال جو دیکھا تو اماں سے بولے تھے۔ ''آپ نے اسے منع نہیں کیا' یہ تو بے وقوف ہے' کام کرنے کا شوق پیدا ہوا تو محترمہ مرچیں لے کر بیٹھ گئیں۔''

سہام مجھے اپنے دوست ڈاکٹر علی کے پاس لے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے کوئی کریم لگانے کو دی تھی۔ وہ بھی مجھ پر ہنس رہے تھے اور پوچھ رہے تھے۔ ''ارے بی بی......! مرچیں کیوں کاٹیں؟''

گھر آ کر کافی دیر بعد مجھے آرام آیا تھا۔ میں نے سہام سے پوچھا تھا۔ ''آپ کو اس بات کی کیسے خبر ہو گئی؟''

جواب میں وہ نہایت غصے سے بولے تھے۔ ''آئندہ ایسی الٹی سیدھی حرکتیں مت کرنا۔'' اور پھر اماں سے کہا تھا۔ ''یہ باورچی خانے میں جائے تو نظر رکھیے گا۔'' ان باتوں کے دوران میں اماں مجھے خاموش نظروں سے دیکھتی رہی تھیں جبکہ مشتاق یوں مسکرا رہا تھا جیسے کہہ رہا ہو۔ 'بڑی گھرداری کرنے چلی تھیں۔' اور پھر یہ ہوا تھا کہ کچھ روز بعد ہی میں ایک نئے مسئلے میں گرفتار ہو گئی تھی۔

گھر میں کھانا تو مشتاق بناتا تھا لیکن دال چاول وغیرہ اماں ہی چُنا کرتی تھیں۔ میں نے یہ کام کبھی کیا ہی نہیں تھا' ایک دن میں اماں کے منع کرنے کے باوجود اُن کے ساتھ چاول چُننے بیٹھ گئی تھی۔ وہ چاول تو چُن گئے لیکن تھوڑی دیر میں ہی میری آنکھیں سوجنے لگی تھیں' میں نے جلدی جلدی' بار بار ہاتھ منہ دھویا تھا مگر آنکھوں نے ہار نہیں مانی تھی' وہ سوجتی ہی چلی گئی تھیں۔ اتنے میں اماں میرے لیے چائے لے کر آئی تھیں اور اُن کی نظر میری آنکھوں پر پڑی تھی تو وہ بے ساختہ جیسے چیخی تھیں۔

''ارے دلہن......! یہ کیا ہوا؟''

میں نے نہایت ہی دھیمی آواز میں کہا تھا۔

''اماں......! پتہ نہیں کیا ہوا؟'' وہ تو چائے وائے بھول کر سر پکڑ کے بیٹھ گئی تھیں۔

اُس وقت آنکھوں کی سوجن سے میری جو شکل ہو گئی تھی' وہ میں جانتی ہوں یا اماں! وہ نہایت ہی پریشانی سے بولی تھیں۔

''دلہن......! خدا کے واسطے' تم کسی چیز' کسی کام کو بھی مت چھوا کرو' اب بچہ آئے گا تو کیا کہے گا؟ میں اسے کیا جواب دوں گی؟'' اور پھر بہر حال وہی ہوا تھا جس کا ڈر اماں کو تھا۔

سہام پانچ بجے کے قریب گھر آئے تھے۔ اس دوران میں نے بہت کوشش کی تھی کہ کسی صورت میری آنکھوں کی سوجن گرم پانی' نمک سے کم ہو جائے' آنکھوں کو گرم پانی سے دھویا تھا' نمک سے سینکا بھی تھا کیونکہ اماں کی پریشانی مجھ سے دیکھی نہیں جا رہی تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ بہت کوشش کے باوجود سوجن ختم نہیں ہوئی تھی' کچھ کم ضرور ہو گئی تھی۔ وہ مشتاق کا بچہ مسلسل طنزیہ مسکراہٹ بکھیرتا رہا تھا اور اماں بس مجھ سے یہی کہتی رہی تھیں۔

''دلہن......! آرام کرو۔'' اُن کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے کھانا بھی اپنے ہاتھ سے کھلاتیں۔ بار بار یہ پوچھتی رہی تھیں۔ ''دلہن......! یہ پہلی بار ہوا ہے؟'' اور واقعی ایسا پہلی بار ہوا تھا۔ ''دلہن......! تم نے چاول کیوں چُنے؟''

''ارے اماں......! چھوڑیں' آپ کیوں پریشان ہو رہی ہیں؟ میں کہہ دوں گی' کسی کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔''

سہام آئے تھے تو میری حالت دیکھتے ہی سوال کیا تھا۔ ''کیا آج آنکھوں سے مرچیں کاٹی تھیں؟''

میں نے کہا تھا۔ ''مجھے لگتا ہے' کسی زہریلی چیونٹی نے کاٹ لیا ہے۔'' اور دل ہی دل میں خوش بھی ہو گئی تھی کہ میں نے معاملہ سنبھال لیا ہے مگر چائے پیتے ہوئے اماں سے رہا نہیں گیا تھا' شاید اُن کو مجھ پر اعتبار نہیں تھا یا پھر یہ خوف تھا کہ مشتاق' سہام کو سب کچھ بتا دے گا' سو بولی تھیں۔

''بچے......! دلہن نے چاول چُنے تھے' اُس کے بعد یہ ہو گیا۔'' مشتاق تو منتظر تھا کہ اَب صاحب' بیگم صاحبہ کو ڈانٹیں گے مگر سہام نے مشتاق کو بلا کر ڈانٹا تھا۔ ''تم نے چاول چُننے کیوں دیئے؟''

وہ نہایت مکاری سے منہ بسورتے ہوئے بولا تھا۔ ''صاحب! اماں روز چاول چُنتی ہیں' آج بیگم صاحب بھی ان کے ساتھ شوق میں چُننے بیٹھ گئی تھیں۔''

سہام نے فوراً ہی اماں سے کہا تھا۔ ''خدا کے لیے' آپ اس کو کچھ کام نہ کرنے دیں۔'' آپ یقین کریں' شرمندگی کے مارے میرے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا تھا کہ جھوٹ بھی بولا تھا اور بات بھی نہیں بنی تھی۔

سہام کا موڈ بہت خراب تھا' وہ مجھے ایک بار پھر ڈاکٹر علی کے پاس لے گئے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے دیکھتے ہی مسکرا کر سوال کیا تھا۔ ''بھابھی......! یہ آپ اپنے ساتھ کیا کر لیتی ہیں؟''

میرے بجائے سہام نے فوراً ہی جواب دیا تھا۔ ''ڈاکٹر صاحب! انہیں چاول چُننے کا شوق ہوا تھا۔'' ڈاکٹر صاحب یہ سن کر زور سے ہنس پڑے تھے اور میں شرم سے پانی پانی ہو گئی تھی اور یہ سوچا تھا کہ مرچیں کاٹیں تو مرچیں لگ گئیں' چاول چُنے تو آنکھیں سوج گئیں۔ یا اللہ! اگر ہمارا یہ حشر ہے تو...... (بہادر شاہ ظفر سے معذرت کے ساتھ)

یا افسر مجھے شاہانہ بنایا ہوتا
یا میرا مزاج فقیرانہ بنایا ہوتا

ڈاکٹر صاحب نے بتایا تھا کہ اکثر لوگوں کو کچے چاولوں سے الرجی ہوتی ہے کیونکہ اُن میں تھوڑی ڈسٹ ہوتی ہے۔

''یا اللہ! یہ سب کچھ میرے لیے ہی ہے؟'' خیر' دوا لے کر واپس آئی تو اماں کی پریشانی کچھ کم ہوئی تھی اور پھر تو میرے اوپر ہر کام کی پابندی لگ گئی تھی۔ اُس روز مجھے امیر حسن بہت یاد آئے تھے کہ اگر میں نے کچھ وقت اُن کو دے دیا ہوتا تو شاید یہ مشکل نہ پڑتی...... اور پھر تو یہ ہوتا کہ اماں مجھے باورچی خانے کی طرف قدم بڑھاتی دیکھتیں تو فوراً پیچھے آتیں۔ ''دلہن......! کیا کر رہی ہو؟ کہاں جا

رہی ہو؟" اور اماں کے اس سوال پر مجھے ہنسی اور رونا ساتھ ساتھ آنے لگتا تھا۔ اس صورتِ حال میں ہمارے خانساماں مشتاق کے عیش تھے' وہ مجھ سے پہلے بھی گھر کا بے تاج بادشاہ تھا اور بعد میں بھی رہا۔

اُن دنوں اماں جب کچھ دن کے لیے بڑے بھائی صاحب کے یہاں چلی جاتی تھیں تو میں اکیلی ہو جاتی تھی۔ ایسے میں سہام صبح آفس جاتے ہوئے مجھے امی کے گھر چھوڑ دیتے اور واپسی پر لے لیتے تھے۔ میرے خاندان کے سب لوگ سہام کو بہت پسند کرتے تھے۔ وہ جو عزت واحترام دیتے تھے' میں نے کسی اور کو اتنا خیال کرنے والا نہیں دیکھا۔

•......•......•

زندگی کی کتاب کے اوراق پلٹتے گئے اور میری گود میں ایک ننھی منی جان آ گئی۔ میری بڑی بیٹی رعنا جب چار مہینے کی ہوئی تھی تو میں شدید بیمار ہو گئی۔ کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ ہوا کیا ہے؟ میری بھوک بالکل ختم ہو گئی تھی اور میں اتنی کمزور ہو گئی تھی کہ رعنا کو امی سنبھالنے لگی تھیں۔ میں سال بھر تک اس حال میں رہی تھی۔ سہام کی کمپنی نے ڈاکٹرز کا ایک پینل بنا دیا تھا جو میرا علاج کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس دوران میں اماں کی کوشش ہر وقت یہی ہوتی کہ میں کچھ کھانے لگوں۔ اماں میرے سرہانے بیٹھ کر سر سہلاتیں' پیار سے پوچھتی رہتیں کہ کچھ کھانے کا دل ہو تو بولو مگر مسئلہ یہ تھا کہ کھانے کا نام آتے ہی میری عجیب کیفیت ہو جاتی تھی' مجھے ڈرپس لگتی رہیں' کچھ سوپ اور دودھ کی شکل میں حلق سے اتارتی رہی تھی۔

ایک دن اماں میرے سرہانے بیٹھی تھیں۔ سہام آفس سے آئے تو دیکھا' وہ رو رہی ہیں۔ انہوں نے پوچھا۔ "آپ کیوں رو رہی ہیں؟"

اماں روتے ہوئے بولی تھیں۔ "اگر اس کو کچھ ہو گیا تو روزِ حشر اس کا باپ میرا دامن پکڑے گا۔"

سہام نے کہا تھا۔ "اماں......! ایسے تو اس کو کچھ نہیں ہو گا لیکن اگر آپ اس طرح اس کے سرہانے بیٹھ کر روتی رہیں تو یہ ضرور مر جائے گی۔"

سہام اُس وقت نیو جوبلی انشورنس کمپنی میں تھے۔ کمپنی والوں نے انہیں مشورہ دیا تھا کہ پندرہ یا بیس دن کے لیے اپنی بیگم کو کسی Hill اسٹیشن پر لے جاؤ۔ جگہ بدلے گی تو فرق پڑے گا۔ یوں سہام اور میں مری چلے گئے تھے۔ اس دوران میں سہام کے دوست پنڈی' لاہور اور پشاور سے اپنی بیگمات کے ساتھ مری آتے رہے تھے۔ وہ رات بہت دیر تک ہمارے ساتھ رہتے۔ کھانے پینے کے ساتھ ہنسی مذاق اور باتوں کا سلسلہ جاری رہتا لیکن کوئی بھول کر بھی میری طبیعت کے بارے میں مجھ سے نہیں پوچھتا تھا۔ اس دوران میں واقعی میری طبیعت بہت بہتر ہو گئی تھی اور پھر میں اور سہام دو دن کے لیے پشاور گئے تھے جہاں میری تایازاد بہن رہتی تھیں۔

سفر کے دوران راستے میں' میں نے سہام سے شکوہ کیا تھا کہ "آپ کے دوستوں میں سے کسی نے بھی میری طبیعت کے بارے میں نہیں پوچھا؟"

سہام نے حیران ہو کر کہا تھا۔ "سچ کہہ رہی ہو؟"

"مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت ہے؟"

"اچھا' ٹھیک ہے' میں اپنے دوستوں سے پوچھوں گا اور کہوں گا کہ "تم اتنے سخت دل کے ہو کہ میری بیگم کی طبیعت نہیں پوچھی؟"

"بس' بس' اب پوچھنے کی ضرورت نہیں کیونکہ اب وہ میرے بھی دوست ہیں۔"

"اچھا چلو' تم کہتی ہو تو نہیں پوچھوں گا' ویسے یہ بات مجھے بھی اچھی نہیں لگی۔ اُن کو ضرور تمہاری خیریت دریافت کرنی چاہیے تھی۔" سہام مسکراتے ہوئے بولے تھے۔ "ویسے یہ بتاؤ' اب تم کیسا محسوس کر رہی ہو؟"

"بہت بہتر محسوس کر رہی ہوں اور اب تو مجھے بھوک بھی لگتی ہے۔ ہر چیز کھانے کو جی چاہتا ہے۔"

سہام نے فوراً ہی ایک چپس کا پیکٹ مجھے دیتے ہوئے کہا تھا۔ "یہ کھاؤ۔"

میں نے چپس ہاتھ میں لے کر سہام کو دیکھا تھا تو اُن کے چہرے پر شرارت بھری ہلکی سی مسکراہٹ تھی۔ "اَب کھاؤ بھی۔" انہوں نے زور دے کر کہا تھا۔

"کیوں' آپ کو ڈر لگ رہا ہے کہ میں آپ کو نہ کھا جاؤں؟"

سہام ایک قہقہے کے ساتھ بولے تھے۔ "تم تو عقل مند بھی ہو گئی ہو' اب تو تمہیں جلدی جلدی مری لانا پڑے گا۔"

ہم دو دن پشاور میں رہے تھے اور اس دوران میں باڑہ بھی گئے تھے' وہاں ہم مختلف دکانوں کا جائزہ لے رہے تھے تو ایک چھوٹی سی جھگی نما دکان میں مجھے گُڑ کا ڈھیر نظر آیا تھا۔ وہاں موجود ایک بزرگ نما ہستی اُس گڑ کو چھوٹی چھوٹی گولیاں بنا کر کاغذ میں لپیٹ رہے تھے۔ میں کافی دیر تک کھڑی انہیں یہ کام کرتا دیکھتی رہی تھی۔ آخر کار مجھ سے ضبط نہ ہو سکا تھا تو پوچھ لیا تھا۔ "بابا! آپ یہ گُڑ کی گولیاں کیوں بنا رہے ہیں؟"

"یہ گُڑ نہیں' چرس ہے۔" بابا نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

'میں تو گُڑ سمجھ رہی تھی مگر یہ تو چرس ہے اور یہ اتنی قیمتی ہوتی ہے کہ گولی بنا کر بیچی جائے۔' میں نے اپنے دل میں سوچا تھا۔ اس وقت میری بہن' بہنوئی اور سہام سامنے والی دکان پر کھڑے کچھ دیکھ رہے تھے۔ میں بھی وہاں پہنچ گئی تھی اور انہیں پورا احوال بتا کر سوال کیا تھا۔ "یہ چرس کیا ہوتی ہے؟"

میرے بہنوئی نے جواباً مجھ سے سوال کیا تھا۔ "کیا تم کو خریدنی ہے؟" لیکن میرے جواب سے پہلے سہام بول پڑے تھے۔

"یہ تو نشہ ہے۔" شاید اُن کو ڈر تھا کہ میں کہیں چرس خریدنے پر ہی راضی نہ ہو جاؤں۔ قصہ مختصر' باڑے سے میں نے کیا خریدا تھا' یہ تو مجھے یاد نہیں ہے۔ بہرحال تیسرے دن ہماری پشاور سے کراچی واپسی ہو گئی تھی۔

امی تقریباً سال بھر سے رعنا کی دیکھ بھال کر رہی تھیں اور وہ میری بیٹی سے اس قدر مانوس ہو گئی تھیں کہ اُس کو میرے پاس ایک گھنٹہ چھوڑنا بھی مشکل ہو گیا تھا' یوں یہ معاملہ ایک مسئلے کی صورت اختیار کر گیا تھا اور پھر اس مسئلے کا حل بھی سہام نے ہی نکالا تھا اور مجھے سمجھانے والے انداز میں بولے تھے۔

"رعنا کو تم پالو یا امی' بات تو ایک ہی ہے' بہت مشکل وقت میں انہوں نے تمہارا ساتھ دیا ہے۔ ہم رعنا کو لے کر اُن کا دل نہیں توڑ سکتے اور پھر ہماری بیٹی بھی اُن کے بغیر بہت پریشان ہوتی ہے۔ بہتر یہی ہے کہ رعنا کو انہیں ہی پالنے دو۔"

میں تو ویسے بھی اندر سے بہت مطمئن تھی اور پھر جب سہام نے کہہ دیا تو بات ہی ختم تھی۔ ہمارے اس فیصلے کے بعد امی' ابا کے جانے کے بعد پہلی دفعہ مجھے مطمئن نظر آ رہی تھیں۔ رعنا اُن کے پاس ہی رہنے لگی تھی۔ چھوٹے بچے سے واقعی گھر میں رونق ہو جاتی ہے اسی لیے جب رعنا کبھی میرے پاس ہوتی تو امی گھر کا سناٹا برداشت نہ کر پاتیں اور میرے پاس آ جاتی تھیں۔

سہام لاہور کو اپنا دوسرا گھر کہتے تھے اور وہ سچ کہتے تھے۔ لاہور میں اُن کے بہت پیارے عزیز ترین دوست موجود تھے۔ اکثر ہمارا جب لاہور جانا ہوتا تو یہ دوست ہماری خاطر مدارات' محبت وحسنِ سلوک کی ایسی بے حساب بارش کرتے تھے کہ دل کی زمین سیراب ہو جاتی تھی۔ سہام کا شکر یہ کہ انہوں

نے مجھے اپنی زندگی میں بہت پیارے، محترم، معتبر دوستوں سے ملایا۔ اُن تمام پیارے دوستوں کا شکریہ جنہوں نے مجھے محبت، عزت اور مان دیا۔ یہ لفظ شکریہ اُن کی محبتوں کے آگے حقیر ہے مگر کیا کریں، میرے پاس اس لفظ سے زیادہ کچھ نہیں۔ محبتوں کا حساب نہیں کیا جاتا نہ کوئی محبت ناپنے کا پیمانہ ہے۔ یہ کوئی بنیے کی دکان نہیں جو ناپ تول کر سودے بازی ہو۔ ہاں، لاہور والے محبت، عزت اور مان میں بازی لے گئے اور ہم ہار گئے۔ ہار مان لینا بھی ظرف کی بات ہے، سو میں نے مان لی!!

•......•......•......•

زندگی کی کتاب کے اوراق بہت تیزی سے بدل رہے تھے۔ میری زندگی کا آنگن دو بہت پیاری بیٹیوں منزہ اور تابندہ سے آباد ہوگیا تھا۔ گھر میں بیٹیوں کی رونق کوئی مجھ سے پوچھے۔ سہام بھی بیٹیوں پر جان دیتے تھے، ویسے کبھی کبھی مذاق میں اماں سے کہتے تھے۔ ''آپ کی بہو، بس بیٹیوں کی ماں!''

اماں فوراً کہتیں۔ ''بچے جو اللہ دے دے، اس کا شکر کرو۔''

سہام، اماں کو بیٹیوں کے حوالے سے لاکھ چھیڑتے مگر اماں کی یہی نصیحت ہوتی۔ ''بچے......! بیٹی رحمت ہے۔ اُن کو دیکھ جن کے پاس کچھ نہیں۔''

سہام کی دو بہنیں جوانی میں اس دنیا سے چلی گئی تھیں۔ بھائی بھی تقریباً تیس، بتیس سال کی عمر میں زندگی سے منہ موڑ گئے تھے۔ ماں کے سامنے جوان اولاد چلی جائے، اللہ ایسا دکھ کسی کو نہ دکھائے مگر اس حقیقت سے آنکھیں بند نہیں کرسکتے۔ اللہ صبر دیتا ہے، وہی سہارا ہوتا ہے ورنہ بندہ بشر تو بہت کمزور ہے۔

اب میری زندگی اپنی دونوں بیٹیوں منزہ اور تابندہ کے درمیان گھومنے لگی۔ میں بچوں کے لیے کوئی ملازمہ رکھنے کے خلاف تھی۔ سہام نے کئی بار کہا تھا۔ ''اپنی مدد کے لیے کسی کو رکھ لو۔'' مگر میں نے جواب میں یہی کہا تھا۔

''مشتاق اتنا ذمہ دار ہے کہ مجھے باورچی خانے کی کوئی فکر نہیں اور دوسرا لڑکا انور اوپر کے کام کرلیتا ہے تو پھر بہتر یہی ہے کہ بچوں کو میں ہی پالوں۔'' اس سلسلے میں اماں بھی میری کافی مدد کردیتی تھیں۔ رات میں اگر کوئی بچی روتی تھی تو وہ فوراً آکر کہتی تھیں۔ ''لاؤ، اسے مجھے دے دو۔'' اور پھر میں آرام سے سو جاتی تھی۔ یہ اماں کا بڑا پن تھا جو انہوں نے ہمیشہ نبھایا۔

زندگی کا سفر اسی طرح جاری تھا کہ اسی دوران ایک روز سہام کو دل کا عارضہ ہوا۔ ڈاکٹر علی پانچ منٹ میں آگئے تھے۔ وہ چاہتے تھے کہ سہام کو اسپتال میں داخل کریں مگر سہام اسپتال نہیں جانا چاہتے تھے۔ ڈاکٹر علی نے ہارٹ اسپیشلسٹ کو بلایا تھا۔ انہوں نے مکمل چیک اپ کے بعد آرام کا مشورہ دیا تھا لیکن سہام بستر پر لیٹنے کے قابل نہیں تھے۔ ایک ہفتے کے اندر اٹھ کھڑے ہوئے تھے کہ ''میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ حقیقت ہے کہ سہام نہایت ہی مضبوط قوتِ ارادی رکھنے والے انسان تھے۔ شاید ہجرت اور پھر اس کے بعد کی تکلیفوں اور مشکلیں جھیلنے کی عادت نے انہیں ایسا حوصلہ دیا تھا۔ سہام نے بستر چھوڑ کر زمین پر پیر تو رکھ دیئے تھے مگر میں دوائیں اُن کو بہت پابندی سے دیتی تھی۔ اس دوران میں جب اکثر بلڈ پریشر بڑھ جاتا تو سہام چند منٹ لیٹ کر کہتے کہ ''بس اب ٹھیک ہوں۔'' اُسی زمانے میں بھٹو صاحب نے انشورنس کمپنیز کو نیشنلائز کردیا تھا۔ سہام نیو جوبلی انشورنس کے سب سے بہترین پروڈیوسر تھے۔ اس فیصلے کے بعد اُن کی پروموشن رک گئی تھی۔ اس وقت یامین بھائی کمپنی کے جنرل مینیجر جبکہ بجے علی چیف تھے۔ وہ دونوں سہام کا بڑا خیال کرتے تھے۔ سرکار کے اس فیصلے کے بعد اُن دونوں حضرات نے کمپنی کو خیر باد کہہ کر دوبئی میں کسی کمپنی کو جوائن کرلیا تھا۔ انہوں نے اس فیصلے کے بعد سہام کو بھی بہت کہا تھا کہ وہ بھی اُن کے ساتھ شامل ہوجائیں کیونکہ سہام کی پروموشن رک گئی تھی اور حکومت کے من پسند لوگ آکر اوپر بیٹھ گئے تھے۔ اس بات کا دکھ تو سہام کو بہت تھا کہ محنتی انسان اپنے ساتھ زیادتی پر دکھی ہوتا ہے لیکن سہام نے ان کی بات نہیں مانی تھی۔ وہ لوگ دبئی چلے گئے تھے مگر سہام سے رابطہ رہا تھا۔

کمپنی کو پیش آنے والے ان حالات کے بعد پھر میں نے سہام کو اس لگن سے کام کرتے نہیں دیکھا تھا اور وہ معاشی زندگی کے سفر میں ترقی اور کامیابی کے لیے اِدھر اُدھر دیکھتے اور سوچتے رہتے تھے اور پھر آخر کار ڈائجسٹ نکالنے کا ارادہ کرلیا تھا اور جلد ہی اس ارادے کو نہایت کامیابی سے عملی جامہ بھی پہنا دیا تھا جو آج آپ کی سامنے ''دوشیزہ'' کی شکل میں موجود ہے۔ اس راستے میں کتنی رکاوٹیں آئیں، ان کا ذکر بے کار ہے۔ یہاں میں ایک بات آپ کو بتانا ضروری سمجھتی ہوں کہ سہام نے ہمیشہ حلال روزی کمائی۔ انہیں حلال روزی پر اتنا ایمان تھا کہ کہتے تھے۔ ''رخسانہ! اگر میں زمین پر پڑا بے نام ایک روپیہ بھی اٹھالوں تو وہ میری جیب سے سو روپے لے لیتا ہے۔''

سہام کی کامیابی میں محنت، اَن تھک محنت کے ساتھ حلال روزی حاصل کرنے والے خیال نے مرکزی کردار ادا کیا۔ جب سہام زندگی میں معاشی آسانی لانے کے خیال سے کچھ اور کام کرنے کا سوچ رہے تھے تو اُن کے دوست جو بلڈرز تھے، انہوں نے سہام کو بہت اپنی طرف کھینچا مگر سہام نے یہ کہتے ہوئے انکار کردیا کہ ''یہ ٹھیک ہے کہ اس کام میں پیسا بہت ہے مگر مجھے اس کام کا تجربہ ہے نہ دلچسپی۔'' جبکہ میں کبھی کبھی لالچ میں آجاتی تھی۔ ایسے وقت میں سہام ہمیشہ یہی کہتے۔ ''رخسانہ! جب اللہ مجھے محنت کا پھل دے رہا ہے تو میں کیوں اِدھر اُدھر بھاگوں؟ جو مجھے پسند ہے، جو مجھے آتا ہے، بس وہ ہی کام اچھا ہے۔''

•......•......•......•

سہام کے بڑے بھائی ہندوستان، حیدرآباد دکن میں رہتے تھے۔ وہ پاکستان نہیں آئے تھے اور مجھے بھی حیدرآباد دکن دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ وہاں کی باتیں، شہروں اور ندیوں کے نام بہت سنتے تھے اور اس کی وجہ میرے والد کے بڑے بھائی تھے جو حیدرآباد دکن میں سیٹل ہوئے تھے۔ فاطمہ ثریا بجیا جو میری تایازاد بہن ہیں، اُن کے گھر میں میری تائی پاشی اور باقی سب بھی حیدرآباد دکن کا ذکر بہت محبت سے کرتے تھے۔ اُن کے گھر کھانا بھی بالکل حیدرآبادی پکتا تھا۔ حیدرآباد کے کھانے بہت مشہور ہیں اور ہوتے بھی بہت مزے کے ہیں۔

میں پہلی بار حیدرآباد گئی تو تینوں بچے رعنا، منزہ اور تابندہ ساتھ تھے۔ ہم پہلے بمبئی پہنچے تھے۔ وہاں نامور افسانہ نگار واجدہ تبسم سے ملاقات ہوئی تھی۔ بڑے مزے کا گھرانہ تھا۔ واجدہ نے بہت محبت سے ہماری خاطر اور مدارات کی تھی۔ وہاں بڑا اچھا وقت گزرا تھا۔ ہم بمبئی کی سیر کے بعد حیدرآباد کے لیے روانہ ہوئے تھے۔ ٹرین کا یہ سفر بہت خوبصورت تھا۔ میں تو بس ٹرین کی کھڑکی کے ساتھ خاموش بیٹھی مناظر دیکھتی رہی تھی۔ مجھے ریل کا سفر بہت اچھا لگتا ہے اور پھر مناظر حسین ہوں تو کیا بات ہے!!

سہام کے بڑے بھائی سراپا انتظار تھے۔ انہوں نے ہمیں جو محبت دی، وہ بھی ہمیشہ یاد رہے گی۔ وہاں سہام کے دوستوں کا ایک جمِ غفیر تھا۔ گھر میں تو ہم نے صرف سامان رکھا تھا، سارا وقت تو ملنے ملانے، دعوتیں کھانے میں گزر گیا تھا۔ حیدرآباد دکن میں

ہمارے قیام کے دوران ایک اخبار نے مجھے حیدرآباد کی بہو کا خطاب دے ڈالا تھا' ویسے میں تھی حیدرآباد کی بہو۔ یہاں بھی بس وقت کی تنگی نے ہم کو شرمندہ کردیا اور نقارۂ واپسی بج گیا۔ بڑے بھائی صاحب نے بہت شکوہ کیا کہ ''تم لوگ مجھ سے کہاں ملے؟'' اُن کا شکوہ جائز اور محبت سے بھرا ہوا تھا۔ اس میں کچھ غلط بھی نہ تھا۔

میں نے کہا تھا۔ ''بھائی......! ہم پھر آئیں گے۔''

وہ فوراً بولے تھے۔ ''تو پھر وعدہ کرکے جاؤ۔ میری زندگی میں ہی آؤ گے۔'' اُن کا یہ جملہ بہت دکھی کردینے والا تھا۔ سہام اس دوران میں بالکل چپ کھڑے تھے۔

میں نے کہا تھا۔ ''بھائی......! ہم ضرور آئیں گے' ویسے زندگی کا تو کسی کو پتہ نہیں۔'' اور پھر خدا حافظ کہہ کر روانہ ہوگئے تھے۔

ایک بار پھر بمبئی تک ٹرین کا سفر تھا۔ انڈیا کی ٹرینیں لاجواب ہیں' بیٹھ کر یوں لگ رہا تھا کہ یہ زمین پر چلنے والا ہوائی جہاز ہے۔ منظر حسین اور سفر آرام دہ اور پھر ٹرین جو مجھے بہت پسند ہے۔

بمبئی پہنچ کر ہم سیدھے ایئرپورٹ گئے تھے۔ وہ سفر مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ ہم انڈین ایئرلائن کے جہاز میں سفر کررہے تھے۔ ہمارا سفر ڈیڑھ گھنٹے کا تھا۔ یہ جہاز جب کراچی پہنچا تھا تو بڑی زوردار بارش ہو رہی تھی۔ تھوڑی دیر جہاز ہوا میں ہی رہا تھا پھر کپتان نے اطلاع دی تھی کہ بارش کی وجہ سے جہاز کراچی لینڈ نہیں کرسکتا لہٰذا ہم واپس احمدآباد جارہے ہیں اور پھر بمبئی...... یہ سن کر جہاز کے مسافروں نے شور مچا دیا تھا۔ کوئی کہہ رہا تھا' لاہور چلو' کوئی حیدرآباد' سندھ' غرض جس کو پاکستان کا جو شہر یاد تھا' اُس کا نام لے رہا تھا لیکن کپتان کا کہنا تھا کہ ہمیں صرف کراچی ایئرپورٹ پر اترنے کی اجازت ہے!!

''یادوں کے اوراق'' کی چوتھی قسط آئندہ ماہ ملاحظہ کیجیے

سلسلے وار کہانی ایک نئی دلچسپ قسط وار کہانی جسے آپ ہر ماہ پڑھنا چاہیں گے





شازلی سعید مغل

تاشون

حزیں صدیقی کا خیال

عالم رنگ و تماشا سے گزر
کوئی قیمت نہیں بینائی کی

حیرت، تجسس، اسرار اور ستاروں سے جڑے، بہت خاص سلسلے کی بیسویں کڑی



خلاصہ

''تاشون''......ایک پاکستانی نژاد مصری ہے۔اُس کے ماں باپ اُس کی پیدائش پر مصر چلے گئے تھے۔وہ صرف ایک ماہر ستارہ شناس یا پُراسرار علوم کا مالک ہی نہیں ہے بلکہ رُوحانیت کی منازل طے کرتا روشنی کا ایک استعارہ ہے۔اُس کا شمار اُن لوگوں میں ہوتا ہے جن کی دُعائیں بارگاہِ ایزدی میں شرفِ قبولیت پاتی ہیں اور زمین پر معجزہ بن کر واپس آتی ہیں۔ذوالفقار صہبائی عرف زلفی' تاشون کا جگری یار ہے جس کی بیوی رانیہ طاغوتی طاقتوں کے نرغے میں پھنس جاتی ہے۔تاشون اپنے دوست زلفی کے بلانے پر پاکستان کے لیے رختِ سفر باندھ لیتا ہے۔رانیہ کی کیفیت واقعی خراب ہوتی ہے۔وہ اکثر راتوں کو محسوس کرتی ہے کہ جیسے اس کی روح اس کے جسم سے نکل کر گھر سے باہر جانے کی کوشش کرتی ہے لیکن جب اس کوشش میں کامیاب نہیں ہوتی تو واپس رانیہ کے جسم میں آ جاتی ہے۔صورتِ حال نہایت گمبھیر ہوتی جا رہی تھی' ایسے حملے بار بار ہو رہے تھے۔چنانچہ تاشون اپنے دوست کی مدد کرنے کے لیے پاکستان چلا آتا ہے اور یہاں آ کر رانیہ کا پیدائشی زائچہ بناتا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ رانیہ ساڑھ ستی کے زیرِ اثر ہے اور ستاروں کی کچھ خاص پوزیشنز لے کر پیدا ہوئی ہے۔اس کی پیدائش کے وقت سورج گرہن تھا جو کہ شیطانی قوتوں کے لیے نہایت سعد وقت ہوتا ہے۔شیطانی قوتیں ایسے لوگوں کی تلاش میں رہتی ہیں جن کی پیدائش کے وقت سورج یا چاند گرہن لگا ہو۔رانیہ کے پیچھے بھی سیل شیا نامی ایک منظم طاغوتی تنظیم کی رکن لگی ہوئی ہے جسے اپنی طاغوتی قوتوں کو بڑھانے اور اپنے مذموم مقاصد کو پورا کرنے کے لیے رانیہ کی روح درکار ہے۔اس کے مذموم مقاصد میں سب سے اہم مقصد اس کے شیطان صفت شوہر مہانیل کی واپسی سرِفہرست ہے۔مہانیل وہ عفریت ہے جو کہ ایک صدی سے موت کی نیند سو رہا ہے۔اپنے اس مذموم مقصد میں کامیابی کے لیے سیل شیا ہر حد سے گزرنا جانتی ہے' چنانچہ اس نے اس مقصد کو پورا کرنے کے لیے ایک صحرائی دیہاتی چندوا کے مرنے کے بعد اس کے ہم زاد کو اپنے قابو میں کر رکھا ہے جس کے ذریعے وہ فراعنہ مصر کے خزانوں پر بھی قبضہ کرنا چاہتی ہے۔سیل شیا نہایت کڑی تپسیا کے بعد ایک مرتبہ رانیہ کی روح کو اس کے جسم سے نکالنے میں کامیاب بھی ہو گئی تھی مگر تاشون نے اللہ تعالیٰ کی مرضی اور رحمت کے طفیل روح کو اس کے جسم میں واپس بلا لیا تھا۔اس وجہ سے سیل شیا کی طاقتیں اس وقت کمزور پڑ گئی تھیں جب اس کا اتنا کاری وار خالی گیا تھا اور رانیہ کی روح جسم سے نکلنے کے باوجود تاشون کے علم اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے واپس رانیہ کے جسم میں چلی گئی تھی۔اپنی اس ناکامی پر سیل شیا پاگل ہو اٹھی تھی' اسے اپنے آقا شیطان کو منانے کے لیے کافی جتن کرنے پڑے' تب کہیں جا کر اسے ایک بار پھر یہ اجازت ملی کہ وہ کچھ عرصے بعد یہ عمل دوبارہ کر سکتی ہے۔اِدھر تاشون' زلفی کے دوست شہباز سونگی کے گھر آئے مہمان کے جسم سے چار ہزار سال عمر رسیدہ جن کو نکالتا ہے۔زلفی بہت فخر محسوس کرتا ہے کہ اُس کا دوست اس کی مدد کرنے کے ساتھ ساتھ دوسرے لوگوں کے کام بھی آ رہا ہے۔

راحت چچا نے سیل شیا سے ایک نوجوان کامران کی ملاقات کروائی ہے جس کی بہن رقیہ کے گھر عجیب و غریب خوفناک واقعات پیش آئے ہیں۔سیل شیا کا کہنا ہے کہ وہ مکان اس کے بتائے ہوئے شخص کو فروخت کر دیا جائے ورنہ انہیں بہت بڑا نقصان اٹھانا پڑے گا۔

تاشون سے ملنے اس کے والد صاحب کے زمانے کے ایک بزرگ شاکر علی صاحب آتے ہیں جو سنگاپور میں اپنے مکان میں رہنے والے دوسرے خاندان کا ذکر کرتے ہیں جو کوئی ڈاکٹر ٹمکسن کا آسیب تھا۔زلفی کے گھر پر وہ اپنے سنگاپور والے مکان اور مادے اور جوہر کے ان کے والد اور ان کے نظریات کی بابت ذکر کرتے ہیں۔

تاشون نے ایک نہایت دلکش سے مضافاتی مقام پر ایک نہایت خوبصورت فارم ہاؤس بنایا ہے جہاں دوستوں کو دعوت پر مدعو کیا ہے۔یہاں اسے سیل شیا کی جانب سے ایک تحفہ موصول ہوتا ہے۔

تاشون نے اُس تحفے کے حوالے سے بتایا تھا کہ سیل شیا بدلے کے لیے ایک خاص وقت کا انتظار کر رہی ہے اور اُس رات کو ہی فارم ہاؤس پر تاشون کے ڈرائیور بیرل خان کے ایک مہمان مکھن خان کی چیخیں سنائی دی تھیں جس نے ایک روح سندوفی پر قبضہ جمانے کا چکر چلایا تھا لیکن ناکام ہو گیا تھا۔اسے تاشون نے نجات دلائی تھی۔ان لوگوں کی زلفی کے گھر واپسی ہوئی تھی جہاں ایک فقیر کی آمد ہوئی تھی جو کہہ رہا تھا۔''دولت کی دولتیں' سب دھری رہتی ہیں باتیں'' پھر اس فقیر نے اپنی کہانی سنائی تھی۔

رانیہ کے گھر میں اوپر کسی روح کی آمد ہوتی ہے۔یہ ایک بےبس لڑکی شائلہ کی روح ہے جو اپنے بھائی کو ڈھونڈنے نکلی اور خود موت کے چکر میں پھنس گئی۔تاشون نے اسے بتایا کہ وہ مر چکی ہے اور پھر اسے اور اس کے بھائی کو انصاف دلوایا۔اسی دوران میں تاشون دوسری مخلوق کے محبت کے فلسفے کو بیان کرتے ہوئے ایک اور واقعہ بتاتا ہے۔صنوبر کے جنگل میں ایک لڑکی عاشی پر جن زادی سوار ہو گئی تھی' وہ جن زادی اپنے محبوب کی قبر پر آئی تھی اور عاشی نے اس کا پیر دبا یا تھا۔چنانچہ تاشون' عاشی کا علاج کرنے آتا ہے لیکن وہ جن زادی کسی انسان کی محبت میں گرفتار ہے جو مر چکا ہے۔اس کی روداد سن کر تاشون رنجیدہ ہو جاتا ہے۔

عاشی کو جن زادی سنہرا سے نجات دلانے کی داستان سن کر سب لوگ متحیر تھے۔اچانک ایک دن زلفی رات گئے گھر سے باہر تھا تو تاشون کو اپنے علم کے ذریعے پتہ چلا تھا کہ وہ بیماریوں کے قافلے کی زد میں آ سکتا ہے' چنانچہ وہ اس کے جوتے میں جلتا ہوا انگارہ ڈال کر اس کو سڑک کے ایک طرف کر دیتا ہے اور پھر وہ بیماریوں اور وباؤں کی شکلوں' ان کے حلیوں اور نقصانات کے بارے میں بتاتا ہے۔اُدھر سیل شیا اپنا مقصد پورا کرنے کے لیے نئے سرے سے ہتھیار بند ہو رہی ہے اور ایک مرتبہ پھر مقابلہ خیر و شر ہونے کو ہے۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

سیل شیا اپنے سامنے کتابوں کی صورت سیاہ علم کے خزانے کھولے بیٹھی تھی۔کچھ دیر بعد وہ اٹھی اور پانچ پہلوؤں والے ستارے کے وسط میں جا بیٹھی۔اس کے بیٹھتے ہی کمرے میں موجود کالی شمعوں نے سرخ آتشی انگڑائی لے کر جلنا شروع کر دیا۔اب اس نے زیرِلب کتاب کے ایک مخصوص صفحے کو پڑھنا شروع کر دیا۔جیسے جیسے وہ منتر کا جاپ کر رہی تھی' کمرے میں خنکی کا احساس بڑھتا جا رہا تھا اور پھر سردی کا احساس ہوتے ہی سیل شیا پہلے سے کہیں زیادہ تیزی سے جاپ کرنے لگی حتیٰ کہ یہ احساس اتنا سرد ہوا کہ وہ اپنے ہاتھوں اور چہرے کو ایک دہکتی ہوئی سرد آگ میں جھلستا ہوا محسوس کرنے لگی پھر اچانک لرزتی کانپتی شمعوں کی روشنی تھرتھرا کر دھندلی پڑنے لگی اور اس کا وہ وسیع کمرہ تاریکی کی آغوش میں ڈوب گیا۔اب سیل شیا نے ایک غیر مرئی نکتے پر نظریں گاڑ رکھی تھیں پھر اچانک وہ غیر مرئی نقطہ ایک سفید دھوئیں کی لکیر میں تبدیل ہوا اور وہ دھوئیں کی لکیر ناقابلِ یقین تیزی سے لہراتی چکراتی پورے کمرے میں گھومنے لگی اور پھر اچانک ہی گھومتے گھومتے وہ لکیر ایک کہرے میں تبدیل ہو گئی اور وہ کہرہ یکلخت سیل شیا کے بالکل سامنے پانچ پہلوؤں والے ستارے کے وسط میں آن پہنچا۔اس کے ساتھ بھی ایک تیز قسم کی بو جو چیزوں کے گلنے سڑنے سے پیدا ہوتی ہے' سیل شیا کی ناک میں گھسنے لگی۔سیل شیا اس بو کو ناک کے ذریعے اپنے اندر اس طرح اتار رہی تھی جیسے کہ بڑی دلکش اور مسحور کن خوشبو اس کے رگ و پے میں سما رہی ہو۔اس پر ایک کیف سا طاری ہو رہا تھا۔دراصل وہ ایک انتہائی زبردست شیطانی طاقت تھی جو اس وقت کمرے میں کارفرما تھی اور پھر جتنی دیر سیل شیا پر اس سڑتی چیز کی تیز بو نے کیف طاری رکھا' سیل شیا کے سامنے رکھی شیطانی کتابوں میں سے ایک کتاب کے صفحات پر سرخ نشانات لگتے چلے گئے پھر جیسے ہی نشانات کا وہ سلسلہ ختم ہوا' سیل شیا پر طاری کیف و سرور بھی ختم ہوا۔اس نے ایک جھٹکے سے آنکھیں کھول دیں اور قدیم جادوگر سبایوس کی بیاض پر اپنے مطلوبہ سرخ نشانات دیکھ کر مسرت سے کھِل اٹھی کہ اسے اپنی زندگی کی سب سے بڑی بازی کھیلنے کا اجازت نامہ مل چکا تھا اور قمر کی اُن مخصوص پوزیشنوں کی نشاندہی کی جا چکی تھی جب سیل شیا نے مہانیل کے لیے آخری بھینٹ کی صورت رانیہ کی روح کو استعمال کرنا تھا۔

•......•......•......•

ڈھلتے چاند یعنی قمر کی راتیں ہوں‘ خصوصاً آخری دو راتیں جو اماوس کی راتیں بھی کہلاتی ہیں اور قمر کا زحل یا مریخ سے مقابلہ ہو اور پھر زحل اور مریخ ایک ہی جگہ اجتماع رکھتے ہوں تو یہ نہایت ہی خوفناک وقت ثابت ہوتا ہے‘ شیطانی طاقتیں اور ان کے فرستادے ایسے وقت کی صدیوں تک تلاش رکھتے ہیں‘ ان کے لیے یہ وقت ان کی زندگیوں کا حاصل ہوتا ہے جب وہ اپنے اعلیٰ ترین شیطانی مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچاتے ہیں‘ ان شیطانی مقاصد کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کے لیے چاند یعنی قمر ان کا سنگِ میل ثابت ہوتا ہے۔ آسمانوں پر نظر آنے والا خوبصورت رخشندہ و تابندہ چاند ویسے تو اپنی روپہلی چاندنی سے پوری کائنات کو مسحور کرتا ہے لیکن قمر کی اس خوبصورتی کے علاوہ اس کا ایک اور پہلو بھی ہے جو نہایت خوفناک ہے‘ وہ یہ کہ جہاں چاند کی ایک سے لے کر 14 تاریخیں کائنات کو اپنے حسن سے مسحور کرتی ہیں‘ وہاں 15 ویں تاریخ سے لے کر چاند کی 29 یا 30 تاریخیں جو کہ ڈھلتے چاند کی اماوس کی راتیں کہلاتی ہیں‘ کائنات کے خوفناک رازوں کو طشت از بام کرنے میں اعلیٰ ترین کردار بھی ادا کرتی ہیں۔

علم نجوم کی رو سے چاند اور سورج و دیگر تمام کواکب انسان کی زندگی میں وقوع پذیر ہونے والے حالات پر اثر انداز ہوتے ہیں‘ یہ ناصرف انسان بلکہ کائنات کی ہر شئے پر مخصوص انداز میں اثر اندازی رکھتے ہیں جیسا کہ سمندر پر قمر یعنی چاند کی حکومت ہوتی ہے‘ چاند سمندر کی لہروں کو کنٹرول کرتا ہے‘ ماہرین علم نجوم نے سورج کو زندگی اور چاند کو زندگی میں ترقی دینے والا قرار دیا ہے۔ چاند کی حالتوں کا اثر سمندر کی لہروں پر ہوتا ہے اور پھر جوابی اثر انسانی زندگی پر...... جب چاند پورا ہوتا ہے تو سمندر کی لہروں میں بھی جوار بھاٹا پیدا ہو جاتا ہے‘ منہ زور لہریں اتنی اونچی اٹھتی ہیں جیسے کہ چاند کو ہی چھو جائیں گی اس لیے پورے چاند کی راتوں یا دن میں سمندر کے اندر گہرائی میں جانے کو منع کیا جاتا ہے۔ چاند کا یہ اثر انسانی کیفیت پر بھی پڑتا ہے جب چاند پورا ہوتا ہے تو اس وقت انسانی جذباتی لہریں بھی اونچی اٹھتی ہیں اور اس وقت اگر انسانی جذبات پر زیادہ دباؤ پڑ جائے تو معاملات نازک صورت حال اختیار کر جاتے ہیں اور فیصلہ کن نتائج سامنے لاتے ہیں۔ جب چاند مکمل ہوتا ہے یعنی چودھویں کا چاند تو اُس وقت کسی بھی اہم چیز یا کام کے متعلق کوئی فیصلہ کرنا دانشمندانہ فعل نہیں ہوتا کیونکہ اُس وقت دل و دماغ پر قمر یعنی چاند Moon کی حکومت ہوتی ہے۔ انسانی جذبات‘ غصے اور جنون کی حد تک بھی پہنچ جاتے ہیں۔ وہ افراد جن کا سابقہ دماغی مریضوں سے پڑا ہو تو وہ یہ بات اچھی طرح جانتے ہوں گے کہ مکمل چاند کے وقت اُن کے مریضوں کی علامات شدت اختیار کر جاتی ہیں۔ اُس وقت تندرست انسانوں میں بھی یہی صورت حال پیدا ہوتی ہے لیکن اس کا ظہور کسی اور طرح یا کم درجے کا ہوتا ہے‘ اسی وجہ سے مکمل چاند میں کسی کام کے نہ کرنے کا مشورہ دیا جاتا ہے۔ قمر کے اس اتار چڑھاؤ اور انسانی کیفیات پر اس کا اتنا گہرا اثر شیکسپیئر جیسے شہرۂ آفاق رائٹر کو چونکا گیا تھا۔ اس نے اپنی مشہور عالم تصنیف ”وینس کے سوداگر“ میں کہا ہے کہ......

”حقیقتاً مجھے بھی نہیں معلوم کہ میں کیوں اتنا اداس ہوں؟ اداسی میرے اندر تھکان اور بے زاری پیدا کرتی ہے لیکن میں اس اداسی‘ بے زاری‘ تنگ مزاجی کو کہاں تلاش کروں؟ یہ کیسے پیدا ہوتی ہے‘ کس چیز سے پیدا ہوتی ہے؟“

وہ افراد جنہوں نے شیکسپیئر کا بہت اچھی طرح مطالعہ کیا ہے‘ وہ جانتے ہیں کہ شیکسپیئر علم نجوم سے اچھی طرح واقف تھا اور اس بات کو اچھی طرح جانتا تھا کہ...... ”چڑچڑاپن اور تنگ مزاجی‘ غصہ اور جنون میں کس طرح ڈھلتی ہے اور انسانی احساسات اور جذبات پر چاند کی حکمرانی ہوتی ہے۔“ اور صرف یہ ہی نہیں کہ چاند انسانی کیفیات پر اثر ڈالتا ہے بلکہ چاند کی سات دن کی چار اشکال ہوتی ہیں یعنی مہینے کے چار ہفتے‘ چار مختلف اشکال لیے ہوتے

ہیں جنہیں علم نجوم کی زبان میں تربیع اول‘ تربیع دوم‘ تربیع سوم‘ تربیع چہارم کہا جاتا ہے۔ قمر کی پراسراریت قمر کی ان چار مختلف حالتوں کے درمیان پیدا ہونے والے انسان پر بہت پراسرار اور خاص اثر ڈالتی ہے کہ چاند کے (نئے چاند کے) پہلے سات دنوں میں پیدا ہونے والے افراد کی زندگی میں ہر ماہ جب چاند اس تاریخ کو پہنچتا ہے جبکہ وہ اُن سات دنوں میں سے کسی تاریخ کو پیدا ہوا ہو تو اس کے لیے یہ تاریخ بہت اہم ہوتی ہے اور اس کو نہایت پراسرار اور اہم واقعات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

جو لوگ مکمل چاند یعنی 14Full Moon ویں رات میں پیدا ہوتے ہیں‘ بے حد جذباتی اور ضدی ہوتے ہیں۔ مگر ان کی پرجوش اور جذباتی طبیعت کا جواب سرد مہری سے دیا جائے تو پریشانی اور تکلیف محسوس کرتے ہیں۔ یہ کبھی ناکامی سے نہیں گھبراتے‘ سخت محنتی‘ بہادر ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ افراد جو چاند کے آخری ہفتے میں پیدا ہوتے ہیں‘ اُن کو اپنی امیدوں اور خواہشوں کے پورا ہونے کے لیے بڑا لمبا انتظار کرنا پڑتا ہے۔ یہ بہت صابر ہوتے ہیں‘ ساتھ مل کے کام کرنے کے لحاظ سے بہت آئیڈیل ہوتے ہیں‘ عموماً اچھے بزنس پارٹنرز چاند کے آخری ہفتے کی پیدائش رکھتے ہیں۔ اسی طرح گرہن میں پیدا ہونے والے افراد کالی طاقتوں کے آئیڈیل میڈیم ہوتے ہیں کیونکہ چاند اور سورج گرہن کا وقت نہایت قوی شیطانی عملیات کرنے والوں کا وقت ہوتا ہے اور اس میں پیدا ہونے والے افراد ان عملیات کرنے والے افراد کے لیے خزانے کی کنجی کی حیثیت رکھتے ہیں۔ رانیہ بھی انہی افراد میں سے ایک تھی جس کی پیدائش نہ صرف چاند گرہن میں ہوئی بلکہ اس وقت زحل و مریخ کا ایک ہی جگہ اجتماع تھا اور ان دونوں کا قمر یعنی چاند سے مقابلہ تھا‘ سو وہ نحس ترین وقت تھا لیکن شیطانی دنیا سے تعلق رکھنے والوں کے لیے نہایت متبرک!...... سیل شیا کو بھی قدیم جادوگر سبایوس کی کتاب میں اس اہم وقت کی نشاندہی کر دی گئی تھی جو عنقریب آنے والا تھا‘ سو سیل شیا اب بے قراری سے انتظار کی گھڑیاں گن رہی تھی۔

•......•......•......•

جب سے تاشون نے وباؤں‘ بیماریوں کی شکلوں کے متعلق کائنات کے ایک اور اہم راز سے پردہ اٹھایا تھا‘ تب سے زلفی اور رانیہ حتیٰ کہ ان کے گھر کام کرنے والی ملکیا تک بہت محتاط ہو گئے تھے۔ پہلے اکثر کام ختم کرنے کے بعد ملکیا ٹی وی لاؤنج میں بالکل دروازے کے سامنے پھسکڑا مار کر بیٹھ جاتی تھی تاکہ ٹی وی دیکھنے کے ساتھ ساتھ وہ صدر دروازے پر بھی نظر رکھ سکے تاکہ بروقت آنے جانے والوں کا پتہ چل سکے اور کبھی کبھی وہ یہیں دروازے کے مین بیچوں بیچ لیٹ کر ٹی وی دیکھتی تھی لیکن جب سے اس کو رانیہ نے محتاط رہنے کو کہا تھا‘ وہ آنے جانے والے راستوں پر نہ خود بیٹھتی تھی اور اگر کوئی بے دھیانی میں بیٹھنے لگتا تو اسے بھی ٹوک دیا کرتی تھی بلکہ اس نے تو لاؤنج کی سیٹنگ بھی بدلنی چاہی تھی۔ یہ سب کارروائیاں دیکھ کر تاشون ہنس پڑتا تھا۔ دوسری طرف زلفی بھی اب درمیانی راستوں پر ٹہلنے اور چلنے سے گریزاں ہو چکا تھا۔ قصہ مختصر یہ سب معاملہ چل ہی رہا تھا کہ گھر میں ایک ایسا واقعہ رونما ہوا تھا جس سے رانیہ کے ہوش جاتے رہے تھے اور پھر انہی وباؤں کی شکلوں میں سے ایک شکل دیکھنے کو مل گئی تھی۔

اُس روز زلفی کی بیٹی ربیعہ اسکول سے واپس آئی تھی تو بخار میں تپ رہی تھی۔ رانیہ نے فوراً اپنے فیملی ڈاکٹر کو فون کیا تھا اور ڈاکٹر آ کر ربیعہ کو دوائیں دے کر چلے گئے تھے۔ اس وقت تاشون اور زلفی گھر پر نہیں تھے پھر دوپہر میں مونگا اور رانیہ آرام کرنے اپنے اپنے کمروں میں چلی گئی تھیں۔

شام کے سائے اتر آئے تھے جب ملکیا نے شام کی چائے بنالی تھی۔ رانیہ نے جب یہ دیکھا کہ ربیعہ سو رہی

ہے'وہ اٹھ کر باہر آ گئی تھی۔ مونگا بھی اپنے کمرے سے نکل آئی تھی۔ مکیا وہیں لاؤنج میں چائے لے آئی تھی۔ ٹی وی پر اس کا پسندیدہ پروگرام چل رہا تھا اور پھر ابھی وہ جلدی جلدی چائے سرو کر کے ٹی وی کے آگے بیٹھنا چاہ رہی تھی کہ رانیہ نے کہا تھا کہ...... ''مکیا' جاؤ ذرا ایک نظر ربیعہ کو دیکھ آؤ' کہیں وہ جاگ نہ گئی ہو؟''

مکیا تیزی سے چلتی رانیہ کے بیڈروم میں گئی تھی اور اگلے ہی لمحے اس نے باہر آ کر بتایا تھا کہ ربیعہ اٹھ گئی ہے۔ رانیہ اپنا چائے کا کپ وہیں چھوڑ کر اٹھی تھی اور اپنی بچی کے لیے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق کچھ دلیہ وغیرہ بنانے کا کہہ کر بیڈروم کی طرف چلی گئی تھی مگر تھوڑی دیر بعد وہ پریشان سی کمرے سے نکلی تھی۔ اس وقت مونگا جو اطمینان سے ٹی وی دیکھتے ہوئے چائے سے لطف اندوز ہو رہی تھی' رانیہ کو ہڑبڑاہٹ سے کمرے سے نکلتے دیکھ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

''کیا ہوا رانیہ' خیریت؟'' مونگا نے پوچھا تھا۔

''پتہ نہیں۔'' رانیہ تشویش سے بولی تھی۔ ''ربیعہ کے جسم پر سرخ سرخ دانے ہو رہے ہیں' بخار بھی ہے لیکن کم ہے۔''

''اوہ' چلو چل کے دیکھتے ہیں۔'' پھر مونگا نے کہا تھا اور اس نے جا کر ربیعہ کو چیک کیا تھا۔ ''ارے یہ تو خسرہ ٹائپ چیز ہے۔''

''مجھے لگتا ہے' وہی ہے۔'' رانیہ نے بھی تصدیق کی تھی۔

''ڈاکٹر کو فون کرو کہ ابھی آ جائیں۔'' پھر مونگا نے ڈاکٹر کا نمبر ڈائل کر کے خود بھی ربیعہ کی حالت کے بارے میں بتا کر اُن سے جلد آنے کی درخواست کی تھی۔

اب ربیعہ اٹھ چکی تھی۔ رانیہ نے مکیا کا لایا ہوا دلیہ اسے کھلانا چاہا تھا لیکن ربیعہ نے کھانے سے انکار کر دیا تھا۔ رانیہ بڑی مشکل سے ایک دو چمچ اسے کھلا پائی تھی کہ اتنے میں صدر دروازے کی اطلاعی گھنٹی بجی تھی' مکیا دوڑ کر دروازے کی جانب لپکی تھی اور ڈاکٹر زبیر کو لے کر کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

ڈاکٹر زبیر نے معائنہ کرنے کے بعد رانیہ اور مونگا کے خیال کی تصدیق کر دی تھی کہ ربیعہ کو خسرہ ہی نکلی تھی۔ انہوں نے کچھ میڈیسنز چینج کر کے نئی دوائیں لکھی تھیں اور احتیاطی تدابیر بتا کر چلے گئے تھے۔ مونگا انہیں دروازے تک چھوڑنے گئی تھی۔

رانیہ گھر کی صفائی کا ہمیشہ خاص خیال تو رکھتی تھی لیکن اب لاؤنج میں کھڑی مکیا کو صفائی کے حوالے سے خاص ہدایات دے رہی تھی۔ مونگا نے رانیہ کو شاور کے حوالے سے بھی یاد دلایا کہ اس بیماری میں نہ صرف بچوں کے اردگرد کا ماحول صاف ستھرا اور پرسکون ہونا چاہیے بلکہ ماں کا یا بچوں کے اٹینڈنٹ کا پاک وصاف ہونا بہت ضروری ہے۔ رانیہ نے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

مغرب کی اذان کا وقت ہو گیا تھا۔ رانیہ نے وضو کیا اور نماز پڑھنے چلی گئی۔ اسی اثناء میں تاشون اور زلفی بھی آ گئے تھے۔ مونگا کی زبانی ربیعہ کی حالت کی بابت سن کر زلفی پریشان ہو گیا تھا۔ اس کو فکر تھی کہ ربیعہ کی یہ بیماری کہیں اس کے اسکول سے زیادہ غیر حاضری کا باعث نہ بن جائے۔

''نہیں' ایسا نہیں ہوگا۔'' تاشون نے زلفی کی پریشانی رفع کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''اگر صفائی کا اور دیگر احتیاطیں جو اس بیماری میں خصوصیت کے ساتھ ہم نے اپنے بزرگوں سے بھی سنی ہیں اور وہ حقیقت پر بھی مبنی ہیں' اختیار کر لی جائیں تو یہ بیماری طویل نہیں ہو سکتی' تین سے سات دن میں یہ چلی جاتی ہے لیکن ذرا سی بھی

بد احتیاطی کرلی جائے تو یہ بیماری نہ صرف طویل ہو جاتی ہے بلکہ بعض اوقات بچوں کی جان پر بھی بن جاتی ہے۔''

''یار' ان بیماریوں اور وباؤں کے بارے میں تم سے اتنا کچھ جان لیا ہے کہ اب ڈر سا لگنے لگا ہے۔'' زلفی نے کہا تھا۔

''ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اللہ تعالیٰ کی ہر پیدا کردہ چیز اس کی قدرتِ کاملہ پر مزید یقین برقرار کرنے کا ہی ایک ذریعہ ہوتی ہے۔ کیا آج سے پہلے تم نے خسرہ کے بارے میں نہیں سنا ہوگا؟ کیا تمہیں بھی بچپن میں اس کا سامنا نہیں کرنا پڑا ہوگا؟ یہی تو انسانی دماغ کی ایک غیر مطمئن شکل ہے کہ جب انسان کسی چیز کے بارے میں مکمل جان لے تو یا تو مطمئن ہو جاتا ہے یا پہلے سے کہیں زیادہ اور فکرمند اور بے چین ہو جاتا ہے جیسا کہ تم ہو رہے ہو۔ اب پریشان مت ہو اور نارمل رہو۔'' تاشون نے زلفی کا کاندھا تھپتھپا کر دلاسہ دیا تھا۔

رانیہ نماز پڑھ چکی تھی جبکہ ربیعہ سو گئی تھی۔ مکیا نے کچن کا کام جلدی جلدی نپٹا دیا تھا۔ ''آپ لوگوں کو بھوک لگی ہوگی؟'' رانیہ نے سوال کیا تھا۔

''ہاں' ایسا ہے تو سہی۔'' تاشون بے قراری کے ساتھ بولا تھا اور پھر خود ہی ہنس پڑا تھا۔

''چلیے تو پھر فریش ہو جائیں' میں کھانا لگاتی ہوں۔'' رانیہ ہنستے ہوئے بولی تھی۔

زلفی اور تاشون جب فریش ہو کر آئے تھے تو مکیا اور رانیہ نے کھانے کی میز لگا دی تھی۔ ''آج کچھ خاص نہیں بن سکا ربیعہ کی وجہ سے۔ مکیا دال چاول اور بینگن کا بھرتہ ہی بنا سکی۔ میں تو آج کچن میں جا ہی نہ سکی۔'' رانیہ تھوڑا شرمندہ سی ہو رہی تھی۔

''ارے بھابھی! بہت ہی اچھا کھانا بنایا ہے مکیا نے۔'' تاشون نے مزے لے کر کھاتے ہوئے کہا تھا۔ مکیا اپنی تعریف پر خوشی سے پھولے نہ سما رہی تھی اور پھر کھانے سے فراغت کے بعد مونگا سب کے لیے چائے بنا لائی تھی۔ تاشون نے ایک بار پھر مکیا کو بلا کر اچھا کھانا بنانے پر شاباش دی تھی اور تعریف کی تھی۔ رانیہ تھوڑی حیران سی تھی۔ تاشون آج بار بار مکیا کی تعریف کیوں کر رہا ہے اور پھر یہ بھید بھی اسے پتہ چل گیا تھا۔

''مکیا' اب تم سب کو بتاؤ کہ میں تمہیں بار بار یہ کھانا دال چاول اور بینگن کا بھرتہ بنانے پر شاباش کیوں دے رہا ہوں؟'' تاشون نے مسکراتے ہوئے مکیا سے سوال کیا تھا۔

''صاحب جی! وہ جو بچوں کی بیماری ربیعہ کو ہوئی ہے' اس میں گھر میں گوشت نہیں پکتا۔ ہمارے گاؤں میں سب بڑے بزرگ ایسا ہی بولتے ہیں' بس سبزی دال ہی پکتی ہے۔ مجھے یہ پتہ تھا اس لیے میں نے خود ہی دال چاول اور بھرتہ بنا دیا جی......!''

''مکیا' تم نے بالکل ٹھیک فیصلہ کیا اس لیے میں تمہیں شاباش دیئے جا رہا ہوں کہ تم اسی کی مستحق ہو۔'' رانیہ جو حیران نظروں سے مکیا اور تاشون کو دیکھ رہی تھی' تاشون براہ راست اس سے مخاطب ہوا تھا۔ ''جی بھابھی! آج کل اعلیٰ تعلیم یافتہ اور ماڈرن سمجھے جانے والے شہری لوگوں سے زیادہ علم ان گاؤں کے اَن پڑھ اور گنوار سمجھے جانے والے لوگوں میں ہوتا ہے۔ آج مکیا نے اپنے بڑوں کے دیئے گئے علم کے مطابق جو کیا' بالکل صحیح کیا اور آپ نے بھی آج کے بعد سے جب تک ربیعہ بالکل ٹھیک نہیں ہو جاتی' گھر میں گوشت کا پکوان نہیں بنانا ہے' صرف سبزی اور دال ہی سب بنے گا۔ میں نے آپ کو بیماریوں اور وباؤں کے بارے میں بتایا تھا ناں؟ یہ بھی ایک بیماری ہے جو اپنے اصول اور شکل رکھتی ہے' اگر ہم ربیعہ کی جلد از جلد صحت یابی چاہتے ہیں تو آپ کو یہ اصول اپنانے ہوں گے۔ گھر کی صفائی ستھرائی' کھانے پکانے اور خود اپنی صفائی ستھرائی کا خیال بھی رکھا جائے' باہر کے

کسی بندے کو ربیعہ کے پاس نہ آنے دیا جائے تو انشاء اللہ العزیز' ربیعہ بہت جلد صحت یاب ہو کر اسکول جانے لگے گی۔ جی بھابھی......! اب تسلی ہوئی آپ کو کہ میں مکیا کو شاباش کیوں دے رہا تھا؟'' تاشون نے رانیہ سے تصدیق چاہی تھی۔

''جی بھائی صاحب......! بالکل ہوگئی!'' رانیہ نے مسکراتے ہوئے کہا تھا۔

•......•......•

اگلے دو تین دنوں میں ربیعہ کا پورا بدن دانوں سے بھر گیا تھا اور وہ بے حد کمزور بھی ہو چکی تھی۔ رانیہ ڈاکٹر اور تاشون کی ہدایات پر پوری پوری طرح عمل پیرا تھی اور ہر طرح کا خیال رکھ رہی تھی اور پھر یوں ہی چھ دن گزر گئے تھے' وہ چھٹے دن کی رات کا درمیانی حصہ ہوگا' رانیہ کافی تھک چکی تھی' اُسے دوپہر میں بھی آرام کرنے کا موقع نہ مل سکا تھا۔ مونگا کی کوئی دوست پاکستان آئی تھی تو وہ آج اُس سے ملنے آئی تھی۔ چنانچہ اس مصروفیت کے سبب آج دوپہر کو آرام کرنے کا ٹائم نہ مل سکا تھا' سو رات وہ ربیعہ کو میڈیسنز وغیرہ دے کر بے خبر سو رہی تھی۔ ربیعہ بھی کافی سکون میں تھی۔ زلفی کو رات گئے تک کچھ کام کرنے تھے چنانچہ وہ اپنے اسٹڈی روم میں تھا اور کام کرتے کرتے سستانے کے لیے جو اُس نے کرسی سے اپنی پشت لگائی تھی تو اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔ اُس وقت تاشون اور مونگا بھی اپنے اپنے کمروں میں محوِ استراحت تھے۔ مکیا لاؤنج میں اپنی مخصوص جگہ پر سو رہی تھی۔

رات کا گہرا سناٹا بڑا پراسرار سرگوشیاں کرتا محسوس ہو رہا تھا۔ باہر کھڑے درخت ہوا کے ایک گہرے جھونکے سے کسی مست شرابی کی طرح جھومنے لگے تھے۔ موسم میں خنکی کا احساس تھا۔ رات تقریباً دو بجے کا عمل ہوا چاہتا تھا کہ اچانک جیسے سکوت سا طاری ہو گیا تھا۔ ہوا کے خنک جھونکوں سے مست شرابی کی طرح جھومنے والے درخت کسی سپاہی کی طرح سیدھے الرٹ ہو گئے تھے جیسے کسی بڑے افسر کی آمد پر ہوشیار باش ہو گئے ہوں۔ اب ہوا بھی تھم تھم کر چل رہی تھی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں آرہا ہو۔ اُس وقت ربیعہ' رانیہ کے برابر میں تھوڑا سا کسمسائی تھی۔ رانیہ کا ہاتھ جو کہ ربیعہ پر تھا' اس کو تھپکنے لگا تھا۔ ماں اگر سو بھی جائے تو اللہ جانے کون سی ایسی اعلیٰ ترین حسیات کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ماں کا رشتہ بنایا ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے ہر لمحہ' ہر آن جاگ رہی ہوتی ہے۔ ماں کی آغوش دنیا کی وہ واحد جگہ ہے جہاں بچہ ہر طرح کی بلاؤں' وباؤں سے 99% فیصد محفوظ رہتا ہے اور ایک فیصد (1%) ناگہانی ہے جو کہ ہر حال میں آنی ہے' چنانچہ اُس لمحے بھی جیسے ہی ربیعہ سوتے میں کسمسائی' گہری نیند میں ہونے کے باوجود رانیہ اسے تھپکنے لگی تھی۔ تحفظ کے اس احساس سے سرشار ہو کر جو اس گہری نیند میں سوتی ماں سے سوتے ہوئے ایک بچے کو پہنچا' ربیعہ مطمئن ہوگئی اور اس کا کسمسانا یکلخت ایک شانت احساس میں ڈھل گیا اور پھر ''وہ'' اچانک ہی ربیعہ کے پیروں کی جانب سے نکل کر اس کی پائنتی پر بیٹھ گئی تھی۔ بے حد سندر اور موہنی سی صورت تھی اس کی' سانچے میں ڈھلا ہوا مرمریں جسم جس پر نہایت خوبصورتی سے لپیٹی ہوئی سرخ رنگ کی ساڑھی اپنی چھب دکھلا رہی تھی۔ بالوں کی لمبی چوٹی اس کے الٹے شانے پر پڑی تھی جو اَدھ کھلی تھی۔ اس کے بدن پر جیسے ستارے سے لپٹے ہوئے تھے۔ دمکتا ہوا رنگ تھا' وہ اپنے بالوں کی اَدھ کھلی چوٹی میں انگلیوں سے بل دیتے ہوئے کچھ گنگنا رہی تھی۔ ربیعہ کی بیماری میں رانیہ نے اپنے سونے کا ایک بیش قیمتی لاکٹ اس کے گلے میں ڈال دیا تھا۔ اُس وقت وہ لاکٹ بھی اوپر سے نیچے تک زیورات سے مزین اس حسینۂ عالم کے گلے میں موجود تھا جسے وہ کبھی کبھی دھیرے سے چھوتی تھی۔ وہ رانیہ کے بیڈ پر ربیعہ کے پیروں کے پاس بیٹھی کبھی کبھی اپنے

خوبصورت پیروں کو دھیرے سے ہلا دیتی تو اس کے پیروں میں موجود پائل کے ننھے ننھے گھنگھرو جلترنگ بکھیر دیتے۔ اس نے ایک نظر بہت محبت سے ننھی ربیعہ کو دیکھا تھا اور پھر کچھ گنگنانے لگی تھی۔

فضا ساکت تھی‘ سب کچھ ٹھہر سا گیا تھا‘ کمرے کی کھڑکیاں بند تھیں‘ رات میں خنکی بڑھنے کی وجہ سے رانیہ نے کھڑکیاں احتیاطاً بند کردی تھیں تاکہ تیز ہوا کے ٹھنڈے جھونکے ربیعہ کو نقصان نہ پہنچا دیں۔ اس حسینہ نے ایک نظر کھڑکی پر ڈالی تھی۔ کھڑکی کے دونوں پٹ دھیرے سے ''وا'' ہوگئے تھے۔ اسی لمحے بالکل اچانک رانیہ کی آنکھ کھل گئی تھی۔ کمرے میں لیمپ کی مدہم خوابناک سی روشنی تیر رہی تھی۔ یکایک رانیہ کو یوں لگا تھا کہ جیسے اس کا دماغ خالی ہوگیا ہو اور وجود پتھر کا بن گیا ہو۔ وہ خواب دیکھ رہی ہے یا حقیقت میں جاگ گئی ہے؟

کمرے کی مدہم روشنی میں چمکتی دمکتی بنی سنوری ایک عورت سرخ ساڑھی میں ربیعہ کے پیروں کے پاس بیٹھی اس کی طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ اس کی خوبصورت‘ حسین آنکھوں میں ایک نرمی کا احساس تھا‘ کوئی ہیبت ناکی نہیں تھی۔ رانیہ اُس وقت پوری طرح ایک ٹرانس میں تھی‘ اس نے آواز نکالنی چاہی تھی لیکن اس کی آواز اندر کہیں گم سی ہوگئی تھی۔ اس نے ہلنے جلنے کی کوشش کی تھی لیکن جسم کو حرکت نہ دے سکی تھی۔ اس نے تیزی سے نظر گھما کر اپنے پاس سوتی ربیعہ کو دیکھا تھا۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ اُس کے چہرے پر سکون ہی سکون تھا۔ رانیہ کی اس سراسیمگی اور خراب حالت کو دیکھتے ہوئے ''وہ'' دھیرے سے مسکرائی تھی اور کھڑی ہوگئی تھی۔ کمرے میں اس کے زیورات سے جیسے ایک بجلی سی کوند گئی تھی‘ اس نے رانیہ کا وہ لاکٹ جو اس کے گلے میں پڑا تھا‘ اتار کر ربیعہ کے پیروں کے پاس چھوڑ دیا تھا پھر دھیرے دھیرے چلتی رانیہ کے عین سامنے موجود کھڑکی میں جا کے کھڑی ہوگئی تھی۔

کھڑکی سے باہر پورا چاند اچانک بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا تھا اور حیرت سے اُس حسینہ کے درشن کرنے لگا تھا۔ جوں ہی چاند کی نظر اس حسینہ پر پڑی تھی‘ وہ اس کی چاندنی میں نہا گئی تھی۔ اس کی صبیح پیشانی پر سجی بندیا نے چاند کو بھی شرما دیا تھا اور پھر وہ یکلخت بادلوں کی اوٹ میں جا چھپا تھا اور اس کے ساتھ وہ حسینۂ عالم بھی رانیہ کی نظروں سے اوجھل ہو کر کائنات کے فسوں کا حصہ بن گئی تھی۔

اس حسینہ کے غائب ہوتے ہی رانیہ کو لگا تھا جیسے رکا ہوا وقت ایک جھٹکے سے چل پڑا ہو اور ایک تیز چیخ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے حلق سے برآمد ہوئی تھی۔ اس چیخ سے گھر میں سوئے تمام افراد کی آنکھ کھل گئی تھی۔ زلفی گرتا پڑتا اسٹڈی روم سے ملحق اپنے بیڈ روم تک پہنچا تھا۔ رانیہ دیوانوں کی طرح ربیعہ کو خود سے چمٹائے ہوئے تھی اور وہ اچانک اپنی ماں کی چیخوں سے ہراساں ہو کر رونے لگی تھی۔

''کیا ہوا؟ ربیعہ تو ٹھیک ہے؟'' زلفی نے نہایت ہی ہراساں لہجے میں پوچھا تھا۔ مونگا نے آتے ہی تیزی سے کمرے کا جائزہ لیا تھا۔ کمرے کی ایک کھڑکی کھلی ہوئی تھی۔ اسے ربیعہ کے پیروں کے پاس رانیہ کا لاکٹ مل گیا تھا۔ تاشون بھی آ پہنچا تھا۔ مونگا نے اشارے سے لاکٹ کی جگہ اور اس کا ملنا تاشون کے گوش گزار کیا تھا۔

تاشون متحیر سا ہوگیا تھا۔ اس کو رتی برابر بھی امید نہ تھی کہ ''وہ'' یوں خود کو یہاں ظاہر کرے گی لیکن اسے قدرتِ کاملہ پر پورا یقین تھا کہ وہ جب جو چاہے‘ جیسا چاہے‘ کر سکتی ہے مگر پھر بھی اس کو ایک حیرت کا سامنا تھا لیکن یہ حیرت بہت خوشگوار تھی۔

تاشون کو دیکھ کر رانیہ کے خوف میں کمی آئی۔ ''وہ......وہ......!'' اس نے کھڑکی کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ''وہ ایک لال ساڑھی والی عورت......!''

''جی‘ جی بھابھی‘ اب آپ ریلیکس ہوجائیں۔'' تاشون نے رانیہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کچھ پڑھا تھا تو رانیہ کو سکون سا آگیا تھا‘ کچھ ڈھارس بندھی تھی۔ ربیعہ کو بھی دَم کیا ہوا پانی پلایا تھا۔

اُسی وقت زلفی نے ربیعہ کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا تھا۔ ''ارے‘ یہ دیکھو‘ ذرا دیکھو تو یار‘ ایک بھی دانہ موجود نہیں ہے۔ رات میں تو سارا جسم دانوں سے بھرا ہوا تھا‘ یہ دانے کہاں چلے گئے؟''

رانیہ نے فوراً ہی ربیعہ کی فراک اوپر کردی تھی اور پورا بدن دیکھ ڈالا تھا۔ ''یہ......یہ تو کمال ہوگیا‘ ابھی ابھی میں دانے بالکل مرجھا گئے ہیں اور جلد کہیں کہیں سے تو صاف ہی ہوگئی ہے۔'' اس کے لہجے میں حیرت اور خوشی کی آمیزش تھی۔

تاشون جو دونوں میاں بیوی کی باتیں سن رہا تھا‘ ان کی اس طرح بے تاب اور بے چین کیفیات کو دیکھتے ہوئے بولا تھا۔

''دانے صاف کیوں نہ ہوں گے! وہ......وہ چلی جو گئی۔''

''کون چلی گئی؟'' زلفی اور رانیہ کی سوالیہ نظریں تاشون سے جواب طلب کر رہی تھیں۔

''ٹھیک ہے‘ پہلے آپ ربیعہ کو سلا دیں پھر میں آپ کو اس سوال کا جواب دوں گا۔''

صبح چار‘ ساڑھے چار کا وقت تھا‘ وہ سب لاؤنج میں موجود تھے۔ مکیا نے چائے دم دے دی تھی۔ تاشون کی طرف سے سب کچھ ٹھیک ہے اور اب فکر کی کوئی بات نہیں کا سن کر رانیہ بھی ربیعہ کو بیڈ روم میں اکیلی سوتی چھوڑ کر آ گئی تھی اور مکیا کو اس کا دھیان رکھنے بیڈ روم میں بھیج دیا گیا تھا۔ ظاہر ہے‘ اس صورت حال کے بارے میں جاننے کا سب سے زیادہ حق رانیہ کا ہی تھا کہ اس نے اپنے ہوش و حواس میں ایک انوکھا منظر دیکھا تھا‘ دوسری طرف ایسے ہر واقعہ پر زلفی کا ذہن تو سیل شیا کی طرف ہی جا مڑتا تھا۔

''یہ سیل شیا کی کارستانی نہیں تھی۔'' تاشون نے اپنی گفتگو کا آغاز کرتے ہوئے کہا تھا۔ ''سرخ ساڑھی‘ نہایت خوب صورت‘ ربیعہ کے پیروں کی طرف بیٹھی ہوئی اور جاتے جاتے وہ لاکٹ جو رانیہ بھابھی نے ربیعہ کو پہنایا تھا‘ اپنے گلے سے اتار کر ربیعہ کی پائنتی رکھ دینا‘ چاند کی روشنی میں اس کی بندیا اور سیندور کا چمک جانا‘ مجھے پورا پورا یقین ہے کہ وہ ماتا تھی۔''

''ماتا؟'' زلفی اور رانیہ کے منہ سے بیک وقت نکلا تھا۔

''جی‘ ماتا......میں نے گزشتہ دنوں آپ لوگوں کو بیماریوں‘ وباؤں‘ بلاؤں کا بتایا تھا تو پھر سنیے کہ اب آپ لوگ اُن لوگوں میں شامل ہوچکے ہیں جو اپنی نسلوں کو اپنی زندگی کے تجربات کے حوالے سے یہ بتا سکیں گے کہ آپ نے بچوں کی بیماری عرف عام میں خسرہ کی ظاہری شکل دیکھی ہے اور چونکہ یہ ہندو کہلاتی ہے اس لیے اس کو ہندوانہ زبان میں‘ ہم اور جہاں جہاں اس کے بیک گراؤنڈ کو جاننے والے صاحبِ علم لوگ ہوں گے‘ ماتا کہتے ہیں اور اس وجہ سے جب یہ کسی بچے کو دانوں کی صورت اپنے لپیٹے میں لے لیتی ہے تو بڑے بزرگ پرانی سوچ کے لوگ آج بھی گھر میں گوشت کے پکوان بند کرا دیتے ہیں۔ سبزی دال کھاتے اور صفائی کا خاص خیال رکھتے ہیں کیونکہ یہ پاکی اور صفائی ستھرائی پسند کرتی ہے اور ان اصولوں کا خیال رکھا جائے تو بغیر کوئی نقصان پہنچائے جلد چلی جاتی ہے اور اگر خیال نہ رکھا جائے تو بگڑ جاتی ہے‘ برہم ہوجاتی ہے اور اکثر بچوں کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں۔ آپ نے اس بیماری کے اصولوں اور پرہیز کا خیال رکھا تو یہ جلد چلی گئی اور یہ بچوں کے جسم سے پیروں کی

جانب سے ہی ڈھلتی ہے یعنی نکلتی ہے۔ چنانچہ آپ کو وہ پیروں کے جانب بیٹھی نظر آئی تھی۔'' رانیہ بالکل شاکڈ کیفیت میں بیٹھی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے اس نے تاشون سے بیماریوں' وباؤں کے قافلے کے بارے میں جانا تھا لیکن اس کے سان وگمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ یوں خود کسی بیماری کو ظاہری شکل میں دیکھ پائے گی' گویا اس کی زندگی انوکھے پراسرار واقعات سے بھرتی جارہی تھی۔ دوسری طرف زلفی بھی کم وبیش رانیہ کی طرح ہی سوچ رہا تھا پھر اس نے اپنے ذہن سے ان باتوں کو جھٹکتے ہوئے ایک سوال داغا تھا۔

''اگر ہر بیماری کی ایک شکل ہوتی ہے تو پھر کینسر کے مرض کے بارے میں کیا خیال ہے؟ کیا اس کی بھی کوئی صورت ہے؟''

''بالکل ہے' معمولی بیماری سے لے کر بڑی سے بڑی بیماری کو اللہ نے ایک وجود اور شکل وصورت دی ہے حتیٰ کہ صنف بندی بھی کی ہے جیسے یہ خسرہ (ماتا) عورت ہے اور کینسر مرد ہے۔''

''کیا؟؟'' تاشون کی یہ بات سن کر زلفی حیرت زدہ رہ گیا تھا۔

''میں اس کے بارے میں بتانے سے پہلے یہ بتادوں کہ کینسر کیا ہے؟ وہ یہ کہ جب کوئی انسان حسد' جلن' مقابلہ آرائی' لامحدود دشمنی' خود برتری اور خصوصیت کے ساتھ حرام کمائی سے پرورش پاتا ہے۔ اس کا جسم ان سب چیزوں میں گرفتار ہوتا ہے تو ایک دن آتا ہے کہ اس کے منفی خیالات اور منفی طرز حیات اس کے جسم میں دوڑتی برقی رو جو کہ خیال کے ذریعے عمل بنتی ہے' زہریلی ہوجاتی ہے اور یہ زہریلی رو خون میں زہر پیدا کردیتی ہے جس کی بناپر خون میں خوردبین سے بھی نظر نہ آنے والے virus بن جاتے ہیں اور انسانی جسم میں پہنچنے والی خوراک پر پلنے لگتے ہیں۔ ان virus کی خوراک سرخ ذرات RBC ہوتے ہیں' یوں رفتہ رفتہ مریض کے اندر سے سرخ ذرات ختم ہوکر سفید ذرات کی کثرت ہوجاتی ہے جو کہ جسم کے لیے قابل قبول نہیں' چنانچہ یہ سفید ذرات بلغم یا لعاب بن کر اخراج کرتے ہیں اور انسان رفتہ رفتہ ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوکر موت کے منہ میں چلا جاتا ہے۔ یہ کینسر کے مظہرات یا ظاہری حالت اور علامات ہیں لیکن اب آپ سنیے۔'' تاشون نے پراسرار لہجے میں کہا تھا۔ ''علم رُوحانی کی رو سے کینسر ایک ایسا مرض ہے جو شریف النفس اور بااختیار ہے' سنتا ہے اور باقاعدہ حواس رکھتا ہے۔ اگر اس سے دوستی کرلی جائے اور کبھی کبھی تنہائی میں بشرطیکہ مریض گہری نیند میں سو رہا ہو' اس کی خوشامد کی جائے اور کہا جائے۔

''میاں پیارے بھائی کینسر' تم بہت اچھے ہو' مہربان ہو' یہ آدمی بہت پریشان ہے' اسے معاف کردو۔ اللہ تمہیں اس کی جزا دے گا۔'' تو کینسر شرطیہ مریض کو چھوڑ دیتا ہے اور دوست داری کا ثبوت دیتا ہے۔''

یہ بات کہہ کر تاشون نے زلفی اور رانیہ کی جانب دیکھا تھا۔ حسب معمول دونوں حیرت کے بے کراں سمندر میں غوطہ زن اللہ تعالیٰ اور اس کی بنائی ایک ایک مخلوق' اس کے کارخانۂ قدرت میں ڈھلے ایک ایک راز کے لیے' اس کے ثناء خواں تھے۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ ہر شئے پر قادر ہے۔''

جو چاہے کارخانۂ قدرت میں بناڈالے۔

حیرت' اسرار' تجسس اور علم وآگہی
سے آباد اس سلسلے کی دلچسپ کڑی
آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔

مسئلہ یہ ہے

خلقِ خدا کی بھلائی کے لیے مفید ومعلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ''مسئلہ یہ ہے'' ایک مفید معلوماتی اور مستقل سلسلہ ہے۔ یہ کالم خلق خدا کی بھلائی اور رُوحانی معاملات میں ان کی رہنمائی کے جذبے کے ساتھ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے اولین شمارے سے شاملِ اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر وتجویز کردہ وظائف اور دُعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے استفادہ کیا اور ہزاروں لوگوں نے اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی رُوحانی طاقت کے حیران کردینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ حاصل ہوتا رہا' اسی تناسب سے ہر ماہ وصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا۔ گزشتہ کئی برسوں میں ان خطوط کی تعداد اتنی تجاوز کرگئی کہ اگر ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں جواب دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے اپنے جواب کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیونکہ پرچے کے صفحات بہرحال محدود ہیں۔ مجھے اس بات کا بھی احساس رہا ہے کہ لوگوں کے مسائل اور مشکلات بہت زیادہ اور عموماً فوری حل طلب ہوتی ہیں۔ ان کے لیے طویل انتظار ایک اذیت ناک کام ہے۔ انہی حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جواب براہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا' ان کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپرد ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے اور مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں ہے۔ میری دوسری مصروفیات بھی ہیں۔ ان صفحات کی ترتیب وتدوین اور براہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی' قومی یکجہتی کی دُعا اور مسلمین ومسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دُعائے خیر ہے اور بس۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دُعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور اس سے زیادہ قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے۔ صاحب استطاعت حضرات اور خواتین سے درخواست ہے کہ وہ ٹوکن منی =/300 روپے کو آخری حد نہ سمجھیں' وہ اپنی بساط کے مطابق اس رقم میں اضافہ کرسکتے ہیں۔ اس کا فائدہ یہ ہوگا کہ ملک کے دور دراز علاقوں میں بسنے والی اُن خواتین کے جوابات بھی سپرد ڈاک ہوجائیں گے جو کسی مجبوری کی بناپر ڈاک خانے تک نہیں جاسکتیں اور =/300 روپے کا منی آرڈر نہیں کرسکتیں۔ یہ ایسی نیکی ہوگی جس کا اجر اس دنیا میں بھی ملے گا اور آخرت میں بھی۔ اب تک صرف ممالکِ غیر میں مقیم حضرات نے ازخود تعاون کیا ہے۔ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اسٹاف رکھنا پڑا ہے جو قارئین کے خطوط اور میرے جوابات کو فوری سپرد ڈاک کرنے کا ریکارڈ مرتب کرنے اور دیگر متعلقہ امور کو سرانجام دینے کا ذمے دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری حل چاہتے ہیں تو برائے کرم جوابی لفافے کے ساتھ =/300 روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کردیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ لفافے میں بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ کا نمبر ضرور تحریر کریں۔ وہ تمام خطوط جو =/300 روپے ٹوکن منی اور جوابی لفافے کے بغیر موصول ہوں گے' ان کے جوابات حسب سابق پرچے میں شائع ہوتے رہیں گے۔ خط ارسال کرنے سے پہلے درج ذیل ہدایات نوٹ فرمالیں۔

(۱) براہ راست جواب درکار ہو یا کالم کے ذریعے' دونوں صورتوں میں اپنا اور اپنی والدہ کا اصل نام تحریر کریں۔ کالم میں اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو اصلی نام کے ساتھ کوئی فرضی نام بھی تحریر کریں تاکہ مسئلہ اُسی نام سے شائع کیا جائے۔ جان بوجھ کر گمنام اور فرضی پتوں کے خطوط نہ بھیجے جائیں۔ اپنے مسائل پوری سچائی کے ساتھ پیش کریں۔ غلط بیانی سے ہرگز کام نہ لیں۔ اس سے فائدے کی بجائے' نقصان کا زیادہ احتمال ہے۔ (۲) منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ صرف ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' کے نام ارسال کریں۔ (۳) اپنا مسئلہ مختصر' واضح اور کاغذ کی ایک جانب لکھیں۔ ایک خط میں دو سے زائد مسائل تحریر نہ کریں۔ (۴) کوئی عمل یا وظیفہ کریں تو نماز کی پابندی کا عہد کریں اور اپنے لیے دُعا کرنے سے پہلے تمام دنیا کے مسلمانوں کے لیے دُعائے خیر کریں۔ (۵) صرف خصوصی وظائف کی اجازت درکار ہوگی۔ لفافے کو بند کرنے کے لیے زیادہ گوند نہ لگائیں' اس طرح خط پھٹ جاتا ہے۔ ایسا بھی ہوتا ہے کہ عام ڈاک سے بھیجے جانے والے خطوط ہم تک نہیں پہنچتے لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ خط رجسٹری ڈاک سے بھیجے جائیں۔ جوابی لفافے پر مکمل پتا واضح اور خوشخط لکھا جائے۔ فوری جواب کے لیے اپنی ڈاک اِس پتے پر روانہ کریں۔

ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' 110۔ آدم آرکیڈ' شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

□ طاہرہ۔لاہور۔

○ السلام علیکم! بابا جی! میں بہت سخت پریشان ہوں' میرے شوہر شراب پیتے ہیں جبکہ میں پانچ وقت کی نماز اور تہجد کی نماز پڑھتی ہوں۔ شوہر کی یہ عادت چھڑانے کے لیے جس نے جو بھی بتایا' میں نے پڑھا۔ لیکن شوہر پہ زیادہ اثر نہیں ہوا۔ انہوں نے شراب تقریباً سال بھر کے لیے چھوڑ دی تھی لیکن برے دوستوں نے دوبارہ شراب کی طرف لگا دیا ہے۔ میرے ماں باپ فوت ہو گئے ہیں۔ میں اپنا مسئلہ کسی کو بتا بھی نہیں سکتی۔ شراب پینے کے بعد ان کو غصہ بہت زیادہ آتا ہے۔ بابا جی خدا کے لیے' مجھے ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ شراب پینا اور برے دوستوں کی صحبت چھوڑ دیں۔ میں اس پریشانی سے بیمار رہنے لگ گئی ہوں۔ پریشانی سے میرے پورے جسم میں درد رہتا ہے۔ بابا جی! میں زیادہ مشکل وظیفہ نہیں کر سکتی۔

☆ بیٹی طاہرہ! اللہ تمہارے شوہر کو ہدایت دے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ معاملات اللہ کے سپرد کر دو' بے شک وہ نہایت مہربان آقا ہے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ بیٹی۔پنڈی۔

○ محترم بابا جی! السلام علیکم! بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں اپنے شوہر کی جاب کے سلسلے میں بہت پریشان ہوں۔ میرے شوہر جس کمپنی میں جاب کرتے ہیں' وہاں ان کے ڈیپارٹمنٹ کے باس اور دوسرے لوگوں نے بہت تنگ کیا ہوا ہے۔ اس کمپنی میں میرے شوہر کی جاب کو صرف ایک سال ہوا ہے' ان کا باس جاب سے نکالنے کی دھمکی دیتا ہے۔ وہ جان بوجھ کر بہت زیادہ کام کرنے کو دے دیتا ہے جو اس کے مقررہ وقت پر نہ ہو تو بدتمیزی کرتا ہے اور اس کی یہ سازش ہے کہ اتنا کام کرنے کو دے دو کہ شوہر پریشان ہو کر نوکری چھوڑ دیں۔ بابا جی! میرے شوہر بہت پریشان ہیں' بے انتہا محبت کرتے ہیں لیکن ذہنی سکون نہیں ہے۔ اس کا صلہ اچھا نہیں ہے۔ بابا جی! میں چاہتی ہوں کہ میرے شوہر کی باہر ملک مڈل ایسٹ یا دبئی میں جاب ہو جائے' اچھا پرسکون روزگار مل جائے' ہم لوگ باہر ملک میں شفٹ ہو جائیں۔ بابا جی! مجھے آسان اور مؤثر وظیفہ ارسال کر دیں تاکہ میں اسے آسانی سے پڑھ سکوں کیونکہ میرے بچے بہت چھوٹے ہیں۔

☆ بیٹی!

وَنَجَّيْنٰهُ وَاَهْلَهٗ مِنَ الْكَرْبِ الْعَظِيْمِ ۝

نمازِ فجر اور عشاء کے بعد 700-700 بار مندرجہ بالا آیت پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔ حسبِ استطاعت صدقہ' خیرات ضرور دیا کرو۔

□ صدیقہ۔کراچی۔

☆ بیٹی صدیقہ......! اللہ تمہیں نیک' مکمل اور صحت مند اولاد عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ شوہر سے کسی بھی معاملے میں ضد' بحث مت کرو۔ تم خود صراطِ مستقیم پر چلو۔ باقی معاملات خود بخود درست ہوں گے۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ یوسف ضرور پڑھو۔ یہ وظیفہ زچگی تک جاری رکھو۔

□ راشدہ۔پشاور۔

○ قابلِ احترام بابا صاحب! السلام علیکم! بابا صاحب! میں شدید تکلیف اور پریشانی کے اِس عالم میں اللہ اور اس کے رسولؐ کے بعد' آپ سے آس لگا

رہی ہوں۔ میرے چار چھوٹے بچے ہیں۔ بہر حال اَب میں مسئلے کی طرف آتی ہوں۔ تقریباً ایک سال پہلے مجھے اپنے دائیں سینے میں بہت زیادہ تکلیف محسوس ہوئی۔ ڈاکٹر نے فوری طور پر چھوٹا سا آپریشن کر دیا۔ اَب میں شدید تکلیف میں مبتلا ہوں۔ سمجھ نہیں آتا' کیا کروں؟ کچھ لوگ کہتے ہیں' مجھ پر سفلی عمل کرایا ہے۔ اِس سلسلے میں تو میں کسی کو بھی نہیں جانتی' علاج تو بہت دور کی بات ہے۔ شوہر سے کوئی امید نہیں ہے کہ میرا علاج کرا سکے۔ میں ایک سال سے یہ تکلیف جھیل رہی ہوں۔ بابا صاحب! میں موت سے نہیں ڈرتی کیونکہ دنیا میرے لیے عذاب ہے لیکن اپنے بچوں کی وجہ سے زندہ رہنا چاہتی ہوں۔ خدا کے واسطے' مجھے بتائیں' میں کیا کروں؟ میرے خط کا جواب جلدی سے دیں اور میرے لیے خصوصی دُعا ضرور کرائیں۔ مجھے شوہر کے رویے کا بھی بہت دُکھ ہے۔ وہ میری بیماری کو ہنسی میں ٹال رہا ہے۔

☆ بیٹی راشدہ! تمہارا خط پڑھ کر بہت دُکھ ہوا۔ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو دوسروں کی پرواہ بالکل نہیں کرتے لہٰذا ایسے لوگوں کی تمہیں بھی پرواہ نہیں کرنی چاہیے۔ اپنا علاج خود کراؤ کیونکہ زندگی اللہ تعالیٰ کی اَمانت ہے۔ اِس میں جو بھی خیانت کرے گا' وہ اللہ تعالیٰ کو جواب دہ ہوگا۔ میں تمہارے لیے خصوصی دُعا کا اہتمام کر رہا ہوں۔

□ تمنا۔ ساہیوال۔

○ محترم بابا جی! السلامُ علیکم! میں نے آپ سے کسی بیرونِ ملک کام کرنے والے لڑکے سے شادی کے لیے تعویذ لیا تھا' اُس تعویذ کو سال سے اوپر ہو گیا ہے' لیکن یہ مسئلہ ابھی حل نہیں ہوا۔ بابا جی! برائے کرم کوئی ایسا جلالی وظیفہ بتائیے جس سے میری شادی بیرونِ ملک کام کرنے والے لڑکے سے نہ سہی' ملک میں ہی کسی بھی اچھے لڑکے سے فوراً ہو جائے۔ بابا جی! میرے گھر کے حالات خراب ہیں۔ چھوٹی چھوٹی باتوں کو بڑا مسئلہ بنا دیا جاتا ہے۔ بابا جی! میں بہت مجبور ہوں۔ مہربانی کر کے ایسا کوئی وظیفہ بتائیے جس سے میرا مسئلہ فوراً حل ہو جائے۔ ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی تمنا! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! وظیفہ مستقل مزاجی سے کیا جاتا ہے۔ نماز قضا مت ہونے دو۔ اللہ سب خیر کرے گا۔

□ شازیہ۔ چکوال۔

○ برائے کرم آپ میرے مسائل حل کر دیں۔ اللہ آپ کو اِس نیکی کا اَجر دے گا۔ (آمین!) میں ضلع چکوال کے ایک نواحی گاؤں میں پیدا ہوئی۔ ہم پانچ بہن بھائی ہیں۔ میں سب سے بڑی طلعت ہوں۔ بابا جی! جب تک ہم اپنے تایا کی فیملی کے ساتھ رہے' بہت خوش حال تھے' لیکن علیحدگی کے بعد تو جیسے مصیبتوں نے ہمارا گھر دیکھ لیا۔ میرے ابو جس کام میں بھی ہاتھ ڈالتے ہیں' ہمیں نقصان ہی ہوتا ہے۔ دو دفعہ باہر جانے کی کوشش کی لیکن نہ صرف ناکام لوٹے بلکہ اُن پر بہت سا قرض بھی چڑھ گیا۔ بابا جی! مہربانی کر کے کوئی ایسا وِرد یا عمل بتائیں کہ ہمیں ہمارے پیسے بھی مل جائیں اور ہمارے گھر میں خوش حالی ہو۔ ایک بات اور بابا جی! وہ یہ کہ ابو تو نماز پڑھتے ہیں لیکن اُن کے سختی کرنے کے باوجود بھی گھر میں کوئی اور نماز نہیں پڑھتا حالانکہ میرے ابو کی خواہش ہے کہ تمام گھر والے نماز پڑھیں۔ گھر کا ماحول عجیب سا ہے' کوئی ایک دوسرے کی عزت نہیں کرتا ہے۔ پلیز بابا جی! ہمارے لیے کچھ کریں۔ اللہ آپ کو خوشیاں عطا کرے۔ (آمین!)

☆ بیٹی! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز

کی پابندی رکھو اور بعد نمازِ فجر اور عشاء کے 7-7 تسبیح سورۃ الواقعہ آیت 7 پڑھو اول و آخر دُرود شریف 7-7 بار' پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ خیال رہے' نماز قضا نہ ہو۔

□ نوشین۔ کراچی۔

○ محترم جناب بابا جی! السلامُ علیکم ورحمتہ اللہ و برکاتہ ومغفرہ! بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری دور کی نگاہ کمزور ہے۔ بابا جی! میں نے ماہنامہ ''سچی کہانیاں'' میں اکثر آپ کی جانب سے دیا گیا دور کی نگاہ کے بارے میں وظیفہ' علاج اور دُعا پڑھی ہے لیکن مجھ سے وہ مِس ہو گئی۔ بابا جی! کوئی ایسی آیات یا وظیفہ پڑھنے کے لیے دے دیں کہ میری دور کی نگاہ صحیح ہو جائے اور مجھے صاف نظر آنے لگے۔ ویسے میری دور کی نگاہ کا نمبر 1.50 ہے۔ مجھے اپنے چہرے پر چشمہ اچھا نہیں لگتا۔ بابا جی! آپ دکھی انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ عزوجل آپ کو اِس کا اَجر دے۔ (آمین!) میرا یہ مسئلہ حل کر دیں۔ میں ساری زندگی آپ کو دُعائیں دوں گی۔

☆ بیٹی نوشین! اپنی خوراک متوازن کرو۔ مچھلی' دودھ اور دہی' موسمی پھل اور کچی سبزیاں آنکھوں کے لیے بہت مفید ہیں۔ اِس کے علاوہ روزانہ بعد نمازِ فجر ٹھنڈے پانی پر 7 بار یَانُورُ پڑھ کر دَم کرو اور روئی کے پھاہے کی مدد سے وہ پانی آنکھوں پر لگاؤ۔ یہ عمل بلاناغہ 41 روز کرو۔ سونف بہ کثرت استعمال کرو۔

□ فرمان اللہ۔ بنوں شہر۔

○ پیارے بابا جی! السلامُ علیکم! آپ کی خیریت اللہ سے مطلوب چاہتا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میری عمر 21 سال ہے اور سال بھر پہلے میری شادی ہوئی اور اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اللہ نے ایک پیارا سا بیٹا بھی عطا کیا ہے۔ بابا جی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں بے روزگار ہوں۔ گھر میں ہم چار بھائی ہیں' اُن کی شادیاں بھی ہو چکی ہیں۔ میں سب سے چھوٹا ہوں۔ اللہ کے فضل سے گھر میں صرف میں نے تعلیم پائی ہے۔ باقی بھائیوں نے تعلیم نہیں پائی' وہ اَن پڑھ ہیں' لیکن کاروبار میں اچھے چل رہے ہیں۔ ماشاءاللہ' میرے تینوں بھائی بہت اچھے اور خیال رکھنے والے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ ابھی ہم موجود ہیں کہ تیرا اور تیری بیوی بچوں کا بوجھ اٹھا سکیں لیکن بابا جی! ساری عمر تو دوسروں کے سہارے نہیں گزاری جا سکتی۔ میں چاہتا ہوں کہ کوئی اچھی سی نوکری مل جائے یا پھر اچھا سا کاروبار شروع ہو جائے تا کہ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہو جاؤں۔ فی الحال تو میں ایک پرائیویٹ اسکول میں ٹیچر ہوں لیکن وہاں میری تنخواہ صرف پندرہ سو روپے ہے جو اِس مہنگائی کے دور میں کچھ بھی نہیں۔ بابا جی! میں بہت پریشانی کی حالت میں آپ کو یہ خط لکھ رہا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ آپ میری مدد ضرور کریں گے۔ کوئی وظیفہ یا وِرد بتائیں تا کہ میں کر سکوں۔ الحمدُ للہ' میں اللہ کے فضل و کرم سے پانچ وقت کی نماز پڑھتا ہوں اور تلاوتِ قرآنِ پاک بھی کرتا ہوں۔ میں اللہ کی ذات سے مایوس کبھی نہیں ہوں۔ بابا جی! برائے مہربانی میرے خط کا جواب اِسی شمارے میں دیجیے گا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ اللہ آپ کو لمبی زندگی عطا فرمائے۔ (آمین!)

☆ بیٹے فرمان! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ نمازِ فجر کے بعد ایک بار سورۃ رحمٰن پڑھو اور دُعا کرو۔ اللہ پر بھروسا رکھو' وہ بہتر کرنے والا ہے۔ بس اپنی جانب سے تو کوئی کمی مت چھوڑنا' خوب محنت

کرو ضرور صلہ ملے گا انشاء اللہ!

□ عمران بٹ۔ لاہور۔

o بابا جی! اللہ آپ کا سایہ ہمیشہ ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ بابا جی! میرا مسئلہ کافی سنگین ہے۔ میری شادی کو دس سال ہو چکے ہیں اور میں ابھی تک اولاد کی نعمت سے محروم ہوں۔ مجھے اور میری بیوی کو اللہ کی ذات پر پورا بھروسا ہے کہ وہ ہمیں بھی اپنی اِس نعمت سے ضرور نوازے گا۔ اصل میں مسئلہ میری والدہ کا ہے' وہ مجھے دوسری شادی کا کہتی ہیں اور میرے انکار پر وہ میری بیوی کی زندگی اجیرن کر دیتی ہیں حالانکہ وہ اُن کی سگی بھانجی ہے اور بہت اَرمانوں سے اُس کو بہو بنا کر لائی تھیں۔ بابا جی! میری صرف آپ سے یہ گزارش ہے کہ اِس سارے سلسلے میں میری بیوی کا کیا قصور؟ بس یہ بات میری والدہ نہیں سمجھ رہی ہیں۔ آپ برائے مہربانی مجھے تعویذ ارسال کرنے کا طریقہ کار بتا دیں' مجھے یقین ہے کہ اَب اللہ ہماری ضرور سنے گا۔

☆ بیٹے عمران! اللہ تمہاری ضرور سنے گا۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو' اس کے علاوہ مجھے اپنی بیوی کا نام مع والدہ اور اپنا نام مع والدہ ضرور ارسال کرو۔

□ راحت زمان۔ شہداد کوٹ۔

o بابا جی......! میں آپ کا کالم بہت شوق سے پڑھتی ہوں۔ ہر ماہ رسالہ خریدنے کی تو حیثیت نہیں۔ اِس لیے اسٹال پر جا کر جلدی جلدی آپ کا کالم پڑھ لیتی ہوں۔ بابا جی! ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ گھر میں بہت غربت ہے۔ کوئی بہن بھائی پڑھ نہیں سکا۔ اکثر ہم لوگ فاقے سے ہوتے ہیں۔ بابا جی! اپنی تو پرواہ نہیں مگر چھوٹے بہن بھائی جب بھوک سے بلکتے ہیں تو بہت تکلیف ہوتی ہے۔ بابا جی! میں بہت اچھی کڑھائی کرتی ہوں اور چاہتی ہوں کہ اس کام کی وجہ سے کچھ آمدنی بھی ہو جائے۔ ہم جہاں رہتے ہیں' وہاں تو ممکن نہیں۔ آپ اللہ کا کلام دیں جس کی برکت سے روزی روٹی کا وسیلہ بن جائے۔

☆ بیٹی راحت! یقیناً تم بہت باہمت ہو اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو کامیابی سے ہمکنار کرتا ہے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت باوضو رہو۔ بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ المائدہ ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔ مجھے حالات سے ضرور آگاہ کرنا۔

□ ثانیہ احمد۔ برونائی۔

o باباجان......! میں پاکستان میں کراچی کی رہنے والی ہوں۔ شادی کے بعد برونائی آ گئی۔ میرے شوہر ایئرلائن میں جاب کرتے ہیں۔ ویسے تو بہت اچھے ہیں مگر غصے میں بالکل پاگل ہو جاتے ہیں۔ میں اِس انجان ملک میں بالکل تنہا ہوں۔ مجھے گھر میں بند کر کے چلے جاتے ہیں اور پوری پوری رات واپس نہیں آتے۔ میں اکیلے گھر میں ڈرتی رہتی ہوں۔ بہت کوشش کرتی ہوں کہ مزاج کے خلاف کوئی بات نہ ہو مگر پھر بھی کچھ نہ کچھ بات ہو ہی جاتی ہے۔ باباجان! میں اُن کے موڈ کو بالکل نہیں سمجھ پا رہی۔ جب اچھے ہوتے ہیں تو لگتا ہی نہیں کہ یہ وہی ہیں۔ گھر والوں کو بھی کچھ نہیں بتا سکتی' وہ پریشان ہی ہوں گے۔ باباجان! پلیز' میری مدد کریں' میں بہت خوف زدہ رہتی ہوں۔ آپ سے مستقل رابطے میں رہنا چاہتی ہوں' طریقہ بتا دیں۔

☆ بیٹی ثانیہ......! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ پریشان مت ہو' آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بکثرت ''اَللّٰھُمَّ ھَدیٰ میرا شوہر'' کا وِرد کیا کرو۔ مناسب ہوگا' مجھ سے تعویذ منگوا کر اپنے پاس رکھو۔ تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھا کرو

تا کہ میں تمہیں تمہارے گھر کے پتے پر جواب دے دیا کروں۔ اِس طرح تم میرے رابطے میں رہو گی۔

□ شاہ جہاں بیگم۔ خیر پور۔

o بابا جی! میں بہت پریشان عورت ہوں۔ اللہ نے سب کچھ دیا ہے مگر پھر بھی کوئی سکھ میسر نہیں۔ میری 3 لڑکیاں ہیں' سب شادی کے قابل ہیں مگر کسی کا رشتہ نہیں آتا۔ پڑھی لکھی ہیں' قبول صورت ہیں' پھر بھی کوئی وسیلہ نہیں بنتا۔ بابا جی! میری راتوں کی نیند حرام ہو گئی ہے۔ بچیوں کے والد تو ہیں نہیں۔ میں بھی نہیں رہی تو اُن کا کیا ہوگا؟ بس یہ سوچتی ہوں تو دل بند ہونے لگتا ہے۔ میں اردو لکھ نہیں سکتی۔ یہ خط کسی سے لکھوا رہی ہوں۔ آپ مجھے جلد از جلد جواب سے نوازیں' بہت مہربانی ہو گی۔

☆ بیٹی شاہ جہاں! اللہ تمہاری دُعا جلد از جلد قبول فرمائے اور اولاد کی بے شمار خوشیاں دکھائے۔ کبھی کبھی لگتا ہے جیسے زندگی رک گئی ہے۔ سارے کام رک گئے ہیں' مگر اصل میں ایسا ہوتا نہیں ہے۔ زندگی نام ہی حرارت کا ہے' چلتے رہنے کا ہے اور جب تک انسان زندہ ہے' اس کے کام بھی ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک ماں ہونے کے ناتے تمہاری پریشانی بجا ہے مگر بیٹی! صرف ایک لمحے کے لیے سوچو' تم بچیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے پریشان ہو تو وہ تو ستر ماؤں سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے۔ وہ بچیوں کے لیے بہترین اَسباب پیدا کرے گا اور تم خود دیکھو گی۔ بس اس پاک ذات پر مکمل بھروسا رکھو۔ مجھ سے تعویذ منگوا کر گھر میں رکھو۔ خوب صدقہ خیرات کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□ کامران۔ لندن۔

o بابا جی......! میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں کہ آپ کی دُعاؤں کی بدولت میں یہاں پہنچ گیا۔ میری نوکری اچھی ہے۔ آپ کو خط لکھنے میں اِس لیے دیر ہوئی کہ کام نیا تھا لہٰذا بالکل وقت نہیں مل رہا تھا۔ اَب اللہ کا شکر ہے' پہلا ڈرافٹ گھر بھیجا تو امی نے کہا کہ سب سے پہلے اللہ کا شکر اَدا کرو اور پھر بابا جی کو خط لکھو۔ بس بابا جی! اِسی طرح دُعاؤں میں یاد رکھیے گا۔ میں آپ کی کوئی خدمت کر سکا تو یہ میری خوش نصیبی ہو گی۔

☆ بیٹے کامران......! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلے فرمائے۔ اصل میں انسان جب درست سمت کوشش کرتا ہے تو ضرور کامیاب ہو جاتا ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھنا اور بیٹے......! والدین کی بہت خدمت کرنا۔ انہی نے تمہاری پرورش بہت محنت سے کی ہے۔ انہیں شکایت کا موقع مت دینا۔ میری دُعائیں ہمیشہ تمہارے ساتھ ہیں۔

□ تنزیلہ رحمان۔ شکار پور۔

☆ بیٹی......! اللہ تمہیں عقلِ سلیم عطا فرمائے۔ اپنے والدین پر بھروسا رکھو' وہ تمہارے لیے اچھا ہی سوچتے ہیں۔ خود جو فیصلہ کرو گی' اُس میں دکھ اٹھاؤ گی۔ یاد رکھو' جو شخص تمہیں تمہارے والدین سے متنفر کر سکتا ہے' وہ تم سے کبھی بھی مخلص نہیں ہوگا۔ اَب بھی وقت ہے' اپنے بڑھتے قدم روک لو ورنہ بہت پچھتاؤ گی۔

□ روبی۔ کراچی۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی کے ساتھ وِرد جاری رکھو۔ بیٹی! میں بار بار ایک ہی بات کہتا ہوں کہ جو لوگ اپنے معاملات اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیتے ہیں اور مکمل یقین اور اعتقاد کے ساتھ دُعا کرتے ہیں' وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ خوش حالی میں اللہ تعالیٰ ربُ العزت کا شکر اَدا کرنا اور مشکل میں بھی صابر و شاکر رہنا ہی اصل مومن کی پہچان ہے۔ تم مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع کرو۔

□ن۔ش۔میرپورخاص۔

☆بیٹی......!اس قدر پریشان رہنے سے تمہیں کیا حاصل ہورہا ہے؟ کسی کا کچھ نہیں بگڑے گا' تم صرف اپنا نقصان کرلوگی۔ بندوں کے سامنے سر جھکانے سے اچھا ہے' اللہ کے سامنے سر جھکاؤ۔ جب اس کو راضی کرلوگی تو ساری دنیا تمہارے سامنے ہاتھ باندھ کر کھڑی ہوجائے گی اور تمہارے رکے ہوئے کام ہوتے چلے جائیں گے۔ بیٹی......!یقین رکھو'بس ایک باراللہ کی رسی تھام لو۔ بکثرت اَللّٰہُ قَادِرُ کا وِرد کیا کرو۔ سب ٹھیک ہوجائے گا۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔

□فرحت جمال' کراچی۔

☆بیٹی فرحت!تمہارے گھریلو حالات جان کر بہت دکھ ہوا مگر یقین کرو' ہر طرف ایسی ہی افراتفری ہے۔ جو کچھ تم دیکھ رہی ہو' وہ تمہارے لیے یقیناً ناقابلِ برداشت ہے مگر بیٹی! یہ ہر دوسرے گھر کی کہانی ہے۔ خدانخواستہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ تمہارے مسئلے کی کوئی اہمیت نہیں بلکہ تمہیں صرف یہ بتانا ہے کہ بہت سے ایسے لوگ ہیں جو ایسے حالات کا ہمت سے مقابلہ کررہے ہیں۔ سب سے پہلے تو تم اچھی سی نوکری تلاش کرو۔ اسکول کی نوکری بہت اچھی ہے۔ اسکول کے بعد انہی بچوں کو ٹیوشن بھی پڑھاؤ۔ اس طرح آمدنی میں بھی اضافہ ہوگا اور تمہاری مصروفیت بھی رہے گی۔ لوگوں کی پروا کرنا چھوڑ دو' ڈرنا چھوڑ دو۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہت دُرودشریف پڑھا کرو۔ نمازِ فجر کے بعد 11 بار الحمد شریف پڑھ کر اپنے اوپر دَم کرلیا کرو۔ یَامَالِکُ المُلکُ کا بہت وِرد کرو۔ انشاءاللہ' جلد کرم ہوگا۔

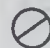
□اے۔اے۔راولپنڈی۔

☆بیٹے......!اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے اور تم اپنے والدین کی امیدوں پر پورا اتر سکو۔ دورانِ امتحان اگر وِرد کرتے تو بہت اچھا تھا۔ بہرحال یَافَتَّاحُ کا بہت وِرد کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرودشریف بہت پڑھا کرو۔ انشاءاللہ' ضرور کامیابی ملے گی۔

□S.A.- کراچی۔

o محترم باباجی! السلامُ علیکم! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں بی ایس سی کی طالبہ ہوں اور میں آگے پڑھنا چاہتی ہوں۔ میرے گھر والوں نے میری اور میرے بھائی کی ایک ہی گھر میں منگنی کردی ہے۔ میں آپ سے یہ پوچھنا چاہتی ہوں کہ کیا میں آگے پڑھ سکوں گی یا نہیں؟ کیونکہ اِس سال میں نے بی ایس سی پاس کرلی ہے اور آگے داخلہ لے کر چھوڑ دیا ہے کیونکہ میرے والد صاحب بیمار تھے اِس لیے باباجان! میں گھر میں رہتی ہوں۔ میں دوبارہ بی ایس سی کا امتحان دینا چاہتی ہوں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ میرے 600 سے اوپر نمبر آئیں۔ باباجی! آپ میرے لیے دُعا کریں اور خصوصی دُعا بھی کرائیں۔ میں بہت زیادہ مشکلات میں گھری ہوئی ہوں۔ آپ کا رسالہ پڑھتے ہوئے 6 سال ہوگئے ہیں۔ آپ لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں اور دُعائیں لیتے ہیں۔ میں اپنی دُکھی کہانی آپ کو پھر کبھی سناؤں گی' خط طویل ہوجائے گا۔ مجھے کوئی اچھا سا اور آسان سا وظیفہ یا دُعا بتائیں۔ میں آسانی سے کرسکوں۔ میں بی ایس سی بھی کرنا چاہتی ہوں یعنی دوبارہ امتحان دینا چاہتی ہوں اور ایم۔اے اسلامیات کے پیپر بھی دینا چاہتی ہوں۔ آپ نے میرے لیے خصوصی دُعا کرنی ہے

☆بیٹی! اللہ تمہیں خوش اور آباد رکھے۔ بے فکر رہو' نماز کی پابندی رکھو اور دُرودشریف بہت پڑھو۔ جس قدر ممکن ہو' یَارَحمٰنُ کا وِرد کیا کرو۔ انشاءاللہ' سب خیر ہوگی۔ مدت 41 دن ہے۔



سچی کہانیاں

MINI MAG

آپ کی ڈائری

خیال آرائی

کتاب تبصرہ

پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

باز گشت

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب شہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجا سکتے ہیں

انتخاب

کیڈٹ نمبر 1

اُن کا قد، بت، چال، ڈھال اور عادات عام کیڈٹوں سے مختلف تھیں لہٰذا بہت جلد وہ ہم سب میں ممتاز ہو گئے۔ کلاس میں افلاطون اور باہر ارسطو تھے۔ بقراط انہیں سخت ناپسند تھا۔ باکسنگ کھیلتے وقت محمد علی (باکسر) کے پوز بناتے، لیکن رنگ سے ایسے نکلتے جیسے سونی لسٹن نکلا تھا۔ پسندیدہ کھیل رسہ کشی تھا۔ اس میں نام پیدا کیا۔ انعام ملا۔ سب نے تالیاں بجائیں۔ رات کو بیرک میں پاکستان کی رسہ کشی ٹیم کے کپتان کا نام پوچھتے رہے۔ جب پتہ چلا کہ ابھی قومی ٹیم کا انتخاب باقی ہے تو بہت خوش ہوئے۔ ہر ایکسرسائز کے آغاز میں آٹھ آگے چلتے اور اختتام پر Rear Party کے سیکشن کمانڈر بن جاتے تھے۔

بریگیڈیئر صولت رضا کی تصنیف "کاکولیات" سے اقتباس

انتخاب: محمد عزیز، حیدر آباد۔

ظرافت

انسان کی زندگی طرح طرح کے دکھوں سے عبارت ہے۔ ان دکھوں سے نجات حاصل کرنا یا ان کی شدت میں کمی پیدا کرنا فکر انسانی کا ہمیشہ سے مقصد رہا ہے۔ سماجی علوم اور معاشرتی اصول و ضوابط اس کی بین مثال ہیں۔ ان تمام علوم اور اصول و ضوابط سے قطع نظر انسان اپنے رویے سے بھی دکھوں کے بوجھ کو قدرے ہلکا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ مزاح نگاری انسان کے اسی رویے کی ایک صورت ہے۔ اس حقیقت کے پیش نظر ہم صرف ایسی مزاحیہ تحریروں ہی کو صحیح معنوں میں مزاحیہ قرار دے سکتے ہیں جو انسان کے دکھوں کی شدت کو کم کر کے انہیں ہنسنے ہنسانے کا موقع فراہم کرسکیں۔ مزاح نگاری کی اس لازمی شرط کے پیش نظر مزاح نگار کے لئے ضروری ہے کہ اس کی تحریریں ذاتی رنجشوں اور عداوتوں سے بالاتر ہوں۔ ہماری اردو شاعری میں مزاحیہ شاعری کی روایات خاصی پرانی ہے لیکن اس کا متعدد حصہ ہجویات پر مشتمل ہے جو صحیح معنی میں مزاحیہ شاعری کے زمرے میں نہیں آتا کیوں کہ اکثر و بیشتر ہجویات ذاتی رنجش اور عداوت کی پیداوار ہیں اس لئے اسے حقیقی مزاحیہ شاعری کہنا درست نہیں۔ شاید یہی وجہ ہے کہ ایسی تمام شاعری کو ناقدین نے قصیدے کی صف میں شامل کیا ہے، اسی طرح طنزیہ شاعری ہے جس کے مقاصد مزاحیہ شاعری سے الگ ہیں۔ اس قسم کی شاعری میں دکھوں کی شدت کو کم نہیں کیا جاتا بلکہ دکھوں کے شعور کو بیدار کیا جاتا ہے۔ مزاحیہ شاعری دکھوں کے زخموں پر مرہم رکھتی ہے جب کہ طنزیہ شاعری معاشرتی دکھوں کے ناسور پر نشتر لگاتی ہے۔ اردو شاعری میں اس روایت کے نمائندہ شاعر اکبرالہٰ آبادی ہیں۔

حکیم محمد سعید کی تصنیف "کتابوں کی کتاب" سے اقتباس

انتخاب: شعیب محی الدین، لاہور۔

لیلاں اور چنسیر

لیلاں اور چنسیر کا قصہ بہت دلچسپ اور مشہور ہے۔ اس قصہ میں انسانی کمزوریوں، عام جذبات اور ان غلطیوں کی عکاسی کی گئی ہے جو انسان لالچ میں کر بیٹھتا ہے۔ چنسیر دیول کوٹ کا نامور اور شجاع حاکم تھا۔ اپنی شجاعت کی وجہ سے بہت مشہور تھا لیکن جس طرح جہانگیر نور جہاں کے آگے بے بس تھا، اسی طرح یہ اپنی حسین و جمیل رانی لیلاں کی دلفریب اداؤں کے آگے بالکل بے بس تھا۔ زندگی بڑی کامرانی اور مسرت سے گزر رہی تھی۔ اسی زمانے میں ایک راجہ تھا جس کی لڑکی کندو بہت خوبصورت اور ضدی تھی۔ ایک دن اس کی سہیلیوں نے طعنے کے طور پر اسے کہا کہ اگر تو اتنی ہی خوب صورت ہے تو جا کر لیلاں کو ہٹا کے چنسیر سے شادی کر لے۔ لڑکی تھی ضدی، اس نے تہیہ کرلیا کہ وہ چنسیر کو ضرور اپنے دام میں لے آئے گی۔ وہ ایک ملازمہ کے بھیس میں محل میں آئی اور لیلاں کی خدمت گار مقرر ہو گئی۔ جب لیلاں کے دل میں گھر کرلیا تو ایک دن اسے ایک نہایت قیمتی ہار دکھایا لیلاں کے منہ میں پانی بھر آیا۔ کندو نے کہا کہ اس کی قیمت یہ ہے کہ چنسیر کے ساتھ ایک رات بسر کرنے کی اجازت مل جائے۔ زیور عورت کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ لیلاں کا دل اس ہار پر آگیا۔ اس نے کہا کہ اچھا ایک رات کی بات ہی کیا ہے۔ اتنا اچھا ہار اسے مل جائے گا۔ "میں یہ سمجھتی تھی کہ یہ مرصع ہار جب میرے پاس ہو گا تو اس سے میرا حسن دوبالا ہو جائے گا۔ مجھے کیا خبر تھی کہ ظالم کندو نے یہ کوئی جال بچھایا ہے۔ بات یہ تھی کہ اس نے اپنے محبوب پر حد سے زیادہ بھروسہ کرلیا تھا۔ جب چنسیر کو اس لالچ والے سودے کی خبر ملی تو وہ انتقاماً کندو کے پاس چلا گیا۔ لیلاں کو چھوڑ دیا اور اسے اس کے گاؤں بھیج کر کندو سے شادی کر لی۔ لیلاں کہتی ہے۔ "اے میرے محبوب، میں کیا کروں، تیری تو سو رانیاں ہیں لیکن میرے تو صرف تم ہی محبوب ہو۔"

"اے میرے محبوب، اگر میں نے غلطی کی تھی تو تیرا کام تو غلطیاں چھپانا ہے۔" شاہ کی نظموں میں لیلاں کی نامرادی اور پچھتاوے کا ذکر ہے۔ آخر میں لیلاں چنسیر کے بازوؤں میں اس احساس کے ساتھ کہ وہ اب بھی اس سے محبت کرتا ہے خوشی کی زیادتی سے دم توڑ دیتی ہے۔

ڈاکٹر حشمت جا کی تصنیف "سندھ کے لیلائے کہانی" سے اقتباس

انتخاب: اشعر جواد، کراچی

بے زاری

ہم میں دو متضاد خوبیاں بیک وقت موجود ہیں۔ حد سے زیادہ خوش مزاجی اور حد سے زیادہ بیزاری، تاہم ہمارا پلہ بیزاری میں نسبتاً زیادہ بھاری ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم بے زاری ایکسپورٹ کر سکتے ہیں جب کہ خوش مزاجی ہمیں دوسرے ملکوں سے امپورٹ کرلینی چاہیے اس سے بیلنس آف ٹریڈ بھی بہتر ہو سکتا ہے۔ بیزار لوگوں کو ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑتی، یہ آپ کو دکانوں میں، ریستورانوں میں، پارکوں میں حتیٰ کہ شادیوں میں بھی ساری دنیا سے الگ ہی بیزار بیٹھے نظر آئیں گے۔ جب بھی آپ کسی شادی پر جائیں، وہاں نوٹ کریں تو یقیناً آپ کو چند لوگ ایسے ضرور مل جائیں گے جو بالکل گم صم اور سب سے الگ تھلگ بیزار بیٹھے ہوں گے اگر ان کے بچے بھی ان کے پاس شرارتیں کرتے ہوئے آئیں گے تو وہ انہیں بھی ڈانٹ کر بھگا دیں گے۔ ان لوگوں کے چہرے بالکل سپاٹ ہوتے ہیں اور ان سے کسی قسم کے جذبات کا اظہار نہیں ہوتا بلکہ شادی بیاہ کی تقریبات کو عموماً یہ لوگ حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ بیزار لوگوں کی چند نشانیاں اور بھی ہیں، ان کی ڈکشنری میں شکریے کا کوئی لفظ نہیں ہوتا، اسی طرح کوئی بھی بات شروع کرنے سے پہلے یہ لوگ براہ مہربانی یا معاف کیجئے گا جیسے تکلفات میں نہیں پڑتے اگر یہ اتفاقاً راہ چلتے کسی سے ٹکرا جائیں تو معذرت کرنا تو در کنار، ان کے چہرے پر پھیلی ہوئی بے زاری مزید پھیل کر منہ کا حلیہ بگاڑ دیتی ہے۔ اسی طرح اپنے کاروبار میں بھی یہ لوگ ایسی ہی بیزاری کا مظاہرہ کرتے ہیں، ان پر شیخ سعدیؒ کے اس قول کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا کہ "بد

مزاج دکان دار کے شہد پر مکھیاں بھی نہیں بیٹھتیں"
ہمارے ان بیزار دوستوں کی دکان سے اگر آپ ہزاروں روپے کی خریداری بھی کریں گے تو یہ آپ کا شکریہ ادا کرنے کی بجائے بقیہ روپے آپ کے سامنے پھینک دیں گے اور یہ حرکت کرتے وقت انکے چہرے پر چھائی ہوئی نحوست مزید نمایاں ہو جائے گی۔ بیزاری اصل میں ایک کیفیت کا نام ہے اور یہ کیفیت اب ہمارے معاشرے کے ہر شعبے میں سرائیت کر گئی ہے۔ بیزار لوگوں کی کمپنی میں آپ خود کو بے حد بور محسوس کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بیزار لوگوں کو بور بھی کہا جاتا ہے۔ بہت سے لوگ پیدائشی بیزار نہیں ہوتے بلکہ حالات انہیں بے زار بنا دیتے ہیں۔ بالکل اسی فلمی مجرم کی طرح جو عدالت میں کہتا ہے۔ "جج صاحب میں مجرم نہیں تھا' حالات نے مجھے مجرم بنا دیا ہے۔"
یاسر پیرزادہ کی تصنیف "ذرا ہٹ کے" سے اقتباس
انتخاب: شرجیل اقدس' جیکب آباد۔

انمول خزانہ

تجربے کی باتیں

☆ بچھو کسی دشمنی کی بنا پر ڈنک نہیں مارتا بلکہ یہ اس کی فطرت ہے۔ یہی حال بدخصلت انسان کا ہے۔
☆ پتھر جدھر سے آئے' ادھر ہی لوٹا دو کیونکہ سختی کو سختی ہی روکتی ہے۔
☆ عورت پیاز کی مانند ہے۔ اس کا ایک ایک پرت الگ کرتے جاؤ' آخر میں کچھ بھی حاصل نہیں ہوگا۔
☆ روشنی کرنا چاہتے ہو تو سنو دیئے کی تہہ میں تیل جلتا ہے۔
☆ پتھر سے پھول اگانے کی کوشش کرنا دیوانہ پن ہے۔
☆ آدمی کی خوبی نہ گرنے میں نہیں بلکہ گر کر سنبھلنے میں ہے۔
☆ انسانیت بیش بہا خزانہ ہے۔ اسے لباس میں نہیں' انسان میں ڈھونڈو۔
☆ صبر ایسی سواری ہے جو کبھی ٹھوکر نہیں کھاتی۔
☆ بدترین شخص وہ ہے جس کے ڈر سے لوگ اس کی عزت کریں۔
☆ خاموشی بہت بڑی حکمت ہے۔

مرسلہ: رضوانہ کوثر' لاہور۔

بڑے لوگ' بڑی بات

☆ محبت جذبات کے سمندر کا ٹھنڈا سانس' آسمان کا آنسو اور روح کے سبزہ زار کا تبسم ہے۔ (خلیل جبران)
☆ آرزو نصف زندگی ہے۔ (جبران)
☆ پانی آنکھوں کے حصے میں آیا اور آگ دل بن کر رہ گئی۔ (خوشحال خان خٹک)
☆ آنسوؤں کو بہہ جانے دو' یہ غموں کو مایوسیوں میں تبدیل ہو جانے سے روکتے ہیں۔ (لی ہنٹ)
☆ آرٹ شے نہیں' راستہ ہے۔ (ایلبارڈ)
مرسلہ: نعیم آکاش' حیدرآباد۔

ذرا مسکرایئے

مشابہت

ایک پروفیسر صاحب کے بھانجے کے ہاں بیٹا پیدا ہوا تھا۔ بیوی اصرار کیے جا رہی تھی کہ جا کر مبارک باد دیں۔ کئی ماہ بعد پروفیسر صاحب مبارک باد دینے پہنچے' وہ بچے کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے ہوئے بولے۔ "بھئی' بالکل اپنے باپ پر گیا ہے۔ اس کا باپ جب چھوٹا تھا تو بالکل اس طرح فیڈر منہ میں لیے چت پڑا رہتا تھا۔"
مرسلہ۔ سید فرحان احمد' کراچی۔

عزرائیل

ڈاکٹر وارڈ کا چکر لگا رہا تھا۔ اچانک اس نے اپنے ماتحت سے پوچھا۔ "بھئی' میرے اس مریض کا کیا حال ہے جو ہر وقت کچھ نہ کچھ بکتا رہتا ہے؟ کیا اس کی یہ کیفیت ختم ہوگئی ہے؟"
ماتحت نے جواب دیا۔ "جناب' اس کی یہ کیفیت برقرار ہے۔ آپ کے آنے سے پہلے وہ کہہ رہا تھا' عزرائیل آ رہا ہے' وہ دیکھو' عزرائیل آ رہا ہے۔"
مرسلہ۔ تنویر احمد' لاہور۔

دعا

ایک نوجوان لڑکی نماز پڑھنے کے بعد دعا مانگ رہی تھی۔ ماں نے پوچھا۔ "بیٹی! دعا میں اپنے لیے کیا مانگ رہی ہو؟"
بیٹی نے کہا۔ "امی! میں نے اپنے لیے کچھ نہیں

مانگا البتہ آپ کے لئے ایک خوبصورت داماد کی دعا ضرور کی ہے۔"
مرسلہ۔ صفیہ شاہ' ٹھٹھہ

بے کار آدمی

"وہ سامنے والی کھڑکی میں ایک کاہل الوجود' بے کار شخص دوپہر سے بیٹھا وقت برباد کر رہا ہے۔ شاید اسے دنیا میں کوئی کام نہیں۔" شوہر نے بیوی سے کہا۔
"یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ بے کار بیٹھا وقت برباد کر رہا ہے؟"
"اس لیے کہ میں خود اسے دوپہر سے وہاں بیٹھا دیکھ رہا ہوں۔"
مرسلہ۔ شبانہ' کراچی۔

بندر

افریقہ سے آنے والے ایک داماد نے اپنے پروفیسر سسر سے کہا۔ "میں آپ کے لیے ایک نایاب نسل کا بندر لایا تھا۔"
"اچھا کہاں ہے وہ؟" سسر نے خوش ہو کر کہا۔
"وہ راستے میں ہی پنجرے سے نکل کر بھاگ گیا۔" داماد نے جواب دیا۔
"چلو وہ نہ سہی' تم تو آ گئے۔" سسر نے داماد کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔
مرسلہ۔ محمد ایوب' کوئٹہ۔

جال

"مچھلی کے شکار پر جاتے ہوئے تم ہمیشہ اپنی بیوی ناظمہ بیگم کو گھر پر چھوڑ جاتے ہو۔ ایسا کیوں ہے؟" پروفیسر سید ساجد حسین نقوی نے اپنے دوست پروفیسر سید واجد حسین نقوی سے دریافت کیا۔
"اس کی ایک بہت اہم وجہ ہے۔" پروفیسر سید ساجد حسین نقوی نے جواب میں کہا۔
"وہ یہ کہ مچھلیوں پر میری بیوی ناظمہ بیگم کی موجوگی کا برا اثر پڑے گا اور وہ میرے جال میں پھنسنے کے لئے قطعی تیار نہیں ہوں گی چونکہ میں خود کتنی بری طرح سے ایک عورت کے جال میں پھنسا ہوا ہوں۔"
مرسلہ۔ پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی' کراچی

☆

بھیگی ہوئی آنکھوں کا یہ منظر نہ ملے گا
گھر چھوڑ کر مت جاؤ کہیں گھر نہ ملے گا
پھر یاد بہت آئے گی زلفوں کی گھنی شام
جب دھوپ میں سایہ کوئی سر پہ نہ ملے گا
آنسوؤں کو کبھی اوس کا قطرہ نہ سمجھنا
ایسا تمہیں چاہت کا سمندر نہ ملے گا
اس خواب کے ماحول میں بے خواب ہیں آنکھیں
جب نیند بہت آئے گی' بستر نہ ملے گا
یہ سوچ لو اب آخری سایہ ہے محبت
اس در سے اٹھو گے تو کوئی در نہ ملے گا
(محسن بھوپالی)
حسن انتخاب: شعیب شمس' کراچی۔

☆

ہے دعا یاد مگر حرف دعا یاد نہیں
میرے نغمات کو انداز نوا یاد نہیں
ہم نے جن کے لئے راہوں میں بچھایا تھا لہو
ہم سے کہتے ہیں وہی عہد وفا یاد نہیں
زندگی جبر مسلسل کی طرح کاٹی ہے
جانے کس جرم کی پائی ہے سزا یاد نہیں
میں نے پلکوں سے در یار پہ دستک دی ہے
میں وہ سائل ہوں جسے کوئی صدا یاد نہیں
کیسے بھر آئیں سرشام کسی کی آنکھیں
کیسے تھرائی چراغوں کی ضیاء یاد نہیں
صرف دھندلائے ہوئے ستاروں کی چمک دیکھی ہے
کب ہوا' کون ہوا' مجھ سے خفا یاد نہیں
آؤ اک سجدہ کریں عالم مدہوشی میں
لوگ کہتے ہیں کہ ساغر کو خدا یاد نہیں
(ساغر صدیقی)
حسن انتخاب: نعیم ابرار' ملتان۔

☆

دیے جلائیں

چلو کچھ دیے جلائیں
وہ دیے جو چاہتوں کے
کسی خواب کے سفر میں
جذبوں کے پانیوں پر

کئی کشتیاں بنا کر
کچھ بادبان کھولیں
چلو کچھ دِیے جلائیں
وہ دِیے جو من کے اندر
دھیرے سے جگمگائیں
کچھ صرف سرسرائیں
کچھ خیال جھلملائیں
تنِ ناتوانِ پہ جمتی ہوئی
کہر کو ہٹائیں
کسی داغ کو مٹائیں
چلو کچھ دیئے جلائیں
وہ دِیے جو روشنی ہوں
وہ دِیے جو دوستی ہوں
(معصومہ شیرازی)
حسن انتخاب: رب نواز، کراچی

محبت ہار جاتی ہے

محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی دل سوز لمحوں سے
کبھی بے کار رسموں سے
کبھی تقدیر والوں سے
کبھی مجبور قسموں سے
مگر یہ ہار جاتی ہے
کبھی یہ پھول جیسی ہے
کبھی یہ دھول جیسی ہے
کبھی یہ چاند جیسی ہے
کبھی یہ دھوپ جیسی ہے
کبھی مسرور کرتی ہے
کبھی یہ روگ دیتی ہے
کسی کا چین بنتی ہے
کسی کو رول دیتی ہے
کبھی لے پار جاتی ہے
کبھی یہ مار جاتی ہے
محبت جیت ہوتی ہے
مگر یہ ہار جاتی ہے
(پروفیسر صفیہ سلطانہ مغل)
حسن انتخاب: طارق شاہ، کراچی

کل کے مجنوں

وہ راتیں پلکوں پہ دھری ہیں
جب دریچے جاگتے تھے
ہم تم بن نیندن کی آنکھوں سے
نظروں کی پیاس بجھاتے تھے
خاموش زبان سے کچھ کہتے، کچھ سنتے تھے
ہجر و فراق کی وادی میں
تنہا تنہا بھٹکتے تھے
خط لکھتے، خط پڑھتے تھے
لیلیٰ مجنوں، ہیر رانجھا کے
نقش قدم پر چلتے تھے
دنیا سے بغاوت کرنے کا
ہر روز ارادہ کرتے تھے
تب دنیا والوں نے ڈر کر
ہمیں ڈور میں باندھ دیا
ہم بھی خوش اور تم بھی خوش
مگر اب!
ہاں، اب!
وہ خوشیاں جانے کدھر گئیں
کہ حسن تمہارا خار لگے
اور باتیں سب عیار لگے
آٹا، چاول، تیل، گھی
اسکول کی فیس اور بجلی کا بل
بس اس کے سوا کچھ یاد نہیں
ہاں، یاد نہیں
سب باتیں چھوٹی باتیں تھیں
سب سپنے جھوٹے سپنے تھے
اک سچ یہی آخر کا
بس آٹا، چاول، گھی لاؤ
(سلیم بیگ ہمدانی)
حسن انتخاب: سمیرا یاسر، حیدرآباد

پیارے قائد!

ارباب قربان علی ایری بھاگ شہر بلوچستان

اے عظیم قائد آزادی کے دیوتا' جرات و بہادری کا نمونہ' پاکستانیوں کے دل و روح میں بسنے والے عظیم قائد' خدا آپ کی مقدس روح پر ہزاروں رحمتیں نازل کرے۔

پیارے قائد' آج میں اپنے احساسات کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور وطنِ عزیز کے موجودہ حالات سے تنگ آ کر آپ سے مخاطب ہوں۔ آج ہم تمام پاکستانی قوم آپ کے سامنے شرمسار ہیں۔ آج ہمارے دلوں میں زخم اور آنکھوں سے آنسو رواں ہیں اور ہمارے جذبات سرد پڑ گئے ہیں۔ ہمارے دل و دماغ سن ہو گئے ہیں۔ ہم محبت' امن' بھائی چارے' اخوت' اخلاقیات اور انسانی ہمدردی کے جذبات سے ناواقف ہو گئے ہیں۔ ہم کل تک آپ کے سنہرے خوابوں کے ترجمان تھے' آج ہم نے آپ کو مایوس کر دیا ہے۔ ہم نے آپ سے مطالبہ کیا تھا کہ اے جناح' ہمارے لیے ایک وطن بناؤ جس کی چھاؤں میں ہم سکھ کا سانس لے سکیں جہاں محبتوں کے گیت گائے جائیں جہاں ہمارے دین کو تحفظ ہو جہاں ہماری عصمتیں محفوظ ہوں جہاں رنگ و نسل کی کوئی قید نہ ہو جہاں محبتوں کے گلستان کی آبیاری کی جائے جہاں اپنانیت' انسانیت' چاہت اور بھائی چارے کے پھول کھلیں جہاں تعصب' قومیت' انتہا پسندی' فرقہ پرستی اور حسد کو کسی ویران قبرستان کی خاموشیوں میں دفن کر دیا جائے جہاں امن و محبت کی زبان بولی جائے جہاں پیار کے طریقوں سے سمجھایا جائے جہاں عزت کے ساتھ جیا جائے' ایک ایسا وطن' ایک ایسا دیس جو ہماری تہذیب و تمدن اور ہمارے اسلاف کے سنہری کارناموں اور زرین اصولوں کی پاسبانی کرے جہاں طلباء و طالبات علم و ہنر کے زیور سے آراستہ ہوں جہاں ملک کا مفاد ہی ملک میں بسنے والوں کی پہلی اور آخری ترجیح ہو۔

پیارے قائد' افسوس کہ ہم نے پہلے کی طرح ایک مرتبہ پھر آج آپ کو دکھ دیا پھر آپ کو رلا دیا۔ اپنے قائد کو اشکبار کر دیا۔ ہمیں یاد ہے' جب پہلی بار آپ اس وقت روئے تھے جب ہم نے مادرِ وطن پاکستان کا مطالبہ کیا تھا تو آپ کی آنکھوں سے موتی برسنے لگے جو ایک الگ ملک (پاکستان) کی گواہی دے رہے تھے۔ اُس دن ہم نے عہد کیا تھا کہ اب کبھی بھی اپنے محسن کو نہیں رلائیں گے لیکن...... لیکن پھر جب 1971ء میں مادرِ وطن دو لخت حصوں میں بٹ چکا تھا جب آپ کا خواب ہم نے انتہائی بے دردی سے بکھیر دیا تھا۔ جب ہم نے اپنے اسلاف کی قربانیوں کو نظر انداز کر دیا تھا پھر بھی آپ نے یہ صدمہ استقامت سے سہہ لیا۔ آج پھر کتنے دنوں کے بعد' کتنے موسموں کے بعد' کتنی خزاؤں کے بعد' کتنے سالوں کے بعد ہم نے اپنا عہد پھر توڑ دیا۔ عظیم قائد' آج آپ نے پھر دیکھ لیا کہ کس طرح پاکستان کے دل پنجاب میں خدا کا عذاب ڈینگی وائرس کی صورت آیا۔ وہ ملک جہاں آپ اسلامی عقائد کا بول بالا کرنا چاہتے تھے' وہاں آج انہی عقائد کا جنازہ نکالا جا رہا ہے اور کس طرح ایک صوبے کے شہر پشاور میں بم دھماکوں میں سینکڑوں معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔ ان کی جان لینے والے کون تھے؟ ایک انسان کا خون پوری انسانیت کا خون ہے تو اتنے لوگوں کے خون کو کس کے ہاتھوں میں تلاش کیا جائے؟ کس پر ذمہ داری ڈال دی جائے؟ اور کس طرح صوفیائے کرام کی سرزمین سندھ میں چند مفاد پرستوں نے سیلاب کو تباہ کن بنایا جہاں انسانیت نے درندگی کا ناچ دیکھا جہاں کئی ماؤں' بہنوں' بیٹیوں اور معصوم بچوں نے اپنے

پیاروں کو کھویا' مخلص و بہادر' غیرت مند اور مہمان نوازی کا ترجمان صوبہ بلوچستان جو باقی صوبوں سے کئی گنا بڑا ہونے کے ساتھ آج فسادات' قتل و غارت اور امن و امان کے مسائل میں بھی کئی گنا بڑا ہو چکا ہے جہاں محبت کے بجائے ڈر خوف نے جگہ لے لی ہے جہاں کے سرسبز و شاداب باغات اور جھیلیں خالی ہو چکی ہیں جہاں کی فضاؤں میں خوشبو کے بجائے بارود کی بو رچ بس گئی ہے۔ پیارے جناح' خدا کے لیے' آج اس جمہوریہ اسلامی اور اس میں بسنے والوں کو آپ کی اشد ضرورت ہے۔ لوٹ آیئے اور اس مملکت کو پھر سے امن و امان' محبت' بھائی چارے کا رنگ دے دیں۔ اے قائد' ہماری ترستی آنکھیں آپ کے انتظار میں ہیں اور ہمیں یقین ہے کہ آپ ایک نہ ایک دن کسی نہ کسی روپ میں ضرور آئیں گے۔ امید کا ایک ننھا سا دِیا میرے دل میں آپ کا انتظار بن کر ہمیشہ روشن رہے گا۔ آپ کی آمد کا بے صبری سے منتظر...... ایک پاکستانی!

پاکستان کے لیے دُعا

شیخ معظم الٰہی' لاہور۔

ہمارا پیارا ملک پاکستان آج جن مشکلات میں گھرا ہے' ایسے وقت میں ہم سب کو ایک ہونے کی ضرورت ہے۔ اسے نہ جانے کس دشمن کی نظر لگ گئی ہے؟ دن بہ دن حالات خطرناک صورت اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ شاید اللہ تعالیٰ ہم سب سے ناراض ہے یا ہمارے اعمال اچھے نہیں ہیں۔ ہم نماز' روزہ' زکوٰۃ' میں غفلت کر رہے ہیں۔ قرآنِ پاک کا پڑھنا چھوڑ دیا ہے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی غلطیوں کا ازالہ کریں اور اپنے رَب کو راضی کریں۔ اس کے علاوہ کثرت سے استغفار پڑھیں۔ اپنے دین سے محبت کریں۔ میری آپ سب پاکستانیوں سے درخواست ہے کہ اپنے علاقے یا محلے میں جمعتہ المبارک کے روز جمع ہو کر اللہ تعالیٰ سے نہایت عاجزی اور انکساری کے ساتھ اور سچے دل سے توبہ کرنے کے بعد دُعا مانگیں۔ اے اللہ! ہمارے ملک پاکستان پر جو مصیبتیں' آفات چھائی ہوئی ہیں' انہیں ختم کر دے اور اس کے دشمنوں کو مٹا دے۔ ہمارا ہر آنے والا دن ہمارے لیے خوشیوں کا پیغام لے کر آئے۔ ہر طرف سکون ہی سکون ہو جائے اور بغض کی لعنت کو ختم کر دے۔ کراچی اور کوئٹہ کے حالات ٹھیک کر دے۔ (آمین!)

زندگی کیا ہے؟

محمد سہیل خان' کورنگی۔

زندگی نے زندگی سے پوچھا۔ ''زندگی کیا ہے؟'' زندگی نے کہا۔ ''زندگی نام ہے غم اور خوشی کا جو ایک ساتھ ہوتے ہیں۔ اب یہ آپ پر منحصر ہے کہ آپ اپنی زندگی کس طرح گزارتے ہیں؟ اگر زندگی ماں میں ڈھونڈو تو اس کی پوری زندگی اپنی اولاد پر نچھاور اور قربان ہونے میں گزر جاتی ہے اور اگر ماں نہ ہو تو یہی زندگی ایک قبرستان کی طرح ہے جو کہ ویران ہے۔ اگر یہ زندگی باپ میں تلاش کرو گے تو وہ اپنی جوانی اپنے بچوں کے اچھے مستقبل پر لگا دیتا ہے۔ اگر زندگی میں باپ نہیں ہے تو یہی زندگی مصیبت زدہ اور بے بس ہے۔ زندگی کا نام ہے ایک بیوی کا جو زندگی کو جنت بنانے میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اگر زندگی میں بیوی نہیں ہو تو پھر زندگی ادھوری ہے۔ اگر اس زندگی میں بھائی کا ساتھ ہو تو وہ ایک بازو ہے۔ اگر بھائی نہیں ہے تو یہی زندگی بے معنی ہے۔ زندگی نام ہے ایک بیٹے کا جو کہ والدین کا سہارا ہوتا ہے۔ اگر بیٹا نہیں ہے تو زندگی بے جان ہے۔ زندگی نام ہے بیٹی کا جو رات دن گھر میں چہکتی اور مہکتی رہتی ہے۔ اگر بیٹی نہ ہو تو گھر میں سناٹا رہتا ہے۔ زندگی نام ہے ایک بہن کا جو رات دن اپنے گھر والوں کے لیے دُعا کرتی ہے اور اگر بہن نہ ہو تو زندگی' زندگی نہیں۔ زندگی نام ہے شوہر کا جو کہ اپنی بیوی

کا جیون ساتھی ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو یہ زندگی شوہر کے بغیر ایک پہاڑ ہے۔ ان سب لوگوں کو جمع کیا جائے تو یہ زندگی ایک پروقار اور خوش و خرم ہے کیونکہ زندگی ایک بار ملتی ہے تو آئیں ہم سب مل کر اس زندگی کی خوشیاں لوگوں میں بانٹیں اور خوش رہیں اور خوش رکھیں کیونکہ ہم سب کی زندگی ایک دوسرے کی زندگی سے وابستہ ہے کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی ایک نعمت ہے۔ کیوں نہ ہم اس زندگی کو خوب صورت بنائیں۔

انقلاب

اُم عادل

رنگ و محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی نہیں

یہ شعر شاعر نے نہ جانے کس تناظر میں کہا ہوگا مگر ہم خود ساختہ مظلوموں کے موجودہ دور میں ہمارے سیاست دان لوٹے جگہ اور پارٹیاں بدل بدل کر نہ جانے کس انقلاب کی باتیں کر رہے ہیں؟ میں نے لفظ خود ساختہ مظلوم اس لیے استعمال کیا کہ ہم سب ون ٹو آل نفسانی' شیطانی خواہشات کے اسیر ہو چکے ہیں۔ ہم خود ہی ظالم ہیں مگر مظلومیت کی دُہائی دیتے ہیں۔ ہر شخص اگر اپنے گریبان میں جھانک لے تو پھر کسی کی طرف انگلی اٹھانے کی فرصت نہ ملے۔ جب ہم ذاتی طور پر اپنے نفسِ امارہ کو کنٹرول نہیں کر سکتے تو دوسروں کی کردار کشی کا حق کیونکر رکھتے ہیں؟ جب ہر ایک فرد اپنے ایمان کو کہیں دفنا چکا تو پھر ہر فرد مظلوم کیوں' ظالم کیوں نہیں؟ ہم چور بازاریاں' حق تلفیاں اور ناانصافیاں کر کے جو ظلم کا بازار معاشرے میں گرم کر رہے ہیں' اس سے کہیں بڑا نقصان و ظلم اپنے نفس پر کر رہے ہیں جو نہ یہاں مطمئن و سرخرو نہ آخرت میں لائق روبرو خدا بلکہ ہم جیسی اپنی دشمن آپ قوم کو تو رَبِ باری تعالیٰ بنا سوال جواب براہِ راست جہنم واصل فرما دیں گے۔ یہاں ہر فرد کو اپنے بے مہار نفس کو مہار ڈالنے کی ضرورت ہے۔ واقعی چند نفوس کے اچھا سوچنے سے کچھ بھی اچھا نہیں ہو سکتا جب معاشرے کا ہر فرد اپنے نفس کو پچھاڑے گا' وہی ایک مکمل اور حقیقی انقلاب ہوگا۔

ہم کہاں کھڑے ہیں؟

ممتاز احمد' سٹلائٹ ٹاؤن' سرگودھا۔

چند روز پہلے میں سرگودھا کے مشہور اور بارونق کچہری بازار سے گزر رہا تھا کہ دیکھا' ٹریفک رکی ہوئی ہے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ دو گاڑیوں والے صاحبان آپس میں جھگڑ رہے تھے اور سڑک پر کھڑے ہو کر سخت جملوں کے تبادلہ کے ساتھ ایک دوسرے کو خطرناک نتائج کی دھمکیاں دے رہے تھے اور خوب غصے کا اظہار کر رہے تھے۔ قریب تھا کہ گالی گلوچ کے بعد ہاتھا پائی کی نوبت آتی' ٹریفک پولیس نے فوراً مداخلت کی اور چند منٹوں میں ٹریفک کے لیے راستہ کلیئر کروایا۔ ان دونوں صاحبان کے درمیان جھگڑے کی وجہ معلوم ہوئی تو پتہ چلا کہ اگلی گاڑی والا ڈرائیور موبائل فون پر کسی سے بات کرنے میں مگن تھا اور گاڑی بہت سست روی سے چلا رہا تھا جبکہ پچھلی گاڑی کا ڈرائیور مسلسل ہارن بجائے جا رہا تھا۔ اگلی گاڑی والا پچھلی ٹریفک کو آگے گزرنے کا راستہ نہیں دے رہا تھا جس کی وجہ سے پیچھے گاڑیوں اور موٹر سائیکلوں کی لمبی لائن لگ گئی۔ جب موصوف کی کال ختم ہوئی تو اس نے بیچ سڑک پر گاڑی کھڑی کر کے سڑک پر آ کر پچھلی گاڑی کے ڈرائیور کو برا بھلا کہنا شروع کر دیا کہ مسلسل ہارن کیوں بجا رہے تھے جس کی وجہ سے اسے فون سننے میں دشواری پیش آ رہی تھی جبکہ پچھلی گاڑی والے کا موقف تھا کہ اسے کہیں جلدی پہنچنا ہے اور راستہ نہ ملنے کی وجہ سے وہ ہارن بجا رہا تھا اور اسی بات پر دونوں میں تلخ کلامی کی وجہ سے جھگڑا ہو رہا تھا۔ وہ تو بھلا ہو ٹریفک پولیس کا جنہوں نے بروقت پہنچ کر معاملہ رفع دفع کروایا اور سنگین صورتِ حال سے دونوں کو بچا لیا۔ مزے کی بات یہ ہے کہ دونوں کے پاس ڈرائیونگ لائسنس نہیں تھے۔ دونوں گاڑیوں کے مالکان بظاہر پڑھے لکھے اور وضع قطع سے مہذب نظر آ رہے تھے مگر اُن دونوں کی گفتگو اور تو تکار سے ذرا بھی محسوس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ مہذب اور پڑھے لکھے ہیں۔ اس قسم کی صورتِ حال اکثر سڑکوں پر دیکھنے کو ملتی ہے' لوگ بڑی بڑی اور مہنگی گاڑیاں تو خرید لیتے ہیں مگر ٹریفک قوانین کی پروا نہیں کرتے' مہنگے اور عمدہ لباس بھی زیبِ تن کر لیتے ہیں مگر اپنی زبان اور گفتگو سے ذرا بھی شائستگی اور مہذب پن کا مظاہرہ نہیں کرتے حالانکہ ڈرائیونگ کے دوران موبائل فون سننے اور بات کرنے کی اجازت نہیں ہے اور اس وجہ سے کئی جان لیوا حادثات بھی رونما ہو چکے ہیں۔ اسی طرح مسلسل ہارن بجا کر بے جا شور کرنا بھی دوسروں کو سخت اذیت میں مبتلا کرنے والی بات ہے۔ یہ سب دیکھ کر خیال آتا ہے کہ ہم کہاں کھڑے ہیں؟ کیا ہم مہذب' قوانین پر عمل کرنے والے امن پسند شہری ہیں؟ ذرا سی بات پر طیش میں آ کر آگ بگولہ ہو جانا ہمارا وطیرہ ہے۔ ہمارے اندر نہ تو برداشت ہے اور نہ ہی احساس کہ ہماری ایسی چھوٹی چھوٹی حرکتوں اور عمل سے دوسروں کو کتنی ذہنی اور جسمانی اذیت ہو رہی ہے۔ دوسرے لوگ کتنا متاثر ہو رہے ہیں۔ آخر ہمارے اندر شعور' دوسروں کا خیال رکھنے کا جذبہ' برداشت' صبر و تحمل اور اچھا اخلاق کب پیدا ہوگا؟

تقسیم در تقسیم اور دہشت گردی

کرن شبیر' کراچی۔

14 اگست 1947ء تاریخ کا حسین ترین دن جب مسلمانوں نے کئی قربانیوں کے بعد ایک ملک پایا تھا جس کا نام پاکستان رکھا گیا۔ یہ مسلمانوں کی انتھک محنت تھی جو کہ قیامِ پاکستان کا باعث بنی۔ اس وقت مسلمانوں کے ذہن میں ذات پات کے فرق نہیں تھے۔ ہمارے آباؤ اجداد صرف اتنا جانتے تھے کہ ہم مسلمان ہیں اور ہمیں ایک الگ ملک چاہیے جہاں اسلامی نظام قائم کر سکیں۔ قائد نے تو مذہب کا بھی فرق مٹا دیا تھا اور اس ملک میں تمام مذہبوں سے تعلق رکھنے والوں کو آزادی دی تھی کہ وہ جس طرح چاہیں' رہیں اور اپنی عبادات کریں' ان کو یہاں تحفظ ملے گا مگر آج ان کا تحفظ تو کجا' ہم تو مسلمانوں کا تحفظ نہیں کر سکتے۔ ہم نے مسلمانوں میں تقسیم شروع کر دی ہے' یہ سنی ہے' وہ شیعہ ہے' یہ مہاجر ہے' وہ پٹھان ہے' وغیرہ وغیرہ اور اس تقسیم میں آپس میں جنگ شروع کر دی ہے۔ کبھی مہاجر' کبھی پٹھان اور کبھی اہلِ تشیع دہشت گردی کا نشانہ بن جاتے ہیں جبکہ ان کا کوئی قصور نہیں ہوتا پھر انہوں نے بدلے کے لیے جنگ چھیڑی جس میں کئی اور معصوم جانیں ضائع ہوئیں۔ کیا ہم قائد کی بات بھول گئے؟ اگر قائد کی بات بھول گئے تو کیا ہم رحمت اللعالمین ﷺ کی بات بھی بھول گئے جو کہ مسلم و غیر مسلم دونوں کے حقوق کو ترجیح دیتے تھے؟ کیا ہم یہ بھی بھول گئے کہ اسلام میں واضح حکم ہے کہ ایک انسان کا قتل ساری انسانیت کا قتل ہے۔ ہم تو ان اندھیروں میں جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں کہ جہاں ذرا سی بات پر دو قبیلوں کے درمیان جنگ چھڑ جاتی تھی جو کہ صدیوں تک جاری رہتی تھی۔ اسی سیاہ دور سے ہمیں حضورِ انور ﷺ نے باہر نکالا تھا۔ ہم پھر وہیں جاتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ سیاسی پارٹیوں نے بھی اس تقسیم کو بڑھاوا دیا ہے۔ اب پاکستان کا جھنڈا کم اور ان سیاسی پارٹیوں کے پرچم زیادہ نظر آتے ہیں۔ جہاں کسی دو پارٹیوں میں جنگ ہو' وہاں انسانی جانوں کا ضیاں شروع ہو جاتا ہے۔ یہ پارٹیاں طلباء کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں اور پھر جہاں کسی پارٹی کا زوال ہوتا ہے' اس پارٹی سے منسلک طلباء کی جانوں پر بن آتی ہے۔

اللہ ہمارے ملک کو اپنے حفظ و امان میں رکھے اور ہمیں پھر سے متحد کر دے۔ (آمین!)

زندگی اور فطرت کا شاعر

خلیق الرحمٰن

کے مجموعہ کلام ''دامنِ کوہ میں شام''

پر تجزیاتی نوٹ

عکاشہ سحر

ادب حقیقتاً تہذیب و شائستگی کا دوسرا نام ہے اور جب سے دنیا قائم ہوئی ہے' انسان غم و نشاط اضطراب وسکون' دکھ سکھ' درد و راحت کا مجموعہ ہے اور یہی دو عناصر انسان کی زندگی میں پیوست ہو جاتے ہیں۔ تخلیق کار پر یہی حالات زندگی کی تلخیاں اور ماحول کچھ ایسے انداز میں اثر کرتے ہیں کہ وہ حزن و ملال میں ڈوب کر کچھ ایسے شاہکار تخلیق کرتے ہیں جو ہمیشہ کے لیے امر ہو جاتے ہیں۔

اس ماہ کتاب تبصرے میں جس مجموعۂ کلام پر چند حرف لکھے ہیں' وہ اسلام آباد سے تعلق رکھنے والے نظم کے بہت اعلیٰ شاعر خلیق الرحمان کا مجموعۂ کلام ''دامنِ کوہ میں شام'' ہے۔ نظموں پر مشتمل اس کتاب کا ٹائٹل بہت دل آویز اور خوبصورت ہے۔ امجد اسلام امجد اور ایم ایم ادیب کی رائے سے سجا منفرد مجموعۂ کلام حیرت و اسرار کے کئی در وا کرتا ہے۔

خلیق الرحمان کی نظم میں درد و غم' حزن و ملال اور یاس کا ایک طویل سلسلہ ملتا ہے لیکن موضوعاتی طور پر ان کا کینوس بے حد وسیع ہے۔ متنوع اور نادر موضوعات زندگی کے مختلف رنگوں کی تصویریں پیش کرنے کے ساتھ ساتھ خلیق الرحمان نے مناظرِ فطرت کی جیسی عکاسی کی ہے' وہ ان کے ہم عصر شعراء میں خال خال ہی نظر آتی ہے۔ خوبصورت مصرعے جنہیں پڑھتے ہوئے سرشاری کا احساس ہوتا ہے' رمز و ایمائیت' موسیقیت اور غنائیت' ہجر و فراق کا نوحہ اور زندگی کی نزاکتوں کا بیان' عصری شعور کی جھلک اور یہ بھی حقیقت ہے کہ تاثیرِ غم بہت گہری اور دیرپا ہوتی ہے۔

''باتیں گیلی ہو جاتی ہیں'' کی چند لائنیں......

وہ دن بھی تھے\
جب تیز ہوا کی بارش میں\
ہم اک چھاتے کے نیچے پہروں چلتے تھے\
یوں لگتا تھا ناں'\
برساتوں میں اُن باغوں میں دن بھی جیسے رک جاتے تھے\
فٹ پاتھوں پر\
جوتے' تسمے' موزے گیلے ہو جاتے تھے

•......•......•

خلیق الرحمان کی نظموں میں مصرعوں کی بندش' مضمون کی شادابی اور شیرینی خوب ہے۔ اُن کی نظم کا معنوی کینوس بے حد وسیع ہے جو اُن کی فنی و فکری پختگی اور شعری ریاضت کا نتیجہ ہے۔

''قبر میں خواب''

سو کے اٹھا تو اپنے بستر پر\
دیکھتا ہوں ٹٹول کر خود کو\
خواب میں رات مر گیا تھا میں

•......•......•

خلیق الرحمان کی نظموں میں روانی اور بہاؤ کی کیفیت کمال درجے کی ہے۔ تسلسل' ربط اور احساسات کی نزاکت اُن کی نظموں کا خاصا ہیں۔ ان کی نظموں میں تصور پرستی اور حقیقت نگاری کا ایک

ایسا امتزاج ہے جیسے سچے موتیوں میں آب کی جھلک
شگفتگی، دل پذیری...... انہیں اظہار و ابلاغ کے فن پر
قدرت حاصل ہے۔ ندرتِ خیال، لطافتِ خیال اور
رنگینیٔ خیال کی روشن مثال، تازہ افکار اور زندگی کے
تجربات کا انوکھا اندازِ بیاں......

''المناک بارش''
وہ گھڑی کون تھی
رات شیشے کی مانند ایسی گری
کرچی کرچی ہوئی
ریزہ ریزہ ہوئی
درد کا آب بہتا، سرکتا ہوا
دکھ کی ڈھلوان پر
میری آنکھوں کے بھیگے ہوئے طاقچوں سے
ٹپکنے لگا
دل دھڑکنے لگا
سکھ بدن پر جو برسوں سے بجتی رہی
اک المناک بارش کے طوفان میں
میرے جیون کی پوشاک گیلی ہوئی
اور آنکھوں کی درزوں میں سوکھی ہوئی
اک زمانے کی مٹی بھی سیلی ہوئی

•......•......•

خلیق الرحمان کی نظموں میں جہاں پختگی اور حقیقت بیانی ہے، وہاں ترنم، شیرینی، لطافت اور سنجیدگی بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔ وہ سادگی اور سچائی کے ساتھ انسانیت کو درپیش مسائل پر گفتگو کرتے نظر آتے ہیں۔

''سانحہ ہونے کو ہے''
اک وقوعہ جو کہ برسوں سے ہماری گھات میں
ان ساعتوں کی اوٹ میں
بیٹھا ہے اندھے موڑ پر
سفاک لمحوں میں ہمارے روبرو ہونے کو ہے
اس زندگی کے راستے پر چلتے چلتے
کس گھڑی، کس گام پر......
کس دن، کہاں پر، کیا سے کیا ہونے کو ہے؟
اک سانحہ ہونے کو ہے!!

•......•......•

نظم فرد کی ذات کا آئینہ ہے، چنانچہ اگر نظم کو انسانی زندگی میں انفرادیت کے بھرپور اظہار کی ایک صورت قرار دیں تو اس کے مزاج کا ایک اہم پہلو بالکل آئینہ ہو جائے گا اور یہ بھی حقیقت ہے کہ خلیق الرحمان کی نظموں میں زندگی کے تمام تر رنگ نظر آتے ہیں۔

''وقتِ عدالت میں سقراط کا مقدمہ'' خلیق الرحمان کی ایک منفرد اور خوبصورت نظم ہے۔ اس میں کرافٹ کی بلندی اور موضوعاتی حسن دیکھیے، ہر مصرعہ، ہر لائن ایک شاہکار۔

اے سقراط......!
میں نے عدالت میں تجھ کو سنا تھا
تری گفتگو جو سلیقے سے معمور تھی، اس کے اندر
بڑے پیچ تھے۔
سب مخالف گواہان کے جو بیانات تھے، ٹھیک تھے
تو نے ایتھنز کے نوجوانوں کو
ان کے خداؤں سے بدظن کیا تھا
تری منطقی دلنشیں گفتگو نے
ستاروں کے سب دیوتاؤں کو نالاں کیا تھا
اے سقراط......!
میں وقت کی اس عدالت میں تاریخ کے فیصلے کو
زمانوں کے روزن سے لگ کر کہیں دور کونے میں
بیٹھا ہوا سن رہا تھا۔
افلاطون کے آنسوؤں کی نمی
خاکناؤں کی مٹی بھگونے لگی تھی
ارسطو، تری ''معذرت'' کی کہانی کو سن کر

تمدن کے اوراق پر جگمگاتی ہوئی روشنائی سے
آتے زمانوں کے کتنے فروزاں نئے شبد لکھتا
چلا جا رہا تھا
عدالت میں جو بھی کہا تھا گواہوں نے
سب ٹھیک تھا
نوجوانوں کو گمراہیوں کی طرف تو نے ڈالا تھا
تو ہی ستاروں کو بے جان کہتا تھا
مریخ کے جگمگاتے ہوئے دیوتاؤں پہ تو نے ہی
تنقید کی تھی
اے سقراط......! تعظیم کے دیوتاؤں کی مٹی
خلائی جہازوں میں بیٹھے
ترے ہم خیالوں نے پامال کی ہے......!
وہ سب مدعی جو عدالت میں موجود تھے
ان کا دعویٰ بجا تھا
تو روشن زمانوں کا مجرم تھا
سقراط...... میں وقت کی اس عدالت کی چوکھٹ
پہ اب تک کھڑا
زہر پیتے ہوئے جب تجھے دیکھتا ہوں
تو اونچی اڑانوں کو نکلے
خلاباز قدموں میں
نیلے ستاروں کو گرتے ہوئے دیکھتا ہوں

•......•......•

فکر و نظر میں وسعت، مشاہدے میں باریک بینی، تجربے میں پختگی اور سوچ میں گہرائی، تشبیہات و علامات منفرد ہیں۔ حقیقت بیانی میں تلخی نہیں، رجائیت ہے۔

''پرانی ڈائری اور البم''
وقت ہمیشہ رک جاتا ہے
تحریروں میں، تصویروں میں
لوگ نکل جاتے ہیں آگے
اپنی اپنی تقدیروں میں

•......•......•

ہجر و فراق، فکر و احساس، جذبوں کی گہرائی اور گیرائی، فکری صداقت اور جذبوں کی سچائی...... نے خلیق الرحمان کی نظم کو تازگی اور شگفتگی بخشی ہے۔

''اداسی کے کمروں سے باہر نکل کر!''
کبھی یاسیت کے تم آنگن سے نکلو
تو دیکھو
کہ اس زندگی کے دریچوں میں ہیں کتنے مانوس چہرے
ہمیں جو سدا زندگی سے محبت سکھاتے رہے ہیں
ہماری امیدوں کے دیپک جلاتے
دکھوں کے کبھی نشتروں کو
خود اپنے ہی دل پر ہمارے لیے جھیل جاتے
رہے ہیں
یہ بچوں کے گالوں پہ بنتے ہوئے سرخ ڈمپل
وہ بوسے ہیں جو دائمی الفتوں کو
محبت کے نغمے سناتے رہے، گدگداتے رہے ہیں

•......•......•

''دامنِ کوہ میں شام'' میں غمِ دوراں اپنی تمام تر کسک کے ساتھ جلوہ گر ہے، کڑوی کسیلی حقیقتیں بھی ہیں اور داخلیت و خارجیت کا حسین امتزاج بھی۔ خلیق الرحمان اپنے عہد کے عصری تقاضوں اور فکری رجحانات سے بخوبی واقف ہیں۔

''وقتِ ماضی کی بالکونی!''
اداس جنگل کی خامشی میں
گھنیری آواز پنچھیوں کی
لٹکتی بیلوں کی جھالروں میں، چھنکتے پل چھن کے
بانکپن میں،
حسین شامیں قدیم پتوں سے اُگ رہی ہیں، ہوا کے
ازلی لبوں کو بارش کے سرد قطروں نے ڈھک دیا ہے......
یہ وقتِ ماضی کی بالکونی میں کون بوڑھا ہے......

''دامنِ کوہ میں شام'' کھنڈر محل کی داستان کا

کردار بنتے ہوئے میں ہی تنہا نہیں'
سنولائی ہوئی شام میں اوپیرا کا ایک منظر
غزل کے چاندی ورق پہ سنہری شام
قدیم منظر میں خواب' میرے آنسو نہیں تھمتے
راحت خاموش ہے' شام ڈھلنے لگی' وہ عجیب رات تھی' فاحشہ عورتیں' کاسنی دھند میں' نرالی کتھا سن رہا ہوں' کبھی روشنی میری رفتار ہوگی' میری آنکھوں کے سبز پتوں سے' ڈھول ہوتے ہوئے منظروں میں واک' دستک' اپنے موضوعات' عنوانات اور مضامین کے حوالے سے منفرد نظمیں ہیں۔

''یہ خاموش مجسمے...... یہ سنسان شامیں!''
کسی ماتمی تعزیے میں کھڑے ہیں
پشیمان غفلت زدہ زندگی میں گھروں سے نکل کر
کہیں بھی کبھی ہم پہنچتے نہیں ہیں

•......•......•......•

''دجلہ کی آنکھوں نے کیسا منظر دیکھا!''
بارودی جب رات ڈھلی تو
دن کا خونی آنسو ٹپکا
دجلہ کی دھندلی آنکھوں نے بھور بھئے اک منظر دیکھا
خستہ ٹوٹے دروازوں سے...... دیواروں سے
بے رحمی کا دھواں نکلا
بھوکے بچے کی سسکی سے
خاموشی کا شیشہ ٹوٹا

شاعری تنقید حیات ہے اور جو شاعری بے مقصد ہو' وہ وقت کشی کے مترادف ہے۔ اس تعریف کے تناظر میں اگر ''دامنِ کوہ میں شام'' کا مطالعہ کیا جائے تو اس میں وہ تمام خوبیاں موجود ہیں جو ایک کامیاب اور بامقصد شاعری کا طرۂ امتیاز ہیں۔
بہت سی دعائیں خلیق الرحمان کے روشن مستقبل کے لیے۔

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار' ادبی ذوق کے آئینہ دار

منیر نیازی...... ارباب قربان علی اریی' بولان
کسی کو اپنے عمل کا حساب کیا دیتے
سوال سارے غلط تھے' جواب کیا دیتے

عبدالحمید عدم...... اُمِ عادل' کراچی
بدلا ہے کس انداز سے مفہوم کو اس نے
گو بات کی وہ شکل نہیں' بات وہی ہے
آئندہ بدل جائے تو کچھ کہہ نہیں سکتے
اب تک تو عدم صورتِ احوال وہی ہے

سید وصی شاہ...... سرتاج احمد چانڈیو' حیدرآباد
اپنے احساس سے چھوکر مجھے صندل کردو
میں کہ صدیوں سے ادھورا ہوں' مکمل کردو

علی آزر...... صفیہ سلطانہ' جیکب آباد
دسمبر کی آخری شب نہ پوچھو کس طرح گزری
مجھے لگتا تھا' یہ ہر دم کہ وہ کچھ پھول بھیجے گا

پروین شاکر...... غزالہ شاہین' حیدرآباد
جسم و جاں سے اترے گی گرد پچھلے موسم کی
دھو رہی ہیں سب چڑیاں اپنے پنکھ چشموں پر
ساری رات سوتے میں مسکرا رہا تھا وہ
جیسے کوئی سپنا سا کانپتا تھا ہونٹوں پر

کا ی شاہ...... شاہد فراز' حب چوکی
تو کیوں ویران ہو جائیں نہ ہم تم
ہمیں تو پیار بھی آدھا ملا ہے
ترے ہونٹوں کو چھو کے دیکھنے کا
ارادہ ہے مگر ٹوٹا ہوا ہے

عبدالعزیز جی آ...... علی فراز' چکوال
جیسے ہی نظر مجھ کو خوشیوں کا ہلال آیا
پھر یادِ وطن آئی اور تیرا خیال آیا

پرویز ساحر...... خان احمد' کوٹ ڈیجی خان
اُس سے کہنا کہ مجھے یاد نہ آیا کرے وہ
جانتا ہوں' وہ یہ احسان بھی کرنے کا نہیں
چاہے تم جتنے بھی اسباب مہیا کرلو
اس طرح قافلۂ عمر ٹھہرنے کا نہیں

ایم خالد فیاض...... سلمان عمرانی' ٹھٹھہ
اتر کر دور تک دیکھا' تو جانا
میں خود کو آج پہچانا' تو جانا
اکیلا کس قدر تھا میں ہجوم میں
اکیلے بیٹھ کر سوچا تو جانا

غالب عرفان...... مہربانو' مکلی
دیواروں کے اوپر چھت رکھی ہوئی ہے
اس پہ مگر امید بہت رکھی ہوئی ہے
حد سے زیادہ نزدیکی میں دوری پنہاں
اور دوری میں قربت رکھی ہوئی ہے

نصیر احمد ناصر...... آفاق سلیم' جھنگ
رنگ تھا کہ خواب تھا
جو بھی تھا' سراب تھا
وہ مجھے نہ پڑھ سکا
میں کھلی کتاب تھا

فرخ اظہار...... راشد رفیق' شورکوٹ
اس قدر بوجھ ہے سینے پہ زندگی کا مرے
جو سانس لوں تو خراشوں سے خون رِستا ہے

کاشی چوہان...... عباس تابش' کراچی
بے وفائی' جفا' ستم' سب کچھ
تم نے سکھلایا جو کبھی' سیکھ لیا

نجم عثمانی...... ذیشان بخاری' والٹن
محفوظ کہاں روح بھی رہتی ہے تپش سے
اس آگ سے اک جسم ہی ایندھن نہیں ہوتا

نوراً رہِ دشوار دکھا دیتی ہے دنیا
تقدیر میں ہر طفل کے بچپن نہیں ہوتا
یعقوب تصور...... ریاض علی، پتوکی

الجھ گیا ہے یقیں بھی گماں کے تاروں میں
مرا ستارہ نہیں آسماں کے تاروں میں
میں اس زمیں پہ رہوں یا پھر آسماں پہ رہوں
مقام میرا نہیں درمیاں کے تاروں میں
عنبرین حبیب عنبر...... فلک خان، کراچی

تمام عمر کی پیہم مسافتوں سے کھلا
سفر ہے سلسلۂ رہ گزار ہونے سے
ہم اپنے مدمقابل ہیں شعرگوئی میں
کسی کی جیت سے مطلب' نہ ہار ہونے سے
کاشف حسین غائر...... مہر پرویز دولو میاں چنوں

بچھڑتے وقت رکھے اپنے فیصلے پہ قدم
میں جانتا تھا' زمیں زیرِپا نہیں ہوگی
شاہین عباس...... صبیحہ امتیاز، ڈسکہ

آتشِ غم پہ نظر کی ہے کچھ ایسے کہ یہ آنچ
بات کر سکتی ہے اب میرے برابر آکر
احمد شہزاد...... نائلہ غضنفر، کراچی

رنگ نکل جاتے ہیں سارے' خاک پرانی رہ جاتی ہے
اڑ جاتی ہے ایک کہانی' ایک کہانی رہ جاتی ہے
ثناء اللہ ظہیر...... شائلہ اختر، لاہور

کتنی زرخیز ہے نفرت کے لیے دل کی زمیں
وقت لگتا ہی نہیں فصل کی تیاری میں
خواجہ رضی حیدر...... عادل گلزار، فیصل آباد

عجیب ساعتِ انجام اختلاف آئی
تُو میرے دل سے اٹھا اور تری راہ سے میں
شاہین عباس...... شعبان کھوسہ، کوئٹہ

اک نقش ہو نہ پائے اِدھر سے مرا اُدھر
جیسا تمہیں ملا تھا میں' ویسا جدا کرو

انعام ندیم...... روبینہ علیم، جہلم

اُس ہاتھ کا تحفہ ہے یہ داغ مرے دل پر
یہ داغ بھی اب لیکن جاتا نظر آتا ہے
کاشف مجید...... راشدہ علی، کوٹ ڈیجی خان

گلاب جس کے لیے ہے' اسے خبر کروں میں
وہ دن بھی آئے کہ اس کی طرف سفر کروں میں
ادریس بابر...... نگہت منیر، اوکاڑہ

کبھی تو اس کے گھر بھی جا کے دیکھیے
یہ خواب اس کا مستقل پتا نہیں ہے
ثناء اللہ ظہیر...... فرح عالم، اسلام آباد

اتنا احساسِ جرم تھا مجھ کو
میں سزا سے بھی مطمئن نہ ہوا
عرفان ستار...... نسیم شفیق، اسلام آباد

وہ ایک پل ہی سہی جس میں تم میسر ہو
اُس ایک پل سے زیادہ تو زندگی بھی نہیں
کاشف حسین غائر...... ایم سعید انور سعید، لاہور

ہے کارِ عشق وہ نیکی کہ عمر بھر ہم کو
ثواب ملتا رہے گا کسی پہ مرنے کا
عنبرین حبیب عنبر، عاصم خان نیازی، میانوالی

ستارہ بار بن جائے نظر' ایسا نہیں ہوتا
ہر اک امید بر آئے مگر ایسا نہیں ہوتا
محبت اور قربانی میں ہی تعمیر مضمر ہے
در و دیوار سے بن جائے گھر ایسا نہیں ہوتا
کاشی چوہان...... شہروز شریف، کراچی

دیکھ کے تنہا مجھ کو میرے سر ہو جاتی ہے
تنہائی بھی کتنی طاقت ور ہو جاتی ہے

نوٹ: شعر کے ساتھ شاعر کا نام ضرور لکھیں۔
شاعر کے نام کے بغیر شعر شاملِ اشاعت نہیں کیا جائے گا۔ (انچارج) پسند اپنی اپنی

آپ کی خبر

انتقالِ پُرملال

سجاول سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست شاعر اور قاری علی رضا عمرانی کے والد محترم جناب خیر محمد عمرانی گزشتہ ماہ زمیں کا رزق ہوئے۔ ادارہ علی رضا عمرانی کے غم میں برابر کا شریک ہے اور اہلِ خانہ کے لیے صبر کی دُعا کرتا ہے۔

بس دعا چاہیے

☆...... ہمارے دوست لکھاری عبدالعزیز جی آ' ان دنوں عارضۂ استھما (دمہ) کا شکار ہو کر لاہور کے ایک سرکاری اسپتال میں زیرِ علاج ہیں۔ ادارہ قارئین سے اُن کی صحت اور تندرستی کے لیے دُعا کی اپیل کرتا ہے۔

☆...... کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست' شاعر اور کہانی کار احمد واصفی کے والد محترم بوجوہ عارضۂ قلب شدید علیل ہیں۔ قارئین سے اُن کی صحت یابی کے لیے دُعا کی اپیل ہے۔

کتاب خبر......

☆...... ہمارے بہت دیرینہ رفیق اور ہردلعزیز لکھاری انور فرہاد کی خوبصورت شاعری سے سجا مجموعۂ کلام "چاند گہن" زین پبلی کیشنز کے توسط سے شائع ہو گیا ہے۔ انور فرہاد جس طرح ہمارے باکمال لکھاری ہیں' اسی طرح اُن کی اعلیٰ پائے کی شاعری میں بھی زندگی بھر کی خوبصورتیاں سمٹ کر "چاند گہن" میں ضم ہو گئی ہیں۔ ادارہ انور فرہاد کو کتاب کی آمد پر مبارک باد پیش کرتا ہے اور ان کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے دُعا گو ہے۔

☆...... ہماری دوست' شاعرہ فریدہ خانم جن کا تعلق لاہور سے ہے' فریدہ خانم کی شاعری کا منفرد اور مختلف مجموعۂ کلام بنام "مختلف" شائع ہو کر ادبی فضاؤں میں رنگ جما رہا ہے۔ ادارہ اس کامیابی پر انہیں مبارک باد پیش کرتا ہے۔

☆...... کوئٹہ سے تعلق رکھنے والے ہمارے دوست شاعر احمد واصفی کا مجموعۂ کلام "خواب سب مر جاتے ہیں" شائع ہو چکا۔ ادارہ احمد واصفی کو مجموعے کی اشاعت پر مبارک باد پیش کرتا ہے۔

☆...... ہماری دوست شاعرہ فریدہ جاوید فری' لاہور کی کتاب "پانچواں موسم" شائع ہو چکی ہے۔ ادب کی دنیا میں "پانچواں موسم" پسند کی جا رہی ہے۔ ادارہ انہیں اس کامیابی پر مبارکباد پیش کرتا ہے۔

☆...... خوبصورت لب و لہجے کی شاعرہ عنبرین حبیب عنبر کا مجموعۂ کلام "دل کے افق پر" شائع ہو کر اہلِ ادب میں مقبولیت حاصل کر رہا ہے۔

☆...... ناہید شبروانی کا مجموعۂ کلام "نوید سخن" الحمد پبلیکیشنز' کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہو گیا۔

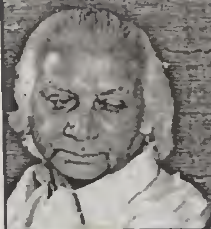
☆...... ہندوستان کے معروف افسانہ نگار رضا جعفری کا افسانوی مجموعہ "راستے کھول دو" الحمد پبلیکیشنز' کراچی کے زیرِ اہتمام شائع ہو چکا ہے۔

خوشی کی خبر

☆...... ہماری دوست لکھاری سویرا فلک کے گھر میں خدا نے اپنی رحمت نازل کی ہے۔ بیٹی کی صحت اور درازیٔ عمر کی دُعا کے ساتھ ادارہ مبارک باد پیش کرتا ہے۔

☆...... ہمارے نامور لکھاری دوست ایڈیسن ادریس مسیح تیزی سے روبہ صحت ہیں۔ ادارہ اُن کی مکمل صحت یابی کے لیے دُعا گو ہے۔

"آپ کی خبر" کا حصہ بننے کے لیے
تمام رائٹرز اور قارئین بلاجھجک اپنی خبریں ادارے کو بھیج سکتے ہیں۔



بازگشت

اَب انہیں ڈھونڈ

میرا شہر ان دنوں پھر بجلی کے بحران کا شکار ہے۔ لوڈشیڈنگ کے بہانے شہریوں کو گھنٹوں اور بعض علاقوں میں دنوں عذاب میں مبتلا رکھا جاتا ہے۔ اِس نام نہاد ''لوڈشیڈنگ'' میں عام آدمی پس کر رہ گیا ہے۔ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف معاملہ اِس کے بالکل برعکس ہے۔ کراچی کے مختلف پارک اور کھیلوں کے میدان رات رات بھر سرچ لائٹس کی خیرہ کن روشنیوں سے جگمگاتے رہتے ہیں۔ یہ روشنیاں نہ صرف رات بھر جلتی رہتی ہیں بلکہ سارا سارا دن لاکھوں بلب روشن رہتے ہیں۔ اسٹریٹ لائٹس کا بھی یہی حال ہے۔ شادی ہال اور لان بقعۂ نور بنے رہتے ہیں۔ کوئی تقریب ہو یا نہ ہو' آرائشی جھالریں اور تیز روشنیاں عام آدمی کو احساسِ کمتری میں مبتلا کرتی رہتی ہیں۔ پھول بیچنے والوں کے چھوٹے چھوٹے کیبنوں میں ہزار ہزار واٹ کے کئی کئی بلب روشن رہتے ہیں۔ یہ چھوٹے دکاندار عموماً کے ای ایس سی کی ملی بھگت سے ناجائز کنکشن لیتے ہیں پھر کراچی کے بعض علاقے ایسے بھی ہیں جہاں پوری پوری بستیوں میں کنڈا سسٹم کا نظام رائج ہے اور یہ کے ای ایس سی کے بدعنوان اہلکاروں کی ملی بھگت سے چل رہا ہے۔

ریڈیو' ٹی وی اور ذرائع ابلاغ پر توانائی بچانے کی مہم پر کروڑوں روپیا صَرف کیا جا رہا ہے اور دوسری طرف یہ اُللے تُللے ہیں۔ آخر توانائی کا یہ بحران صرف عام آدمی ہی کے لیے کیوں ہے؟ ایک طرف تو یہ صورتِ حال ہے اور دوسری طرف وہ علاقے ہیں جو تاریکی میں ڈوبے رہتے ہیں۔ ہزاروں طالب علم محض اِس وجہ سے پڑھ نہیں پاتے۔ رات میں کام کرنے والے بیشتر افراد روزی سے محروم رہ جاتے ہیں۔ گرمی اور حبس کی شدت سے بے شمار مریض جاں کنی میں مبتلا رہتے ہیں۔ بجلی نہ ہو تو پانی کا بھی بحران پیدا ہو جاتا ہے۔

صورتِ حال کی اِس سنگینی کا ذمے دار کون ہے؟ کے ای ایس سی کے بڑوں سے یہ سوال کون کرے کہ لوڈشیڈنگ کا اثر مخصوص علاقے پر کیوں نہیں پڑتا؟ بجلی کی شکایات کے مراکز بھی موجود ہیں مگر ان کے فونز ہمیشہ مصروف رہتے ہیں۔ یہ بات بھی تجربے میں آئی ہے کہ متعلقہ افراد فون کا ریسیور اٹھا کر نیچے رکھ دیتے ہیں۔ کیسی ستم ظریفی ہے کہ اِس بین الاقوامی شہر میں جہاں چھوٹے بڑے اداروں کے پاس بھی ٹیلی فون کی بیس بیس لائنیں ہیں' وہاں ایک اہم ادارے کے پاس صرف ایک نمبر ہوتا ہے۔ خوش قسمتی سے اگر کوئی شکایت لکھانے میں کامیاب بھی ہو جاتا ہے تو اُسے مختلف طریقوں سے ٹرخایا جاتا ہے اور ایسے وقت کا انتظار کیا جاتا ہے کہ جب کے ای ایس سی والوں کا ''اوور ٹائم'' بن سکے۔ نفسانفسی کے اِس دور میں کوئی کسی کا پرسانِ حال نہیں ہے۔ یہاں ہر کام وعدۂ فردا پر ٹال دیا جاتا ہے اور عام آدمی یہ سوچتا رہ جاتا ہے کہ

آئے عُشاق' گئے وعدۂ فردا لے کر
اَب انہیں ڈھونڈ چراغِ رُخِ زیبا لے کر

سہام مرزا مرحوم نے یہ اداریہ مئی 1994ء میں ''دوشیزہ'' اور ''سچی کہانیاں'' کیلئے تحریر کیا تھا۔ ذرا سوچیے کیا یہ اداریہ ہمارے آج کے دور کا عکاس نہیں ہے؟